

کلمے نے

ڈوبتے دیکھا



صدیق سالک

3793

مصنف کی دیگر تصانیف

ہمہ یاراں دوزخ
میں نے ڈھاکہ ڈوبتے دیکھا
تاوم تحریر
ایمر جنسی
پریشر ککر
سیلوٹ

Witness to Surrender

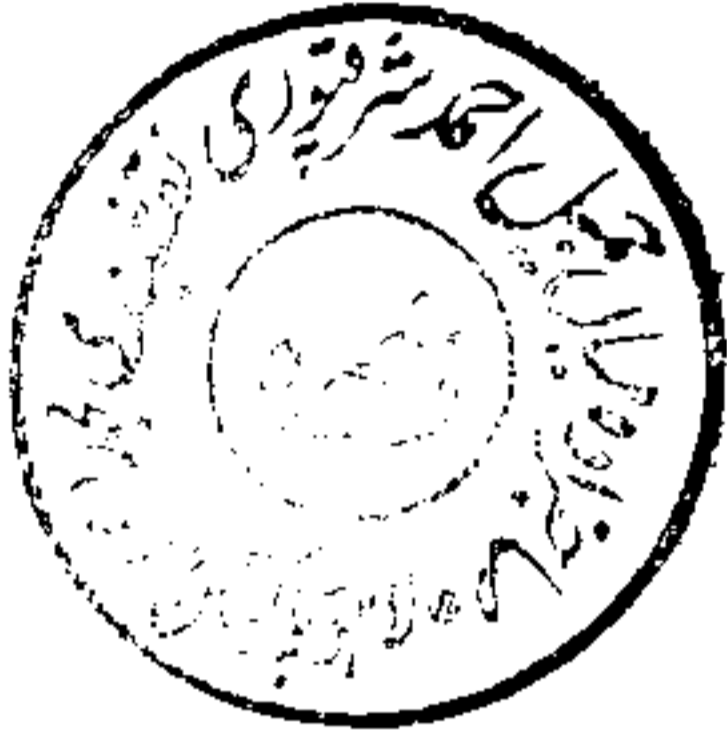
The Wounded Pride

State and Politics

(A Case Study of Pakistan)

3793

میں نے تمہارے دو بے دیکھا



صدیق سالک

ناشران و تاجرانِ کتب
اردو بازار لاہور

الفیصل

3793

87040

~~87040~~

جملہ حقوق بحق مصنف محفوظ

چودھواں ایڈیشن.....نومبر 2001ء

محمد فیصل نے

تعریف پرنٹرز سے چھوا کر شائع کی۔

قیمت = 175 روپے

ترتیب

حرف آغاز

حصہ اول: سیاسی افق

۹

۱۳

۲۱

۲۵

۲۹

۳۵

۴۱

۵۱

۴۶

حصہ دوم: خانہ جنگی

۸۱

۸۶

۹۹

۱۰۵

۱۱۵

۱۲۱

۱۳۱

۱۳۹

- | | |
|---|----------------------|
| ۱ | دوجان و یکت قالب |
| ۲ | ریٹھہ کا سرطان |
| ۳ | محبیب کا غرور |
| ۴ | مارشل لا کا مسخر |
| ۵ | شیخ صاحب جیت گئے |
| ۶ | لاڑکانہ پلان |
| ۷ | محبیب کی محکمہ |
| ۸ | بھٹو، محیب اور یحییٰ |

- | | |
|----|----------------------|
| ۹ | I "آپریشن سرچ لائٹ" |
| ۱۰ | II "آپریشن سرچ لائٹ" |
| ۱۱ | جنرل نیازی کی آمد |
| ۱۲ | گنتی باہنی |
| ۱۳ | ٹکٹا خاں کی واپسی |
| ۱۴ | بجران کی دہلیز پر |

حصہ سوم: جنگ

- | | |
|----|--------------|
| ۱۵ | شکت کی تیاری |
| ۱۶ | یوم الحساب |



۱۴۹	جیسور سیکٹر (۹ ڈویژن)	۱۷
۱۵۷	ناٹور سیکٹر (۱۶ ڈویژن)	۱۸
۱۶۷	برہمن باڑیہ سیکٹر (۱۳ ڈویژن)	۱۹
۱۷۷	چاند پور سیکٹر (۳۹ ہنگامی ڈویژن)	۲۰
۱۸۵	مہین سنگھ سیکٹر (۳۶ ہنگامی ڈویژن)	۲۱
۱۹۵	جنرل نیازی کی بچکیاں	۲۲
۲۰۵ اور ڈھاکہ ڈوب گیا	۲۳
	ضمیمے	
۲۱۳	اول: تاریخی پس منظر	
۲۲۱	دوئم: چھ نکات	
۲۲۵	سوئم: آپریشن سرچ لائٹ	
۲۳۳	چارم: دستاویز سقوط	



حرف آغاز

یہ میری انگریزی کتاب کا اردو ایڈیشن ہے۔ جب ہماری شکست کی یہ عینی شہادت ۱۹۷۷ء میں پہلی بار منظر عام پر آئی، تو کئی حلقوں نے اصرار کیا کہ اس کا اردو ترجمہ ہونا چاہیے تاکہ اہل وطن کو بھی پتہ چل سکے کہ یہ تند و تیز آندھی کدھر سے آئی کیسے آئی اور کیوں آئی؟

بعض دوستوں نے مجھے خبردار کیا کہ ہم یاراں دوزخ کے بعد اردو میں کوئی کتاب چھاپنے سے احتیاط کرنا؛ ورنہ تمہارا حال بھی ان ادیبوں جیسا ہوگا جو اپنی پہلی تخلیق سے اپنا نام چمکاتے مگر دوسری سے گننا لیتے ہیں۔ میں اس انباء کے باوجود یہ کتاب چھاپ رہی ہوں کہونکہ ایک طرف قومی ضرورت ہے اور دوسری طرف ذاتی شہرت۔ ظاہر ہے کہ اس تناظر میں ذات ہی کومات ہونی چاہیے۔ دوستانہ مشورے کو نظر انداز کرنے کی دوسری وجہ یہ ہے کہ میری رائے میں قاری بہت ذہین ہوتا ہے، وہ ادب پائے اور تاریخی مواد میں فرق جانتا ہے۔ وہ کبھی ٹھولوں کی خوشبو اور ان کی نہاتائی ساخت کا مقابلہ نہیں کرتا۔

میں نے اس کتاب کو ادب سے دور اور تاریخ کے قریب رکھنے کی کوشش کی ہے، کیونکہ میں سمجھتا ہوں کہ اگر میں تاریخی واقعات پر ادبی خول چڑھانے بیٹھ جاتا، تو خول تو شاید چمک اٹھتا، مگر حقائق ماند پڑ جاتے، اس لیے میں نے ساری روداد سیدھے سادے انداز میں رقم کرنے کی کوشش کی ہے۔ اگر کہیں کہیں کوئی ادبی جملہ آگیا ہے، تو اس کی حیثیت میری نظر میں اندھیری رات میں تہا سارے جیسی ہے جو چمکتا تو ہے، مگر اس سے تاریکی کم نہیں ہوتی۔

میری انگریزی کتاب کو اردو میں منتقل کرنے میں میجر سید ضمیر جعفری اور فضل عظیم صاحب نے میری مدد کی ہے۔ ان کا طرز نگارش اتنا خوبصورت اور منفرد ہے کہ انہوں نے جن جن حصوں کا ترجمہ کیا وہ انہی کے ذمگ میں رنگا گیا؛ چنانچہ میں نے ساری کتاب کو ایک ہی اسلوب میں ڈھالنے کے لیے ان مہربانوں کے لفظوں کی لڑیوں کو توڑ دیا ہے۔ اس تحریری کارروائی سے یہ فائدہ ہوا ہے کہ کتاب اب پہلے صفحے سے لے کر آخر تک سراسر میرے اپنے اسٹائل میں ہے۔

اس کتاب کے چھپنے سے اہل وطن کے اردو دان طبقے کو پہلی دفعہ بعض حقائق کا علم ہوگا لیکن مجھے ہرگز یہ دعویٰ نہیں کہ اس میں المیہ مشرقی پاکستان سے متعلق تمام سچائیاں سو دی گئی ہیں۔ میں نے تو حقیقت کا صرف وہ رخ پیش کیا ہے جو مجھے معلوم ہے۔ اگر کوئی صاحب حقیقت کے دوسرے رخوں سے پردہ سرکائیں تو یہ یقیناً قومی خدمت ہوگی۔

صدیق سالک

راولپنڈی

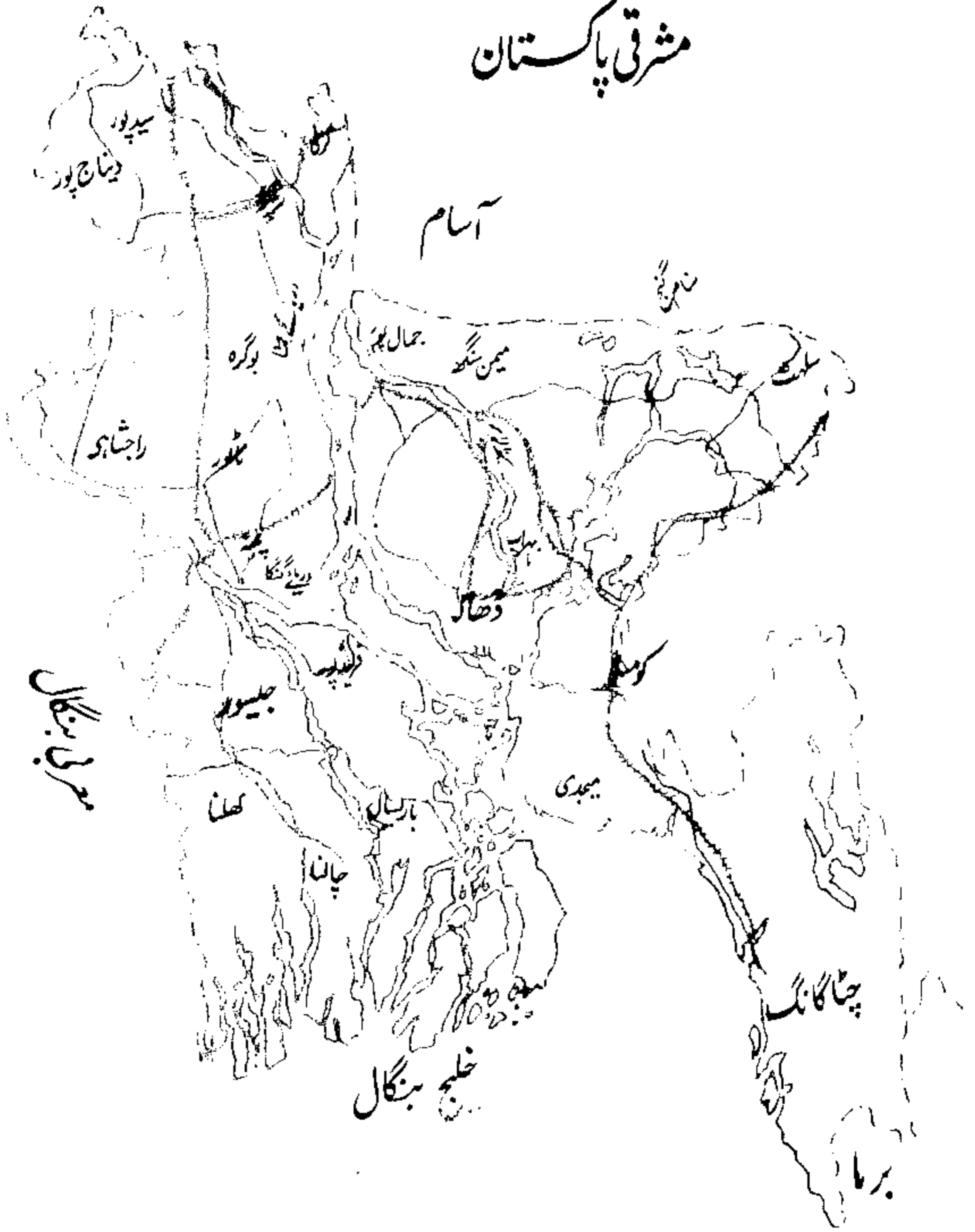
Witness to Surrender ۱۷



حصہ اول
سیاسی افق



مشرقی پاکستان



- بین الاقوامی سرحد
- سڑکیں
- ریلوے
- دریا

دو جان یک قالب

پاکستان میں دوسرے ملک گیر مارشل لا کی پہلی سالگرہ تھی۔ شیخ مجیب الرحمن ایک انتخابی جلسے سے خطاب کرنے صوبے کے اندرونی علاقے میں جا رہے تھے۔ ان کی کھڑکھڑاتی کار کی پہلی سیٹ پر ان کے ساتھ ایک بنگالی صمائی بیٹھا تھا جو شیخ صاحب کی انتخابی مہم کی خبریں اپنے اخبار کو بھیجتا تھا۔ اس نے باتوں باتوں میں انہیں کسی نازک سیاسی مسئلے پر چھیڑا اور چپکے سے اپنا چھوٹا سا ٹیپ ریکارڈر چلا دیا۔ بعد میں وہ یہ ٹیپ سنا کر دوستوں کی تواضع کیا کرتا تھا۔ اس نے یہ ٹیپ مجھے بھی سنایا۔ مجیب کی جانی پہچانی اور گرجدار آواز صاف سنائی دے رہی تھی:

”ایوب خاں نے مجھے مقبولیت کی ایسی معراج پر پہنچا دیا ہے کہ اب کوئی شخص میری مرضی کے خلاف نہیں جاسکتا۔ کوئی شخص بے زہ نہیں کہہ سکتا، حتیٰ کہ بچی خاں بھی میرے مطالبات کو رو نہیں کر سکتا۔“

مجیب کے مطالبات اور عزائم کیا تھے؟ اس کی نشاندہی ایک اور ٹیپ سے ہوتی ہے جو بچی خاں کے عکس سر افرسانی نے چوری چھپے تیار کیا تھا۔ اس میں مجیب کی آواز بند تھی۔ موضوع تھا ایل ایف او، یہ قانونی ڈھانچہ عملاً ایک دستوری خاکہ تھا جس میں قومی سلامتی کی ضمانت دی گئی تھی۔ اس کی وہ شقیں جو چھ نکات کی راہ میں مائل ہوتی تھیں مجیب کو سخت ناپسند تھیں۔ اس دستوری خاکے کے متعلق مجیب نے انجانے میں اپنے قریبی حلقوں میں حسب ذیل رائے کا اظہار کیا تھا:

”میرا مقصد جنگ ویش کا قیام ہے۔ انتخابات ختم ہوتے ہی میں ایل ایف او کو پُرزے پُرزے کر دوں گا، کون ہے جو انتخابات کے بعد میرے سامنے ٹک سکے؟“

جب بچی خاں نے یہ الفاظ سنے تو وہ آگ بگولا ہو گیا۔ اس کا فوری رد عمل یہ تھا، اگر اس نے مجھے دھوکا دیا تو میں اس کو سیدھا کر دوں گا۔ مجیب اور بچی کے یہ خیالات بعد کی باتیں ہیں، ان کا صحیح پس منظر سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ بات جنوری ۱۹۶۰ء سے شروع کی جانے لگی تھی۔ جب میں پہلی بار دو سال کے لیے ڈھاکہ گیا۔

میں جب راولپنڈی سے ڈھاکہ روانہ ہوا، تو رخت سفر بڑا مختصر تھا، مگر میرے ذہن میں خیالات کا وزن بہت بھاری تھا۔ یہ خیالات

لے تفصیلات اور سیاسی پس منظر کے لیے دیکھیے ضمیمہ ۱۔

۱۔ ایل ایف او LEGAL FRAME WORK ORDER قانونی ڈھانچہ جو آئین کی مدد موجودگی میں جنرل بچی خاں نے ۳۰ مارچ ۱۹۶۰ء کو جاری کیا۔



ملکی سالمیت سے متعلق تھے مگر اس وقت مجھے اس سلسلے میں ہندوستان کی امکانی جارحیت کی بجائے اندرونی سیاست کے مدد جزد کا زیادہ احساس تھا کیونکہ مغربی پاکستان میں جہاں میں نے بیس پچیس سال گزارے تھے، یہ تاثر عام تھا کہ مجیب کے چند نکات عملہ کی کارپوریشن ایکم کا دوسرا نام ہے اور بعض معلقوں میں یہ بات بھی اکثر سننے میں آئی تھی کہ ۱۹۷۸ء کی اگر تلا سازش بھی اس ایکم کو روکنے کا لالچہ کے لیے عملی اقدام تھا۔ ان باتوں میں کہاں تک صداقت تھی اور کہاں تک تعصب اس کا مجھے علم نہ تھا، میں نے سوچا کہ بنگالی بھائیوں سے براہ راست بطور کا، تو صورت حال خود بخود واضح ہو جائے گی۔

ان دنوں مشرقی پاکستان میں پچیس ہزار کے لگ بھگ فوجی تعینات تھے۔ میں سرکاری فرائض کے سلسلے میں انہی میں شامل ہونے جا رہا تھا، مگر ۸۰۰ کلومیٹر میں پھیلے ہوئے وسیع ہندوستانی علاقے کے اوپر پرواز کرنے ہوئے بار بار یہ خیال آ رہا تھا کہ اگر ہندوستان نے ہم پر حملہ کر دیا، تو کیا یہ پچیس ہزار فوجی ٹوڑ ٹوڑ پر مشرقی پاکستان کا دفاع کر سکیں گے؟

میں ایک سچے پاکستانی کی طرح ان خیالات سے آنکھیں پھانسنے کے لیے ماضی کی ان بوسیدہ ویلیوں میں پناہ ڈھونڈنے لگا کہ آل انڈیا مسلم لیگ کی بنیاد ڈھاکہ ہی میں تو رکھی گئی تھی... قرار داد پاکستان جو ۱۹۴۰ء میں لاہور میں منظور ہوئی ایک بنگالی لیڈر ہی نے تو پیش کی تھی... پھر ڈھاکہ کا ہے؟

انہی خیالات کے جھرمٹ میں میں تیج گاؤں (ڈھاکہ) ایئر پورٹ پر اترا۔ زمین پر سبزے کے قالین بچھے تھے اور آسمان پر نقرئی بادل ٹکرا رہے تھے۔ بدلیاں تو بہت تھیں مگر پکھری پکھری۔ ان کی اوٹ اتنی گھنی اور گہری نہ تھی کہ ہنستے ہوئے سوج کا چہرہ مکمل طور پر آنکھوں سے اوجھل ہو جاتا۔ فضا معتدل سی اور ماحول سکون آمیز سا!

میرے ساتھ اسی جہاز سے بعض فوجی افسر اترے جو مارشل لا ڈیوٹی سے متعلق تھے۔ وہ کسی اور ہی ہوا میں تھے، ڈرتے ہوئے دی آئی پی لائونج میں گئے اور گہرے اور دبیز صوفوں میں سستانے لگے۔ باہر بنگالی قلی ہانپتے کانپتے ان کا سامان گورنمنٹ ہاؤس کی نقرئی پلیٹوں والی گاڑیوں میں لادنے لگے۔ آنا فانا وہ باہر نکلے اور گاڑیوں میں بیٹھ کر ایئر پورٹ سے نکل گئے۔

میں دوسرے برآمدے میں کھڑا کسی مناسب سواری کا انتظار کرنے لگا (راستے میں جہاز کی خرابی کی وجہ سے میں نے فلائٹ بدل لی تھی، مگر اس کی اطلاع ڈھاکہ نہ پہنچا سکا تھا)۔ تھوڑی دیر بعد ایک فوجی جیب میرے قریب آ کر رُکی۔ حوالدار نے مجھے سارٹ سائیلوٹ کیا اور پاس سے گزرتے ہوئے ایک بنگالی لڑکے کو بھبک دار لہجے میں حکم دیا: صاب کا اپھی کیس جیب میں رکھو!

سے ہوئے لڑکے کو یہ بھبک ناگوار تو گزری مگر اپنے آقا پر ایک احتجاجی نگاہ ڈالتے ہوئے حکم بجالایا۔ اس نے گھور کر میری طرف بھی دیکھا۔ اس کے سیاہ چہرے کے چوکھے میں سفید سفید آنکھیں وحشت کا احساس لیے ہوئے تھیں۔ میں نے اپنا ہاتھ کوٹ کی جیب میں ڈالا اور چند سکنے اس غریب لڑکے کو دینا چاہے، مگر حوالدار نے پُر زور لہجے میں کہا: سُر ان حرامزادوں کی عادت نہ بگاڑیے! میں نے مشورہ مان لیا۔ اور بنگالی لڑکا ایک بار پھر نفرت بھری نگاہیں مجھ پر ڈالتے ہوئے وہاں سے چلا گیا۔

ایئر پورٹ کی بلند و بالا عمارت پر پرچم ستارہ و ہلال پوری آب و تاب سے لہرا رہا تھا۔ میں چھاؤنی روانہ ہو گیا۔

جو دوست مجھے ایئر پورٹ پر لینے نہ پہنچ سکے تھے، شام کو آفیسر زمیں میں آئے۔ بڑے تپاک سے ملے۔ اپنی غیر ماضی کی معافی مانگنے لگے۔ رسی گفتگو کے بعد مشرقی پاکستان کی صورت حال زیر بحث آئی تو انہوں نے اس غیر مناسب موقع پر جبکہ حالات دگرگوں ہو رہے ہیں، مشرقی پاکستان



میں تقری پر مجھ سے ہمدی کا اظہار کیا۔ اس کے علاوہ ہندو نصاب سے بھی نوازا۔ نمونے کے چند موقی حاضر ہیں:

یہاں علی طور پر مڈل لاد کا کوئی وجود نہیں ہے:

گھر داری کے لیے ہرگز بھاری بھاری چیزیں نہ خریدنا، کیا معلوم کب اور کن حالات میں یہاں سے بستر اگول کرنا پڑے:

اپنا روپیہ پیسہ شہر کے کمرشل بینک کے بجائے چھاونی کے نیشنل بینک میں رکھوانا:

اور ہاں! اپنے پیش رو کے فلیٹ ہی میں ٹنگے رہنا، یہ صندوق نمانیٹ بڑا محفوظ ہے۔ اس میں کوئی شہرینہ آسانی سے ہم نہیں لڑھکا سکتا: میرے خیال میں یہ سب وہم تھے، ورنہ کسی بنگالی کو کیا پڑی ہے کہ میرے گھر میں ہم بھینکے۔ صورت حال خراب سی، مگر اتنی تو نہیں کھیلے پانک بھڑک اٹھیں۔

میں نے دوستوں کے مشوروں کو نظر انداز کرتے ہوئے مغربی پاکستان سے ملک یعنی بیوی بچوں کو بلوانے کے لیے تائیج دیا۔ چند روز میں وہ پہنچ گئے، تو انہیں اپنے مورچہ نمانیٹ میں متعین کر دیا۔ بچوں کے آتے ہی اگلے روز بنگالیوں کا ایک ہجوم ہائے گھر پر ٹوٹ پڑا، مگر وہ شہرینہ تھے محض محنت مزدوری کرنے والی عورتیں تھیں جو آئی کے طور پر ملازمت کرنے کی خواہش مند تھیں۔ بنگالی عورتیں مغربی پاکستانیوں کے گھروں میں ملازمت کو ترجیح دیتی تھیں جیسے تقسیم ہند سے پہلے ہندوستانی خانامے اور برے کسی انگریز کے ہاں نوکری کو بستر بگھتے تھے۔ دوسرے تیسرے دن معلوم ہوا کہ میری بیوی نے دو نوکریاں ملازم رکھ لی ہیں۔ بظاہر یہ سراسر فضول خرچی تھی مگر جب بیوی سے جواب طلبی کی تو وہ کہنے لگی: مگر نہ کیجیے ان دونوں کی تنخواہ ہائے راولپنڈی والے دامد ملازم کی تنخواہ سے کم ہوگی۔ میں نے فکر کرنا چھوڑ دیا۔

گھر آباد کرنے کے لیے برتنوں کی ضرورت پڑی تو میں ڈھاکہ سے ۴۴ کلومیٹر دور ٹونگی میں پاکستان سرائیک انڈسٹریز گیا۔ راستے میں افلاس اور ناداری کے ایسے ایسے دردناک مناظر دیکھنے میں آئے کہ ملازمت کے لیے باری باری پھرتی آیاؤں، کی بے چینی سمجھ میں آگئی۔ راستے میں جو عورتیں نظر آئیں ان کے پاس ستر پوشی کے لیے چند پتھروں کے سوا کچھ نہ تھا۔ جو مرد دکھائی دیے وہ عموماً کوتاہ قامت اور فاقہ زدہ تھے۔ ان کی سیاہ جلد میں منہمی ہوئی پسلیاں چلتی گاڑی سے بھی گنی جاسکتی تھیں۔ بچوں کی حالت بڑوں سے بدتر تھی۔ ان کی ہڈیاں بکھردور اور جسم نحیف تھے۔ کمزور ٹانگوں کے اوپر ابھری ہوئی تو ندیں باہر کو اُڈ رہی تھیں۔ بعض بچوں کی کمر کے گرد گزہ سادھا گاندا تھا جس سے ایک گھنٹی لٹک رہی تھی، یہ ان کا امداد کھلواتا تھا۔

راستے میں جہاں جہاں رُکنا چک سنگوں کے غول کے غول مجھ پر ٹوٹ پڑے۔ میں نے محسوس کیا کہ بنگال کا عام غریب آدمی مغربی پاکستان کے انتہائی غریب آدمی سے بھی غریب تر ہے۔ مجھے مشرقی پاکستان کی معاشی بد حالی کے بائے میں سُنی ہوئی باتوں میں وزن نظر آنے لگا۔ میں اپنے آپ کو مجرم محسوس کرنے لگا۔

مجھے خیال ہونے لگا کہ چند روز پہلے میرے دوست شاید ٹھیک ہی کہہ رہے تھے، کیونکہ اگر یہ بھوکے جنگے لوگ انہوہ در انہوہ مشتعل ہو جائیں تو واقعی بازار ٹوٹ سکتے ہیں چھاونی پر ہڈ بول سکتے ہیں۔ اور میرے گھر میں ہم بھی پھینک سکتے ہیں۔ فیکٹری کے دروازے پر ایک لہاڑ لگا آدمی بلا۔ وہ کوٹ تھلون پہنے تھا اور وضع قطع سے پنجابی لگتا تھا۔ اس نے بھی میرے خدو خال سے میرے علاقائی تعلق کا اندازہ لگایا۔ وہ مشرینازی تھا جو فیکٹری میں سیکورٹی اسٹنٹ کا کام کرتا تھا۔ بڑے تپاک اور محرمانہ انداز میں بائیں کمرے لگا۔ جب میں نے وہاں آنے کا مقصد بتایا، تو کہنے لگا: میری بلینے تو برتنوں کا آرڈر خود نہ دیکھیے، یہاں کے بنگالی مزدور مغربی پاکستان کے انٹرنل سے کہہ رکھتے ہیں۔ ان کے آرڈر کے برتن بھی جان بوجھ کر خراب کر دیتے ہیں آپ یہ کام مجھ پر چھوڑ دیجیے۔



ڈھاکہ واپس پہنچ کر میں نے دن بھر کے تجربات ایک پڑنے پختی دوست سے بیان کیے۔ خاص طور پر غربت کے دردنگ منظر کا ذکر
بڑے بڑا انداز میں کیا مگر وہ ٹس سے مس نہ ہوا بلکہ اُن بنگالیوں کو ان کی کاہلی اور نااہلی کے لیے کہنے لگا۔ اس نے حضرت امین انداز میں کہا یہ
صرف ایک کام میں حلاق ہیں۔ اور وہ ہے خاندانی منصوبہ بندی کے اصولوں کی بے دریغ خلاف ورزی! ... آپ ان کی غربت کا اتنا
اثر نہیں میں آپ کو تصویر کا دوسرا رخ دکھانے کی دن شہر (ڈھاکہ) لے چلوں گا:

کیپٹن چودھری واقعی اپنی پہلی فرصت میں مجھے گاڑی پر بٹھا کر شہر لے گیا۔ پہلے ہم شہر کے شاندار علاقوں میں گھومتے رہے جن میں ایٹم بینک
گورنمنٹ ہاؤس ہائی کورٹ انجینئرز انیسٹیوٹ ریلوے اسٹیشن یونیورسٹی کیپٹن بیت الموم اسٹیڈیم نیو مارکیٹ اور ایسی ہی باڑےب عمارتیں شامل
تھیں۔ ان عمارتوں کا چکر لگانے کے بعد کیپٹن صاحب نے اہانت آمیز لہجے میں کہا: "پہلے یہاں کچھ بھی نہیں تھا" یہ سب کچھ ۱۹۴۷ء
کے بعد بنا۔ اور وہ بھی سالانہ سیلابوں سمندری طوفانوں اور قیامت خیز سائیکلونوں کے باوجود! ضرورت اس بات کی ہے کہ کوئی شخص
زرمبادلہ کے آمد و خرچ کے اعداد و شمار جمع کرے اور عجیب کی طرف سے عائد کردہ اقتصادی استحصال کے الزامات کی قلمی کھول دے:

میں کیپٹن چودھری کی باتیں سن کر سوچنے لگا کہ اگر یہ سب کچھ سچ ہے اور حقائق عجیب کے خلاف ہیں تو پھر ڈر کس بات کا؟ اس کے علاوہ
عجیب کا توڑ مولانا عبد کبیر بھاشانی بھی تو ہیں جو ایک بااثر اور متوازی جماعت کی قیادت کر رہے ہیں۔ اور ہاں! دائیں بازو کی کئی جماعتیں
بھی تو عجیب کے خلاف ہیں جو اکثر و بیشتر ملک کے دونوں بازوؤں کے درمیان اسلامی رشتے پر زور دیتی رہتی ہیں۔ بھلا ان حالات میں
عجیب کس طرح من مانی کر سکتا ہے۔ اگر اس کا سب سے بڑا اختیار رائے عامہ ہے تو اس کا اندازہ تو انتخابات کے بعد ہی ہو گا۔ دیکھیے
انتخابات میں کیا ہوتا ہے۔

انتخابات کے لیے سیاسی سرگرمیوں پر سے یکم جنوری ۱۹۶۰ء سے پابندی اٹھالی گئی۔ سال لو کا خیر مقدم ہائیں بازو کے طلبہ کی جماعت
نے آدمی رات کو مشعل بردار جلوس نکال کر کیا جس میں انہوں نے سُرخ انقلاب کے نعرے لگائے۔ ان کی حریف جماعت ایسٹ پاکستان
اسٹوڈنٹس لیگ نے (جس کا الحاق عوامی لیگ سے تھا) اگلے روز ایک جلسے عام میں یہ اعلان کیا کہ ہماری نجات کا راز چھ نکات میں
ہے۔ صرف چھ نکات میں۔ دائیں بازو سے تعلق رکھنے والے طالب علموں نے اپنا کوئی زور نہ دکھایا۔

سیاسی جماعتوں میں عوامی لیگ جماعت اسلامی اور نیشنل عوامی پارٹی (بھاشانی گروپ) بہت سرگرم تھیں۔ عوامی لیگ نے اپنی انتخابی
مہم کا آغاز ۱۱ جنوری کو پٹن میدان میں ایک عظیم الشان جلسے سے کیا۔ یہ جلسہ تنظیم اور تعداد کے لحاظ سے بہت کامیاب رہا۔ اخباری اصطلاح
میں وہاں لوگوں کا ایک شاٹھیں مارتا ہوا سمندر تھا۔ تعداد کے علاوہ گفتار و افکار کے لحاظ سے بھی یہ اجتماع یادگار تھا۔ اس سے خطاب کرتے
ہوئے شیخ عجیب الرحمن نے واضح کاف الفاظ میں کہا کہ بنگالیوں نے ۱۹۵۶ء کے دستور میں برابری (PARITY) کے اصول کو تسلیم کر کے
سخت غلطی کی تھی۔ اس نے دھکی دی کہ اگر بنگلہ دیش پر یہ اصول دوبارہ ٹھونسنے کی کوشش کی گئی تو اس کی مزاحمت کی جائے گی اور عوام
کے حقوق کے لیے تحریک چلائی جائے گی۔

بعد میں بنگال کے ممتاز سیاست دان مرحوم تفضل حسین عرف ہابک میاں کے بہوت پیر شرمین عین نے مجھ سے کہا: میرے والد کی
۱۷ انگریزی روزنامہ آبزور ڈھاکہ۔ مورخہ ۱۲ جنوری ۱۹۶۰ء

۱۸ مشرقی پاکستان کے مقبول ترین روزنامہ اتفاق کے مالک اور مدیر حسین شہید سہروردی کے قریبی رفیق ہابک میاں کا انتقال ۱۰ مئی
۱۹۶۹ء کو ہوا۔



زندگی میں ۱۹۵۶ء کے آئین کو جنگلیوں کے لیے قابل قبول بنانا ممکن تھا، مگر اب گاڑی چھوٹ چکی ہے۔ میں نے اس دعوے کی تصدیق بعض بزرگ سیاست دانوں سے چاہی تو انہوں نے اس کی تصدیق کی اور کہا: جی ہاں حسین شہید سہروردی کی موت کے بعد اگر کسی کا اثر و رسوخ مجیب پر تھا تو وہ ہلک میاں ہی تھے؟

ایک ہفتے بعد جماعت اسلامی نے اسی پلیٹن میدان میں اپنا جلسہ منعقد کیا جہاں عوامی لیگ نے اپنی انتظامی صلاحیتوں کا بھرپور مظاہر کیا تھا۔ جماعت اسلامی نے بھی اپنے اجتماع کو کامیاب بنانے کی پوری کوشش کی، مگر یہ جلسہ ہڑبازی کا شکار ہو گیا۔ نوبت مارکٹائی تک پہنچی جس میں دو آدمی ہلاک اور پچاس زخمی ہوئے۔ زخمیوں میں سے پچیس کی حالت تشویشناک تھی۔ امیر جماعت اسلامی مولانا ابوالاعلیٰ مودودی جو جلسے سے خطاب کرنے خاص طور پر لاہور سے ڈھاکہ پہنچے تھے، تقریر کے بغیر جلسہ گاہ سے واپس آ گئے۔

اس خون ریز جھڑپ میں جماعت اسلامی ایک مظلوم اور تم رسیدہ جماعت بن کر نکلی۔ جماعت نے خون خرابے کی ذمہ داری عوامی لیگ پر ڈالی کیونکہ جلسہ گاہ کے ایک حصے نے جوائے بنگلہ (بنگلہ ویش زندہ باد) کے نعرے سنائی دے رہے تھے۔ عوامی لیگ یہ کہہ کر اس الزام کی بھر پور تردید کرتی تھی کہ تشدد اس کے مفاد میں نہیں کیونکہ اس سے انتخابات التوا کا شکار ہو سکتے تھے۔

فریقین میں یہ بحث اپنی جگہ بجا، مگر سوال یہ ہے کہ اس گڑبڑ کو روکنے کے لیے انتظامیہ نے کیا کیا۔ خون ریز جھڑپوں کے دوران پولیس کہاں تھی، اس نے بروقت اور موثر مداخلت کر کے امن و امان بحال کیوں نہ کیا؟ میں نے یہ سوال مارشل لا انتظامیہ کے ایک اعلیٰ افسر کے سامنے اٹھائے تو اس نے کہا، حکومت نے جماعت اسلامی کو ضروری تحفظ کی پیش کش کی تھی، مگر جماعت نے اسے یہ کہہ کر رد کر دیا کہ ہمارے پاس انتظام ہے۔ اس سے انتظامیہ یہ بھی کہنا باجماعت یہ تاثر دینا چاہتی ہے کہ اگر عوامی لیگ اپنے بل بوتے پر اٹھنا سزاوار جلسہ کر سکتی ہے تو ہم بھی کسی سے کم نہیں کیونکہ حکومت کی پناہ تو ہمیشہ کمزور جماعتیں ہی ڈھونڈتی ہیں۔ میں نے جب یہ بات جماعت کے ایک جہدو سے کہی تو اس نے جواب دیا، ہمیں یہ سراسر جھوٹ ہے جماعت نے کوئی پیش کش نہیں ٹھکرائی۔ درحقیقت حکومت اپنی غیر جانبداری قائم رکھنے کے لیے سرہام بیٹھی تماشادہ تھی رہی؟

جوری ۱۹۷۰ء کا تیسرا اہم سیاسی واقعہ منتوش میں کانوں کی ریل تھی جس کا اہتمام مولانا بھاشانی کی نیشنل عوامی پارٹی نے کیا تھا۔ اس میں شرکت کے دعوے نامے ان تمام پارٹیوں کو دیے گئے جو سوشلزم میں اعتقاد رکھتی تھیں۔ حکومت نے اس ریل کو کامیاب بنانے کے لیے خصوصی گاڑیاں چلائیں اور جلسہ گاہ تک پہنچانے کے انتظامات کیے کیونکہ گورنمنٹ ہاؤس میں بیٹھنے والے بعض سیاسی پٹنوں کا خیال تھا کہ مجیب الرحمن کا اثر زائل کرنے کے لیے نیپ (بھاشانی) کو کامیاب اور فعال بنانا ضروری ہے۔

اس کے باوجود ریل ناکام ہو گئی۔ ناکامی کی وجہ کسی حریف جماعت کی دخل اندازی کے بجائے اس کا اپنا اندرونی انتشار تھا۔ کئی دنوں کے شور شرابے کے بعد اگر اس تقریب سے کچھ برآمد ہوا تو چند نعرے تھے،

”خون اور آگ — آگ! آگ! آگ!!!“

”پرچی یا گول — گولی! گولی! گولی!!!“

نیپ (بھاشانی) کا انتہا پسند گروپ جس کی قیادت پارٹی کے سیکرٹری جنرل مسٹر طرہ کے ہاتھوں میں تھی، سرے سے انتخابات میں نہیں

لے۔ مجیب الرحمن کے سیاسی گرو اور پاکستان کے سابق وزیر اعظم، ان کا انتقال دسمبر ۱۹۷۳ء میں بیروت کے ایک ہوٹل میں ہوا۔



ہی نہیں رکھتا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ انتخابات سے حکومت تو بدل سکتی ہے مگر سماجی و اقتصادی تبدیلی نہیں آسکتی جس کا واحد ذریعہ سرخ انقلاب ہے۔

ایک شام ایک اخبار کے دفتر میں میری ملاقات مسٹر طرہ سے ہو گئی وہ نیپ (جھانسی) سے تازہ تازہ آگے ہوئے تھے۔ اپنی علمدگی پر روشنی ڈالتے ہوئے انہوں نے کہا:

میں نے پہلے عوامی لیگ کو اس لیے چھوڑا تھا کہ اس میں کوئی انقلابی شعلہ باقی نہیں رہا تھا؛ چنانچہ میں نے انقلابی نصب العین حاصل کرنے کے لیے نیشنل عوامی پارٹی کی بنیاد رکھی مگر اب یہ پارٹی بھی اپنے نصب العین سے بھٹک گئی ہے۔ اب اس میں بھی عوامی لیگ کی طرح کوئی چنگاری باقی نہیں رہی... میں اپنا آئندہ کالائٹ عمل انتخابات کے بعد وضع کروں گا:

ان میں سیاسی پارٹیوں کے علاوہ چند اور سیاسی جماعتیں اور گروہ بھی تھے جن میں کرشک سرابک پارٹی، پاکستان نیشنل لیگ، پاکستان ڈیموکریٹک پارٹی، جمعیت العلماء پاکستان اور مسلم لیگ (تین گروہ) شامل ہیں۔ یہ سب سیاسی اکھاڑے میں اترے مگر اقبال و خیراں۔ ان میں سے کسی نے کوئی ایسا کارنامہ انجام نہ دیا جس سے سیاسی پھل مچ سکتی، البتہ ان نسبتاً چھوٹی جماعتوں میں پاکستان ڈیموکریٹک پارٹی کے مدد جناب محمد نور الامین کا ذکر ضروری ہے کیونکہ انتہا پسندی کے اس جذباتی ماحول میں انہوں نے اعتدال رواداری اور انصاف کی آواز بلند کی۔ یہ بہت بڑی بات تھی، کیونکہ تاریک آمدنی میں چراغ جلانا بے شک نتائج کے لحاظ سے بے سود ہو گا مگر جذبے اور نیت کے اعتبار سے قابل تائیس۔

مسٹر نور الامین کی یہ آواز بے اثر ثابت ہوئی، کیونکہ ماحول بدل چکا تھا۔ قدریں روندی جا رہی تھیں، قومی سالمیت کے منافی نعرہ بازی روز بروز کا معمول بن چکا تھا۔ اس آمدنی کو روکنے والا کوئی نظر نہیں آتا تھا۔ حکومت کی گدی پر بیٹھنے والے اس آمدنی سے بے خبر تھے یا دیدہ دانستہ اسے نظر انداز کر رہے تھے۔

سیاسی صورت حال کا جائزہ لینے کے بعد میں اقتصادیات کے ڈیڑوں اور بنگال کے دانش وروں کی طرف متوجہ ہوا، کیونکہ میرے خیال میں یہ دو طبقے کسی ملک کی سیاسی تقدیر بدلنے میں خاموشی مگر اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ تجارتی حلقوں میں مسٹر رحمن، مسٹر احمد، مسٹر بھوشیاں اور چند دوسرے حضرات سے ملاقاتیں ہوئیں۔ ان کا زور بیان اس بات پر لڑتا تھا کہ جناب مغربی پاکستان میں جتنی ترقی ہوئی ہے، مشرقی پاکستان کے پیسے سے ہوئی ہے۔ اس سلسلے میں وہ عوامی لیگ کی زیر سرپرستی چھپنے والے لٹریچر کا اکثر حوالہ دیتے جس میں دعویٰ کیا گیا تھا کہ پاکستان کی مجموعی آمدنی کا ساٹھ فیصد حصہ مشرقی پاکستان سے حاصل ہوتا ہے، مگر اس پر قومی آمدنی کا صرف بیس فیصد خرچ ہوتا ہے۔ اس کے برعکس مغربی پاکستان قومی آمدنی کا صرف پالیس فیصد کمانا ہے مگر کل آمدنی کا پچتر فیصد کھا جاتا ہے۔

اعداد و شمار کے علاوہ یہ حضرات بعض عملی دشواریوں کا بھی اکثر ذکر کرتے اور روزمرہ زندگی سے ایسی مثالیں دیتے کہ سارا تجارتی نظام منحل و خیر نظر آتا۔ مثلاً وہ کہتے کہ ایک جہاز جو مشرق وسطیٰ سے بڑو وغیرہ لے کر چٹاگانگ روانہ ہوتا ہے، پہلے سیدھا کراچی جاتا ہے۔ پھر کراچی سے چٹاگانگ آتا ہے جس سے کرایہ بھی بڑھتا ہے اور وقت بھی زیادہ لگتا ہے، اسی طرح فوج کے استعمال میں آنے والی چل جالیوں (CAMOUFLAGE NETS) عموماً پٹ سن سے بنتی ہیں۔ پٹ سن کی فیکٹریاں یہاں ہیں، مگر پہلے یہ تیار شدہ مال رنگائی کے بہانے مغربی پاکستان بھیجا جاتا ہے اور پھر واپس منگوا کر یہاں کے یونٹوں کو دیا جاتا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کوئی چیز اس وقت تک مشرقی پاکستان کے لیے مناسب نہیں بھیجی جاتی جب تک اس پر مغربی پاکستان کی قبولیت کی مہر ثبت نہ ہو جائے۔ خواہ یہ تجارتی مال ہو سیاست دان ہوں یا انتظامیہ کے افسر۔



ذہنی اور فکری محاذ پر بھی کیفیت تشویشناک تھی۔ چند ذاتی تجربے پیش کرتا ہوں۔ پڑھے لکھے لوگوں میں جس شخص سے سب سے پہلے رابطہ قائم ہوا وہ پاکستان کو نسل برائے قومی کچھتی کی ڈھاکہ شاخ کے ریڈیڈنٹ ڈائریکٹر تھے۔ وہ میری خواہش پر مجھے سنٹر کی لائبریری دکھانے لگے۔ چلتے چلتے آرٹ سیکشن کے سامنے رُک گئے۔ شیلیف سے ایک اعلیٰ طباعت والی خوبصورت کتاب نکالی اور بنگالی لہجے اور نفرت سے کہنے لگے: "ڈراما ملاحظہ ہو راولپنڈی سے ہمارا ہیڈ آفس ہمیں کیا بھیج رہا ہے؟ یہ قومی دولت کا سراسر ضیاع نہیں تو کیلے ہے؟ کیا آپ نے کسی بنگالی شاعر کے بارے میں بھی اس پالیے کی کوئی کتاب شائع کی ہے؟" ان کی برہمی کا باعث مرقع چغتائی تھا جس میں یکتائے روزگار شاعر اسد اللہ خاں غالب کے منتخب اشعار کی مصوٰر ترجمانی کی گئی تھی۔

لائبریری کے اس پکڑ میں وہ ایک جگہ اور رُکے اور شیلیف کی طرف اُنکلی اُٹھتے ہوئے کہا: "یہ سارا شیلیف تمہارے قائدِ اعظم سے متعلق کتابوں سے بھرا پڑا ہے۔" زور تمہارے پر تھا جس کی چھین مجھے محسوس ہوئی اور میں ٹیس کو دل میں سمیٹ کر واپس چلا آیا۔ چند روز بعد مجھے فلم سنسر بورڈ ڈھاکہ کی میٹنگ میں ایک اور یادگار تجربہ ہوا۔ یہ میٹنگ بلانے کا مقصد چربہ فلموں کی روک تھام تھا جن کا اکثر مواد فلموں اور ناولوں کی شکل میں کلکتہ سے آتا۔ اس اجلاس میں ڈھاکہ کی فلمی صنعت کے تمام نمائندے یعنی پروڈیوسرز، ڈائریکٹر، فن کار اور فلم کار موجود تھے۔ صدر مجلس نے ابتدائی کلمات میں قومی وقار اور اخلاقی اقدار کے نام پر سرقہ اور چربہ کی لعنت ختم کرنے پر زور دیا اور تمام حاضرین سے تعاون کی اپیل کی۔ اس پر فلم انڈسٹری کے بااثر ڈائریکٹر جو خود اچھے فلم کار بھی تھے اپنے ساتھیوں کے جذبات کی ترجمانی کرنے کے لیے کھڑے ہوئے۔ انہوں نے فرمایا:

"پاکستان کی فلمی صنعت کے بارے میں ایک اعلیٰ سطحی مذاکرہ پہلے بھی یہاں منعقد ہوا تھا جس میں یہاں کی فلمی صنعت کے مفاد میں یہ فیصلہ کیا گیا تھا کہ حکومت اس کی نشوونما کے روایتی سرچشموں میں مداخلت نہیں کرے گی۔ میں مارشل لا انتظامیہ کو مشورہ دوں گا کہ وہ حکومت کے اس فیصلے پر قائم رہے اور کی طرف ہمارا دروازہ کھلا رکھے۔ سوچیے تو سہی آخر ہم اپنے ثقافتی کعبے سے کیسے پیٹھ موڑ سکتے ہیں۔"

جلسے کے بنگالی صدر نے جس کی اپنی وفاداری مشکوک تھی، میری طرف معنی خیز نظروں سے دیکھا اور بنگالی دانشور کی نکتہ آفرینی پر اثبات میں سر ہلاتے ہوئے اجلاس برخواست کر دیا۔

مختلف طبقوں سے تعلق رکھنے والے بنگالی جہانوں سے رابطہ قائم کرنے کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا کہ مغربی پاکستان اور مشرقی پاکستان کے درمیان ایک وسیع ذہنی خلیج حاصل ہو چکی ہے۔ سوال یہ تھا کہ آیا یہ خلیج پاٹی جا سکے گی یا اس کا نتیجہ کچھ اور ہو گا۔ معاً میرا ذہن ۲۵ ہزار فوجیوں کی طرف گیا جن کو مشرقی پاکستان میں قومی سالمیت کی تہمتی گارنٹی سمجھا جاتا تھا۔

آئیے ذرا دیکھیں کہ ان فوجیوں کی ذہنی کیفیت کیا تھی؟



ریڑھ کا سرطان

اگر ۱۹۷۰ء کی ابتدا میں سیاست دان تاجر اور دانشور مغربی پاکستان سے ذہنی رابطہ توڑ چکے تھے تو کیا بنگال سپاہی اس وبال سے محفوظ تھے؟ کیا کسی اندرونی شورش کو فرو کرنے کے لیے ان پر بھروسہ کیا جاسکتا تھا؟ کیا ہندوستانی جارحیت کی صورت میں ان کا طرز عمل محبت و وطن سپاہیوں جیسا ہوگا؟ دوسرے نفلوں میں کیا وہ ذہنی اور جذباتی طور پر باقی فوج سے ہم آہنگ تھے؟

یہیں پہلا شخص نہ تھا جس کے ذہن میں یہ سوال کلبلا رہے تھے۔ مجھ سے پہلے بھی کئی افراد اس تشویش کا شکار بن چکے تھے۔ ان میں سے ایک میجر جنرل خادم حسین راجہ تھے جو مشرقی پاکستان میں متعین و امڈ ڈوٹرن (۱۳۱) کے جنرل آفیسر کمانڈنگ تھے۔ زیر کمان سپاہیوں کی نفسیاتی الجھنوں سے باخبر رہنا ان کا سرکاری فرض بھی تھا۔ ان کے دل میں شبہات کا کیرا اس وقت پیدا ہوا جب ۱۹۶۹ء کے آئین بنگالیوں اور غیر بنگالیوں کے درمیان لڑائی جھگڑے شروع ہوئے اور بنگال سپاہیوں کو اسے فرو کرنے کی ذمہ داری سونپی گئی۔ اس نازک موقع پر بنگال سپاہیوں کا نظم و ضبط بظاہر قائم رہا، مگر انہوں نے مؤثر کارروائی کرنے سے گریز کیا۔ یوں پتہ چلتا تھا کہ وہ تذبذب کا شکار ہیں۔ خطرے کو بھانپتے ہوئے جنرل راجہ نے انہی دنوں جنرل ہیڈ کوارٹرز (جی۔ ایچ کیو) کو ایک چٹھی لکھی جس میں مقامی صورت حال کا تجزیہ کرنے کے بعد سفارش کی گئی کہ علمدہ علمدہ بنگال اور غیر بنگالی یونٹوں کا فرق ختم کیا جائے اور بنگال نفری کو غیر بنگالی پلٹنوں میں ضم کر دیا جائے۔ انہوں نے یہ تجویز بھی پیش کی کہ مشرقی پاکستان کی نازک صورت حال کے پیش نظر وہاں مغربی پاکستان سے تعلق رکھنے والے یونٹوں کی تعداد بڑھائی جائے۔

جنرل راجہ کی تجاویز صدر پاکستان جنرل یحییٰ خاں کی اس تقریر کی روح سے متصادم تھیں جو انہوں نے ۲۸ جولائی ۱۹۶۹ء کو قوم کے نام نشر کی تھی۔ انہوں نے اعلان کیا تھا کہ افواج پاکستان میں بنگالیوں کی تعداد ڈگنی کر دی جائے گی۔ اور یہ کارروائی بنگالیوں کی شکایات دور کرنے کی طرف پہلا قدم ہوگا۔

صدر پاکستان نے جو فوج کے کمانڈر انچیف بھی تھے یہ فیصلہ کرتے وقت مشرقی پاکستان کی صورت حال کو کیوں پیش نظر نہ رکھا؟ اس کی دو ہی وجوہ ہو سکتی ہیں۔ یا تو انہیں بنگالی سپاہیوں کی نفسیاتی کیفیت کا احساس نہ تھا اور یا وہ کسی سیاسی مصلحت کے تحت اس سے پہلو تھی کر رہے تھے۔

صدر پاکستان اور جنرل راجہ کی سوچ میں اس تضاد کے باوجود مؤخر الذکر کو اپنی تجاویز کی صحت اور افادیت پر اتنا یقین تھا کہ انہوں نے ہمت نہ ہاری اور جی ایچ کیو پر متواتر زور دیتے رہے۔ کچھ عرصے بعد ایک سہانی صبح کو جی ایچ کیو سے ایک خفیہ خط موصول ہوا۔ جنرل صاحب سمجھے کہ ان کی اُمیدوں کی کلی کھلنے لگی ہے۔ انہوں نے پُراشتیاق بے تابان سے خاک لٹا دی کھولا۔ لفافے کے اندر ایک اور



نفاذ تھا اسے چاک کیا۔ خط کا متن پڑھا تو اس میں کچھ اور ہی نکلا۔ اس خط کے ذریعے جنرل راجہ کو کمانڈر انچیف کا یہ حکم پہنچایا گیا تھا کہ مشرقی پاکستان میں دو مزید (خالص) بنگالی پلٹینس کھڑی کی جائیں۔ پہلے سے موجود بنگالی پلٹینوں کی تعداد سات تھی جن میں سے چار مشرقی پاکستان میں موجود تھیں گویا اب اس صوبے میں خالص بنگالی پلٹینوں کی تعداد چھ ہو جائے گی۔ (یاد رہے ان دنوں مشرقی پاکستان میں غیر بنگالی پلٹینوں کی تعداد آٹھ تھی)

جی اوسی کے لیے یہ حکم تئیس کا باعث ہوا۔ انہوں نے اس مسئلے پر مزید سوچا اور طے کیا کہ اس سلسلے میں مزید خط و کتابت بے فائدہ ہوگی اس لیے خود جا کر اس حکم کے خطرناک مضمرات سے جی ایچ کیو کو آگاہ کرنا ضروری ہے؛ چنانچہ وہ راولپنڈی پہنچے اور متعلقہ حکام کو بتایا، اگر آپ کا مقصد ایک الگ بنگالی آرمی کھڑی کرنا ہے تو بیشک نئی سے نئی بنگالی پلٹینس کھڑی کرتے جائیں لیکن اگر آپ فوج اور ملک کو متحد رکھنا چاہتے ہیں تو ازراہ مہربانی موجودہ بنگالی پلٹینوں کو باقی فوج میں ضم کر دیجیے۔

جب یہ نقطہ نظر پاکستان کو پیش کیا گیا تو وہ سوچ میں پڑ گئے۔ ایک طرف سیاسی مصلحتوں کا تقاضا تھا کہ فوج میں بنگالی نمائندگی کو بڑھایا جائے اور دوسری طرف مقامی کمانڈر مشورہ دے رہا تھا کہ موجودہ بنگالی پلٹینوں کا وجود بھی ختم کر دیا جائے۔ فیصلے کی اس مشکل ساعت میں جنرل یحییٰ نے وہی کیا جو تذبذب کے شکار کمانڈر عموماً کیا کرتے ہیں۔ جنرل یحییٰ نے ایک بین بین راستہ تلاش کیا اور فیصلہ دیا کہ نئی پلٹینس قائم کرنے کے ساتھ ساتھ موجودہ بنگالی پلٹینوں کو غیر بنگالی پلٹینوں میں ضم کرنے کی کارروائی کا آغاز کیا جائے۔ اس کی ابتدائیوں ہوئی کہ ۱۹ ایف ایف میں بنگالی سپاہیوں کی ایک کمپنی شامل کر دی گئی، بعد میں ۲۵ پنجاب میں ایک بنگالی کمپنی ضم کرنے کا پروگرام تھا۔ خیال تھا کہ اگر یہ تجربہ کامیاب رہا تو ضم کرنے کی اس سکیم کو آگے بڑھایا جائے گا۔ ۱۹ ایف ایف میں بنگالی نفری کی شمولیت کے موقع پر ۳۱ دسمبر ۱۹۶۹ء کو فورٹریس اسٹیڈیم ڈھاکہ میں ایک تقریبی پرید ہوئی جو بخیر و خوبی انجام پائی؛ البتہ جی اوسی کے ذہن میں یہ کاٹا بابر کھنکھاتا رہا کہ اگر ۱۹ ایف ایف میں ضم شدہ بنگالیوں نے کسی ہانے (مثلاً ہم گندم کی بجائے چاول کھائیں گے) شورش برپا کر دی تو یہ تجربہ ہنگامہ پڑے گا۔

جی اوسی کا خدشہ بے بنیاد ثابت ہوا۔ ۱۹ ایف ایف بنگالی نفری سمیت مشرقی پاکستان میں اپنے فرائض انجام دیتی رہی اور بعد ازاں اپنی باری پر مغربی پاکستان منتقل ہو گئی۔ بخیر گزشت!

اس کامیاب تجربے کے باوجود ضم کرنے کی سکیم آگے نہ بڑھ سکی کیونکہ اس بارے میں صدر مملکت نے زبانی "اہستہ روی" کا حکم دے رکھا تھا۔

یہ تو تھی رُودادِ ادغام کی پالیسی کی اب ذرا بنگالی نفری کو ڈگنا کرنے کے حکم کا حال بھی سن لیجیے۔ اس حکم پر بڑے زور شور سے کارروائی شروع ہوئی۔ ابلاغ عاتر کے ذرائع کو اس کی تشہیر کے لیے خصوصی احکام جاری ہوئے۔ لڑھکتے لڑھکتے ایک حکم بھجوا گیا، کیونکہ بھی اشتہاری مشینری کا ایک ادنیٰ سا پرزہ تھا۔ حکم ہوا اس ہم کو مقبول بنانے کے لیے ایک اخباری مضمون لکھو۔

میں اس حکم کو پتلے باندھے چٹا گانگ پہنچا جہاں ایسٹ بنگال رجمنٹ کا سنٹر تھا۔ ضروری کوائف وہیں سے بل سکتے تھے۔ وہاں سچا سنٹر کمانڈنٹ اپنے دفتر کے باہر پر ہمار چنستان میں ڈھوپ سینک رہے تھے جن کو اپنی بنگالی قومیت کا احساس اور عجیب الزحمن کے

لے پلٹن کی منظورشہ نفری تقریباً آٹھ سو ہوتی ہے جن میں سے چھ سو کے قریب لڑائی میں مؤثر کردار ادا کرتے ہیں۔

87040 ۲۲ ۱۹۶۹

ذاتی قرب پر بہت فخر تھا۔ وہ لان میں بار بار بخوں کے بل کھڑے ہو کر اپنے آپ کو اوپر کی طرف کھینچتے۔ بظاہر یہ جسمانی ورزش کی عمدہ عادت تھی، لیکن شاید اس کے پیچھے کوئی نفسیاتی الجھن تھی جو میری موجودگی (۶ فٹ قد) میں اور شدید ہو گئی تھی۔

کرنل صاحب نے میری آمد کا مقصد جانتے ہی دو ٹوک کہا: بنگالیوں کا کوڑا ڈگنا کرنے کا کیا ڈھنڈورا پیٹنا چاہتے ہو؟ چھوڑو اس کو! کیونکہ اگر صدر کے حکم پر سو فیصد عمل ہو جائے تو بھی فوج پاکستان میں بنگالیوں کی تعداد مشکل پندرہ فیصد ہو جائے گی؛ حالانکہ وہ قومی آبادی

کا ۵۶ فی صد ہیں ۰

کرنل موحمدار سے کوئی ادھر پون گھنٹہ بصیرت حاصل کرنے کے بعد میں ان کے دفتر سے نکلا اور ایک اور (مغربی پاکستانی) دوست کے ہاں گیا۔ دوپہر کے کھانے پر میزبان نے سنٹر کمانڈنٹ کا از خود ذکر چھیڑا اور بتایا کہ چند ماہ پہلے بنگالی رگروٹوں کا ایک دستہ سنٹر میں اپنی تربیت مکمل کرنے کے بعد کراچی روانہ ہونے لگا، تو کرنل صاحب نے اسے خطاب کرتے ہوئے فرمایا: تم اب خود دار بنگالی سپاہی ہو تم وہاں پنجالی افسروں کے بوٹ پالش کرنے نہیں جا رہے۔ وقت آنے والا ہے کہ وہ تمہارے جو تے پالش کیا کریں گے!

کرنل موحمدار بنگالی سپاہیوں کے واحد سرپرست اور ہی خواہ نہیں تھے۔ انہیں ایک ماضی نوکری والے بنگالی لیفٹیننٹ جنرل اور ریٹائرڈ کرنل کی اعانت بھی حاصل تھی۔ میں ان دونوں سے ملا ہوں۔

فوری میں ڈھاکہ کے شمال میں جو دیب پور کے مقام پر ایک تقریب ہونے والی تھی۔ اس کے مہمان خصوصی لیفٹیننٹ جنرل وصی الدین تھے۔ انہیں وہاں ایسٹ بنگال رجمنٹ کی دوسری بٹالین (جو نیئر نیٹنگرز) کو رجمنٹل کلر عطا کرنا تھا۔ جنرل وصی الدین اس رجمنٹ کے کرنل کمانڈنٹ (اعزازی سرپرست) تھے، لیکن اس کے اصل سرپرست کرنل ایم اے جی عثمانی تھے جو فوج سے ریٹائر ہو کر عوامی لیگ کی سیاست میں سرگرم حصہ لیتے تھے۔ (بعد میں وہ عوامی لیگ کے ٹکٹ پر قومی اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے اور مجیب کی کابینہ میں وزیر بنے) جنرل وصی الدین اس تقریب کے سلسلے میں مغربی پاکستان سے ڈھاکہ پہنچے تو ۱۴ ڈویژن کے آفیسرز میں سے تھے۔ انہوں نے مجھے طلب فرمایا۔ کرنل عثمانی بھی موجود تھے جنرل صاحب نے اپنی تقریر کا مسودہ مجھے دیا تاکہ تقریب سے پہلے اس کی نقلیں بنوائی جائیں۔ میں تقریر لے کر واپس آ گیا۔ اگلے روز پھر بلایا گیا اور اس بار ایک نئی تقریر میرے حوالے کی گئی۔ حکم ہوا کہ پہلی تقریر منسوخ، نئی تقریر طبع کرائی جائے۔ میں نے دونوں تقریروں کا موازنہ کیا، پتہ چلا کہ دوسری تقریر میں کرنل عثمانی کی خدمات کو زیادہ صراحت سے سراہا گیا ہے اور تمام بنگالی سپاہیوں سے کہا گیا ہے کہ آڑے وقت میں ان کی رہنمائی پر بھروسہ کریں۔ تقریب کے بعد اس تقریر کی کچھ نئی نقلیں ٹکٹ کے دونوں بازوؤں میں تمام بنگالی فوجیوں میں تقسیم کی گئیں۔

کرنل عثمانی منحنی جسم، پست قامت، بن خورہ شخص تھے۔ ان کے سیاہ چہرے پر سفیدی کا ذرا نشان مویںوں کا گچھا تھا جو ان کے سناٹوں کے غالب حصے پر پھیلا ہوا تھا۔ کرنل صاحب کے دیرینہ دوست مذاق سے کہا کرتے کہ مویںوں سے لگا ہوا شخص دیکھنا ہوتا عثمانی کو دیکھ لو۔

(بحران میں کرنل عثمانی کے کردار کے بارے میں مفصل ذکر آگے آئے گا)۔

کرنل (ریٹائرڈ) عثمانی، کرنل موحمدار اور جنرل وصی الدین بنگالی سپاہیوں اور افسروں میں خاصا اثر و رسوخ رکھتے تھے۔ یہ سب جنرل غلام راجہ اس صورت حال سے پوری طرح آگاہ تھے۔ وہ جانتے تھے کہ بنگالی سپاہی اب ایسی ذہنی کیفیت میں ہیں کہ وہ اپنے گرو وپیش کے سیاسی حالات نظر انداز نہیں کر سکتے۔ جنرل صاحب کے سامنے یہ مثال موجود تھی کہ تحریک پاکستان کے دوران متحدہ ہندوستان میں مسلمان فوجی قائد اعظم محمد علی جناح کے ساتھ جذباتی وابستگی رکھتے تھے اور ان کی بے دیاں آزادی کے پروالوں کے ساتھ تھیں۔ اگر اس سیاسی احساس کے باوجود آزادی ملنے تک

ان کا دسپن قائم رہا تو اس کا ہرگز یہ مطلب نہیں کہ سیاسی مدوجزر کے باوجود بنگالی سپاہیوں کا نظم و ضبط غیر معینہ عرصے تک قائم رہ سکے گا۔ جنرل راجہ کے اندیشوں کی ایک بنیاد اگر تلا سازش تھی جس میں ایک فوجی پلان بھی شامل تھا۔ جنرل راجہ کے مطابق اس پلان کے تین حصے تھے۔ تمام یونٹوں کے اسلحہ خانے (KOTES) کو تھنا۔ غیر بنگالی فوجیوں کو غیر مسلح کرنا۔ اور چھاؤنیوں پر قبضہ کرنا۔ اس صورت حال سے بچنے کے لیے جنرل راجہ نے کسی سرکاری کام کے بہانے اپنے بریگیڈ کمانڈروں کو (جو اتفاق سے غیر بنگالی تھے) ڈھاکہ طلب کیا۔ انہیں امکانی خطرے کے بارے میں اعتماد میں لیا اور ہدایت کی کہ وہ احتیاطاً اپنی یونٹوں کا کچھ اسلحہ بیرونی میں رکھیں تاکہ آٹے وقت کام آسکے؛ جنرل راجہ نے مجھے بتایا؛ یہ مسئلہ اتنا نازک تھا کہ میں اسے اساطہ تحریر میں نہ لاسکا۔

جی اسی کے ان خدشات میں حقیقت کا کوئی عنصر تھا یا وہ محض ایک پینجانی جنرل کے دماغ کا فوٹو تھا؛ کہیں ایسا تو نہیں کہ جنرل صاحب کے دل میں پیدا ہونے والے دوسرے خدشات کو جنم دے رہے تھے؛ کیونکہ ہم حالات کے ایسے بھور میں گھرے ہوئے تھے جہاں اوقات کا منطقی تجربہ یہ مشکل تھا۔ مثلاً ایک دن یونٹی میں اپنے دفتر سے نکلا اور ٹھٹھا ٹھٹھا ایک بنگالی افسر کے دفتر چلا گیا، وہاں ایک اور بنگالی بیٹھا تھا۔ دونوں محو گفتگو تھے، مگر مجھے دیکھتے ہی خاموش ہو گئے۔ خاموشی کے چند ناگوار لمحے انتظار کرنے کے بعد میں نے کہا،

”کیئے جناب کیا ہو رہا ہے؟“

میزبان بولا،

”... دراصل... دراصل ہم اگلے اتوار کو پھل کے شکار کا پروگرام بنا رہے تھے۔“

”تو کیا میں بھی چلوں؟“

”... نہیں، نہیں... میرا مطلب ہے ابھی پروگرام فائنل نہیں ہوا۔“

بات ختم ہو گئی، مگر جوابوں کے انداز سے مجھے شک گزرا کہ وہ درحقیقت غیب کے بنگلہ دیش کی باتیں کر رہے تھے اور مجھے دیکھ کر پھلی کا ذکر لے بیٹھے؛ حالانکہ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ واقعی شکار کا پروگرام بنا رہے ہوں۔ حقیقت اور وہ ہم کو جدا کرنا واقعی ناممکن تھا۔ اس اندھیرے میں بصیرت حاصل کرنے کے لیے میں نے ایفٹینٹ جنرل صاحبزادہ یعقوب علی خاں سے ملاقات کی اور اس خدشے کا اظہار کیا کہ شاید بنگالی اور غیر بنگالی افسروں کے درمیان اعتماد کا پل ٹوٹ چکا ہے۔ جنرل یعقوب جو مجھ سے زیادہ باخبر اور دانشمند تھے اپنے رد عمل کو پی گئے۔ انہوں نے مجھے بتایا اور ایک پرمغز فلسفیانہ جملے سے میری تواضع کی۔ میں اپنے دوسرے لیے واپس چلا آیا۔

شاید جنرل یعقوب اور میں فوجی افسروں کے دو طبقوں کی نمائندگی کرتے تھے۔ مجھ جیسے جونیئر افسروں کو اپنے کم تجربے اور محدود معلومات کی بنا پر رانی بھی پہاڑ نظر آتی تھی اور جنرل صاحب جیسے ذہن رسا رکھنے والوں کو پہاڑ بھی رانی لگتا۔ حقیقت تک پہنچنے میں ایک دشواری یہ بھی تھی کہ ہر چیز بظاہر ڈسپن کے بجاری نول میں لپٹی ہوئی تھی۔ یہ نول ابھی قائم تھا۔ اس میں شکاف ڈالنے کے لیے عوامی لیگ کے پاس انتخابی سرگرمیوں کے آٹھ مہینے باقی تھے۔



مجیب کا عروج

وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ بنگالی قومیت کی دبائیز ہوتی جا رہی تھی اور شہری اور فوجی طبقے اس کی لپیٹ میں آ رہے تھے۔ اس کو مزید بڑھانے کے لیے عوامی لیگ ایڑی چھتی کا زور لگا رہی تھی۔ وہ ہر اس تقریب سے سر دھری اور بنگالی برتی جس سے قومی یکجہتی کو تقویت ملتی تھی اور ہر اس موقعے کو اہمیت دیتی جس سے صوبائی مصیبت کو فروغ حاصل ہوتا، مثلاً جب بھی یوم پاکستان (۲۳ مارچ)، یوم آزادی (۱۴ اگست)، یوم دفاع (۲۴ ستمبر) اور قائد اعظم کا یوم ولادت (۲۵ دسمبر) یا یوم وفات (۱۱ ستمبر) آیا، عوامی لیگ نے کوئی دلچسپی نہ لی، لیکن اس کے برعکس سارجنٹ ظہور الحق کی برسی، سانی فسادات کے شہیدوں کی یاد اور رابندر ناتھ ٹیگور کی جنم اشٹی کو ہمیشہ دھوم دھڑکتے سے منایا۔

سارجنٹ ظہور الحق ۱۹۶۸ء کی اگر تلاش میں مجیب کے ساتھ ماخوذ تھا۔ وہ ۱۹۶۹ء کے اوائل میں فوجی حراست میں ہلاک ہو گیا۔ ۱۵ ذی قعدہ کو اس کی پہلی برسی مشرقی پاکستان کے انیس میں سے سترہ اضلاع میں شان و شوکت سے منائی گئی۔ ان تقریبات میں عوامی لیگ پیش پیش تھی۔ اس کے علاوہ ڈھاکہ کے اہم روزناموں نے سارجنٹ کی تصویریں اور حالات زندگی کو جلی سُرخیوں کے ساتھ پہلے صفحات کی زینت بنایا۔ کئی مقالات پر مختلف جلسوں میں ظہور الحق کے جذبہ قربانی کو فرخاندانہ خراج پیش کیا گیا اور اس عزم کا عہد کیا گیا کہ مرحوم کا خون رائیگاں نہیں جانے دیا جائے گا۔ خود شیخ مجیب الرحمن نے ایک جلسے میں تقریر کرتے ہوئے فرمایا، سارجنٹ ظہور الحق کا نام ہمیشہ تیتو میر اور سر جے سین جیسے عظیم محبت و وطنوں کے ساتھ لیا جائے گا۔

۱۱ گئے ہفتے ۱۹۵۲ء کے سانی فسادات میں شہید ہونے والوں کی برسی تھی۔ یہ دن بنگالیوں کے لیے بالعموم اور عوامی لیگ کے لیے بالخصوص جذباتی اہمیت رکھتا تھا۔ اس روز بے پناہ دلولے اور جوش کا مظاہرہ کیا گیا۔ اخبارات نے خاص بھرچاپ کر شہداء کو نذرانہ عقیدت پیش کیا۔ سارا دن عظیم پورہ قبرستان میں شہداء کی قبروں پر لوگوں کا تانا بندا رہا۔ فنون لطیفہ کے کالج کے طلبہ و طالبات نے مرکزی شہید مینار سے عظیم پورہ قبرستان تک ساری سڑک کو معنورانہ نقش و نگار سے آراستہ کیا اور خود شیخ مجیب الرحمن نے آدھی رات کو شہید مینار پر حاضر میسے کروائی طور پر خراج عقیدت پیش کیا۔ اسی روز ایک جلسہ عام سے خطاب کرتے ہوئے شیخ مجیب نے مطالبہ کیا، حکومت کے تمام دفاتر اور اداروں میں ہر سطح پر بنگلہ زبان رائج کی جائے۔

۱۔ پاکستان آبرور۔ ڈھاکہ۔ مورخہ ۱۶ فروری ۱۹۶۰ء

۲۔ مارنگ نیوز۔ ڈھاکہ۔ مورخہ ۲۲ فروری ۱۹۶۰ء

۳۔ مارنگ نیوز۔ ڈھاکہ۔ مورخہ ۲۳ فروری ۱۹۶۰ء



بہرہ ۸ مئی کو بنگلہ زبان کے شاعر نیگور کا ایک سوانحیہ دن تھا نیگور کے سیکولر خیالات کی بنا پر حکومت نے ریڈیو اور ٹیلی ویژن سے اس کی شاعری کی نشر و اشاعت پر پابندی لگا رکھی تھی، مگر حکومت کے اس فیصلے کا بنگالیوں پر کوئی اثر نہیں ہوا تھا۔ وہ اب بھی اسے اپنے دل کی دھڑکنوں کی آواز سمجھتے تھے؛ چنانچہ اخبارات نے اس کے جنم دن پر اس کی بڑی بڑی تصویریں اس کی عظمت کے بارے میں مضامین اور اس کی نظموں کے تراجم (انگریزی اخبارات میں) نمایاں طور پر شائع کیے۔ بنگالی لڑکوں اور لڑکیوں نے نیگور کی نظموں کا ٹیپنگ گائیں اور اس کے گیتوں پر مبنی شیکت بھاؤں کا اہتمام کیا۔ خود مجیب جلوت و جلوت میں نیگور کے شعر اور مصرعے گنگنایا کرتے تھے۔

بنگالی قومیت کو فروغ دینے اور بین الصوبائی رابطوں کو کمزور کرنے کے لیے عوامی لیگ کی مہم کی ایک اور مثال دوسری کتابیں ہیں۔ ایک کتاب تھی ڈیش ڈکرتی (دھرتی اور لوگ) حکومت نے یہ کتاب ثانوی درجے کے نصاب میں شامل کر دی تاکہ مشرقی اور مغربی پاکستان کے درمیان نظریاتی رشتوں کو اجاگر کیا جاسکے۔ یہی بات عوامی لیگ کی اُنگوں کے خلاف تھی؛ چنانچہ اس کے ایما پر طلبہ نے اس کتاب کو نصاب سے خارج کرانے کے لیے زبردست مہم چلائی اور بہانہ یہ بنایا کہ اس کے الفاظ بوجھل ہیں اور طلبہ کو سمجھنے میں دشواری پیش آتی ہے۔ حالانکہ درحقیقت اسلامی رشتے کا ذکر ان کو بوجھل لگتا تھا اور اسے مضموم کرنے میں دشواری پیش آتی تھی۔ اس کے برعکس قرآن دین کی کتاب سوشل ہسٹری (سماجی تاریخ) تھی جس میں مشرقی پاکستان کا ثقافتی رشتہ کلکتہ سے ملایا گیا۔ اس پر حکومت نے پابندی لگا دی تھی، مگر طلبہ نے اس پابندی کے خلاف ایک پُر زور تحریک چلائی اور صوبے کے ممتاز شاعروں، ادیبوں اور دانشوروں کو اپنے ساتھ ملا لیا۔ خود مجیب نے اس کی حمایت میں یہ بیان دیا: بنگالی زبان کے لیے ۱۹۵۲ء کی تحریک کو کچھ لانا جاسکا۔ ہم اب بھی بنگالیوں کے تہذیبی ورثے پر اس حملے کی پُر زور مزاحمت کریں گے۔

دوسری سیاسی جماعتوں کے ساتھ عوامی لیگ کے رویے کی بنیادی قدر بھی یہی تھی کہ آیا وہ دونوں صوبوں کے درمیان یگانگت پھیلاتی ہیں یا منافرت! جنوری میں اس نے جماعت اسلامی کے جلسے کو مبینہ طور پر اس لیے درہم برہم کیا تھا کہ یہ دونوں صوبوں کے درمیان اسلامی رشتے پر زور دیتی تھی۔ اس ابتدائی واقعہ سے عوامی لیگ نے جماعت پر ایسی کاٹھی ڈالی کہ آئندہ انتخابی مہم کے دوران اس نے اپنا غلبہ قائم رکھا اور جماعت دب کر رہ گئی۔ اس کے علاوہ عوامی لیگ نے پاکستان ڈیموکریٹک پارٹی (پی ڈی پی) کے جلسوں میں یکم فروری، ۲۸ فروری اور ۷ مارچ کو بالترتیب ڈھاکہ، چٹاگانگ اور سید پور میں گڑبڑ کی اور ۱۰ مارچ، ۱۵ مارچ اور ۱۲ اپریل کو کومیلہ، باریسال اور ڈھاکہ میں کنونشن مسلم لیگ کے جلسوں کو ناکام بنایا۔ اسی طرح کئی اور مقامات پر اس نے اپنے سیاسی حریفوں کے قدم جھننے دیے۔

مجیب کے بڑے بڑے حریف مثلاً فضل القادر چودھری، خاں عبدالصبور خاں، مسٹر نوزال امین، پروفیسر غلام عظیم اور مولوی فرید احمد غیر مہم سیاسی دنگل میں مجیب کو براہ راست چیلنج کرنے کی سکت نہیں رکھتے تھے۔ ان کا اپنے اپنے حلقے میں اثر و رسوخ تھا، مگر صوبائی سطح پر مجیب سے ٹکر لینا ان کے بس میں نہ تھا؛ البتہ مولانا عبدالمجید جاشانی اس پوزیشن میں تھے کہ ملیشن میدان میں کھلے عام مجیب کی ہیٹمن گرج کے ساتھ چنگھاڑ سکتے تھے۔ وہ کئی بار سامنے آئے، خوب گرجے برے، مگر پھر مطلع صاف کیونکہ مولانا کسی سیاسی مقصد کے لیے کوئی مربوط، مسلسل یا منظم مہم چلانے کا ملکہ نہ رکھتے تھے۔ وہ ایک بار گرجتے پھر دم پڑ جاتے۔ ایک دفعہ آگے بڑھتے پھر پیچھے ہٹ جاتے اور جب چاہتے اپنا موقف



بآسانی تبدیل کر لیتے۔ مثلاً انہوں نے عوام کے مسائل حل کرنے کے لیے یکم اگست کو عوامی تحریک چلانے کا اعلان کیا۔ یکم اگست قریب آنے لگا تو اسے ۸ ستمبر تک ملتوی کر دیا۔ جب نئی تاریخ قریب پہنچی تو ۲ اکتوبر بتادی اور آخر میں کچھ بھی نہ ہوا۔ ٹائیس نامی فٹس! ایسی حرکتوں سے مشرقی پاکستان کی سیاست میں ان کی اہمیت بتدریج کم ہوتی گئی۔

مشرقی پاکستان کی سیاست کا یہ عروج وزوال — یعنی عروج مجیب کا اور زوال اس کے حریفوں کا — دیکھ کر ہمارے ذہنوں میں آنے والے دُھندلے دور کی تصویر واضح ہوتی گئی اور ہمیں احساس ہونے لگا کہ آئندہ انتخابات میں عوامی لیگ کے چھ نکاتی پروگرام کو اکثریت کی حمایت حاصل ہو جائے گی، مگر سوال یہ تھا کہ اگر ایسا ہوا تو پاکستان کا کیا بنے گا؟ اس خطرے کو روکنے کے لیے کیا کیا جاسکتا ہے؟

یہ مسئلہ ایک اعلیٰ سطحی کانفرنس میں بھی اٹھایا گیا جس کی صدارت خود جنرل یحییٰ خاں کر رہے تھے۔ یہ کانفرنس راولپنڈی میں منعقد ہوئی تھی اور تمام صوبوں کے گورنروں اور مارشل لاء ایڈمنسٹریٹروں نے شرکت کی تھی۔ وائس ایڈمرل ایس۔ ایم۔ احسن (گورنر مشرقی پاکستان)، کا دعویٰ ہے کہ انہوں نے اس کانفرنس میں یہ نکتہ اٹھایا تھا: مزید بحث کرنے سے پہلے میں اس بات کی وضاحت چاہتا ہوں کہ آیا چھ نکات کا پرچار کرنا مارشل لاء ریگولیشن نمبر ۶ کی خلاف ورزی ہے جو قومی سالمیت کے خلاف کوئی بات کہنے کی ممانعت کرتا ہے؟ — ایڈمرل احسن کا ارشاد ہے کہ انہیں یہ کہہ کر خاموش کر دیا گیا آپ فکر کریں۔

البتہ ملک میں ایسے بے شمار لوگ تھے جو اس بارے میں فکرمند تھے۔ غالباً انہی کے خدشات دور کرنے کے لیے جنرل یحییٰ خاں نے ۳۰ مارچ ۱۹۷۰ء کو اپنی گونا گوں مصروفیات سے وقت نکال کر نشریاتی اداروں کے ذریعے قوم کو یقین دلایا تھا: میں ایسی کوئی بات قبول نہیں کروں گا جو ہماری قومی سالمیت کے منافی ہو۔ اس یقین دہانی کے اگلے روز قانونی ڈھانچا (ایل ایف او) بھی جاری ہو گیا جس کی بنیادی شقیں دو تھیں یعنی مملکت کا اسلامی کردار اور قومی سالمیت کی گارنٹی۔ مجھے یہ دونوں خصوصیات پڑھ کر بہت اطمینان ہوا کیونکہ اس سے عوامی لیگ کے سیاسی موقف کی نفی ہوتی تھی جس کے ذریعے ایک طرف ملک میں سیکور نقطہ نظر پھیلایا جا رہا تھا اور دوسری طرف عملاً دو صوبائی وعدوں کے لیے راہ ہوار کی جا رہی تھی۔

یہ قانونی ڈھانچہ مجیب کو بہت ناگوار گزارا۔ خاص کر اس کی دفعات ۲۵ اور ۲۷ جن میں یہ شرط لگائی گئی تھی کہ کوئی آئین اس وقت تک قابل نفاذ نہیں ہوگا جب تک کہ اس پر (صدر مملکت کی) مہر تصدیق ثبت نہیں ہو جاتی۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ اگر مجیب الزحمن قومی اسمبلی میں (جو ابتدائی ۹۰ دنوں کے لیے قانون ساز اسمبلی تھی) اکثریت حاصل کر بھی لیتے تو بھی چھ نکات پر مبنی آئین کو نافذ نہیں کیا جاسکتا تھا تاکہ یحییٰ خاں اس پر صاف نہ کریں۔ اسی قدغن سے مشتعل ہو کر مجیب الزحمن نے کہا تھا: میں انتخابات ختم ہوتے ہی ایل ایف او کے پرزے کر دوں گا۔

گویا جنرل یحییٰ خاں راولپنڈی میں بیٹھے کچھ اور اعلان کر رہے تھے اور مجیب الزحمن مشرقی پاکستان میں کچھ اور کرنے کے درپے تھے۔ یہ تضاد دور کرنے اور حالات کا خود جائزہ لینے کے لیے صدر مملکت ڈاکٹر تشریف اللہ نے اور ۳۱ اپریل کو مجیب کو طلب فرمایا۔ جب مجیب ہاں پہنچے تو میں بھی موجود تھا۔ صدر یحییٰ خاں نے بڑی گرمجوشی سے ان کا خیر مقدم کیا، جب وہ مسائل سے دست و گریباں ہونے لگے تو میں باہر نکل آیا۔ کوئی ایک گھنٹے بعد مجھے ڈھونڈ کر ایک دوست کے گھر سے بلوایا گیا، کیونکہ کیبنٹ ڈویژن کی جانب سے ایک بگاری اعلیٰ

۱۹۷۰ء مارچ ۳۱۔ راولپنڈی۔



جاری کرنا تھا جس کے ذریعے ایل ایف او کی قابل اعتراض دفعات (۲۵ اور ۲۶) میں ترمیم مقصود تھی۔ میں نے مسترد تیار کر کے دے دیا اور چلا آیا۔ خوش قسمتی سے یہ اعلان روک لیا گیا، کیونکہ وریں اشٹا کسی نے یحییٰ خاں کو مشورہ دیا تھا، حضور سیاست دانوں کے سامنے اپنے آپ کو یوں بے دست و پا نہ کیجیے؟

۱۰ اپریل کو یحییٰ خاں مغربی پاکستان روانہ ہوئے۔ ڈھاکہ ایئرپورٹ پر اخبار نویسوں نے انہیں گھیر لیا اور ایل ایف او کی نرالی دفعات کے بارے میں سوالات کرنے لگے۔ ایک صحافی نے صدر کی مہر تصدیق سے متعلق دفتر پر حوامی لیگ کے اعتراض کی طرف توجہ دلائی، یحییٰ خاں نے کہا: یہ تو محض ضابطے کی خانہ پڑی ہے، ورنہ میں ان اختیارات کو استعمال کرنے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتا۔ یہ سن کر حوامی لیگ کے حامی ایک صحافی نے میرے کان میں کہا: صدر نے مجیب کو یقین دلایا ہے کہ یہ اختیارات استعمال کے لیے نہیں ہیں، ان کی حیثیت برطانوی آئین کے تحت ملکہ یا بادشاہ کے اختیارات سے زیادہ نہیں؟

مجھے اندازہ نہیں اس یقین دہانی کے بدلے یحییٰ خاں کو کیا ملا؛ البتہ مجھے اتنا معلوم ہے کہ اس سے مجیب کا یہ عقیدہ اور پختہ ہو گیا کہ وہ واقعی ہر دعوے کی اس معراج پر ہے جہاں یحییٰ خاں بھی اس کی خواہشوں کو نظر انداز نہیں کر سکتا۔

یحییٰ خاں اور مجیب کی مفاہمت کو مشکل دوہینے گزے ہوں گے کہ جناب مجیب نے پھر پھر زے نکالنا شروع کر دیے۔ انہوں نے ۳۱ جون کو اعلان کیا: میری پارٹی آئندہ انتخابات کو چھ نکات پر ریفرنڈم سمجھتی ہے۔ یہ ایک خطرناک اعلان تھا جس کا مسٹر نورالامین نے فوراً نوٹس لیا اور کہا: اگر آئندہ انتخابات کو چھ نکاتی پروگرام پر ریفرنڈم تسلیم کر لیا گیا اور مغربی پاکستان نے اس کی حمایت نہ کی، تو دونوں صوبے الگ ہو جائیں گے۔ اس پر مجیب اور برہم ہوئے اور چیخ کے انداز میں بولے: ہم نے گاندھی نرو اور ان کے انگریز سرپرستوں کی مخالفت کے باوجود ۱۹۴۶ء کا ریفرنڈم جیت لیا تھا اور اس مرتبہ بھی نورالامین اور ان کے سرپرستوں (مغربی پاکستان) کی مخالفت کے باوجود فتح ہماری ہوگی۔

یہ مثال کوئی نیک شگون نہ تھی، کیونکہ بانی پاکستان نے ۱۹۴۶ء کے ریفرنڈم کو قیام پاکستان کی تمہید بنایا تھا۔ کیا مجیب الزعمین بھی کوئی نئی مملکت بنانے کے درپے تھے؟ یحییٰ خاں کے ایک مہتمد نے ڈھاکہ میں مجیب سے اس کی وضاحت چاہی، تو وہ صاف مگر گئے۔ کہنے لگے: نہیں نہیں، میرا تو ایسا کوئی منشا نہیں۔ یہ مجیب کی پہلی قلابازی تھی نہ آخری۔ یہ دراصل ان کے کردار کا لازمی جزو تھا۔ مجھے کئی ایسے واقعات یاد ہیں جب وہ سرعام شیر کی طرح گرجتے، مگر اندر خانے حکام کے سامنے بھیکی بلی بن جاتے۔ اس دو عمل کا فائدہ یہ تھا کہ ایک طرف حوامی لیگ کی طرف کھینچے آتے تھے اور دوسری طرف حکام بھی ناراض نہیں ہوتے تھے۔ اسی حکمت عملی کے ذریعے وہ سیاست کے اوج ٹریا کی طرف ماہل پرواز رہے۔

۱۔ پاکستان آبزورڈ ڈھاکہ۔ ۵ جون ۱۹۷۰ء ۲۔ پاکستان آبزورڈ ڈھاکہ۔ ۶ جون ۱۹۷۰ء ۳۔ پاکستان آبزورڈ ڈھاکہ۔ ۷ جون ۱۹۷۰ء





جنرل آغا محمد یحییٰ خاں
صدر پاکستان

مارشل لا کا مسخ

حکومت اس سیاسی مذہب کا تماشا دیکھتی رہی۔ مذہبی یوگ کا اور جزر اس کے حریفوں کا۔ سول یا فوجی انتظامیہ نے وقت کے ہاؤ میں کوئی مداخلت نہ کی اور اگر اس نے چند اقدام کیے بھی تو ان کا فائدہ عجیب ہی کو پہنچا۔ وہ انتخابی مہم کے دوران بتدیج عوام کی خاموش اکثریت کو خون زدہ کر کے اپنی حمایت پر مجبور کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ شاید صوبائی حکومت یحییٰ خاں کے زور روینے کی یہی توضیح سمجھتی تھی۔

جنرل یحییٰ خاں نے عجیب کی طرف نرم رویہ کیوں اختیار کیا؟ آخر ایک ڈکٹیٹر کو کیا پڑی تھی کہ ایک سیاسی لیڈر کے مطالبات پر مطالبات ماننا جلے (مثلاً ایک آدمی ایک ووٹ کا اصول، ون یونٹ کی تفسیح) اور وہ بھی ایسے شخص کے جس پر اس کے پیش رو (فیلڈ مارشل ایوب خاں) نے غداری کے الزام میں مقدمہ چلایا تھا۔ عام قیاس یہ تھا کہ یحییٰ خاں مارشل لا اٹھ جانے کے بعد بھی ملک کا صدر رہنا چاہتے ہیں۔ یہ ایسی خواہش تھی جس کی تکمیل عجیب الرحمن کی تائید کے بغیر ممکن نہ تھی۔ پتہ نہیں اس قیاس میں حقیقت کتنی تھی۔ میں نے تو جنرل یحییٰ کی زبانی اس نرمی کی وجہ یہی سنی: ”مجھے پاکستان کے آبادی کے لحاظ سے سب سے بڑے صوبے کو ساتھ لے کر چلنا ہے۔ اگر عجیب اس کی ناسازگی نہیں کرتا، تو کون کرتا ہے؟“

اور مملکت کو بیشک خسرواں ہی بہتر سمجھتے ہیں۔ یحییٰ خاں کی مجبوریاں ہی انہی کو معلوم ہوں گی۔ مجھے تو اتنا علم ہے کہ عوامی یوگ نے اس نرم پالیسی سے پورا پورا فائدہ اٹھاتے ہوئے اپنی بالادستی قائم کرنے کے لیے ہر جائز و ناجائز حربہ استعمال کیا اور وہ اس میں کامیاب ہوئی۔ گورنمنٹ ہاؤس یا مارشل لا ہیڈ کوارٹر نے اس منہ زور گھوڑے کو لگام دینے کی کوئی کوشش کی نہ دوسرے سیاسی گھوڑوں کو ریس جیتنے کے لیے تھکی دی۔ وہ غیر جانبداری کا لبادہ اوڑھے سہرا بام کھڑے تماشا دیکھتے رہے۔

یکم ستمبر ۱۹۶۹ء کو جب وائس ایڈمرل ایس ایم حسن مشرقی پاکستان کے گورنر بنے، صوبائی نظم و نسق کی ذمہ داری یوں تقسیم کی گئی کہ امن و امان قائم رکھنا سول انتظامیہ کا کام ہو گا اور مارشل لا مشینری جس کے سربراہ یوٹینٹ جنرل صاحبزادہ یعقوب علی خاں تھے، اسی وقت حرکت میں آئے گی جب سول انتظامیہ بے دست و پا ہو جائے یا حالات اسے بے اثر کریں۔ ایڈمرل حسن اور جنرل یعقوب دونوں ہی اپنے اپنے شعبوں کے حاکم اعلیٰ تھے۔ ایک دوسرے کے آگے جواب دہ نہ تھا۔ دونوں براہ راست جنرل یحییٰ کے ماتحت تھے جو بیک وقت چار عمدوں پر فائز تھے۔ صدر چیف مارشل لا ایڈمنسٹریٹر، افواج پاکستان کے سپریم کمانڈر اور بڑی فوج کے کمانڈر انچیف۔

جنرل یعقوب اپنے منکرانہ ذہن، ملامت طبیعت اور شائستہ اخلاق کے لیے مشہور تھے۔ وہ مسائل کو سمجھنے اور آنے والے طوفان کا قبل از وقت

اندازہ لگانے کی صلاحیت رکھتے تھے۔ بہت سے لوگوں کا خیال تھا کہ جنگ شروع ہونے سے پہلے جس سمجھ بوجھ کی ضرورت ہوتی ہے وہ ان میں بدرجہ اتم موجود تھی۔ ایڈمرل احسن کو ان کی مرضی کے خلاف نیوی کی سربراہی سے ہٹا کر گورنری کی گدی پر بٹھایا گیا تھا۔ ان میں ڈویژن کی گوشہ نشینی، عالم کا علم اور سفیر کی ضابطہ پسندی جیسی نادر خصوصیات تھیں۔ یہ اوصاف جو کسی اور عہدے کے لیے قیمتی سرمایہ ہو سکتے تھے، ان بھرائی حالات میں زنجیر پائانت ہوئے۔ گورنری کی سرکاری ذمہ داریاں کسی اور طرح کی خوبیوں کا تقاضا کرتی تھیں۔ مثلاً غیر معمولی سیاسی بصیرت، بہترین انتظامی مہارت، مجلسی مزاج اور قابل عمل نظریات۔

گورنری احسن کی ایک مشکل یہ بھی تھی کہ انہیں صدر کا اعتماد حاصل تھا نہ فوج کی کمان میں تھی؛ حالانکہ ان دنوں طاقت کے یہی دوسرے تھے۔ صدر کے ساتھ ان کے مراسم محض رکھی تھے۔ سربراہ مملکت جب ڈھاکہ تشریف لاتے تو تقریباً ضابطے کے مطابق ایڈمرل احسن ایئرپورٹ پر ان کا استقبال کرتے۔ انہیں لے کر ایوان صدر پہنچاتے اور خود گورنمنٹ ہاؤس کی آماجگاہ میں چلے جاتے، پھر شاؤناور ہی صدر سے ملنے آتے سوائے اس کے کہ انہیں وہاں طلب کیا جائے یا کسی فوری کام کا تقاضا ہو۔

جب عسکری حلقوں سے ایڈمرل احسن کو ملنے والی حمایت کا یہ عالم تھا تو انہیں مجبوراً اپنے بنگالی چیف سیکرٹری مسٹر شیخ الاعظم کا سہارا لینا پڑا۔ یہ بنگالی ہیرو ڈگریٹ بڑے کاشیاں تھے۔ عوامی لیگ کا کیل کیلنے کے باوجود بیک وقت گورنر اور مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر کو خوش رکھنے میں یدِ طولی رکھتے تھے۔ یہ صاحب ایک سخت جلد رکھنے والے کپورے کی مانند تھے جو حسب ضرورت اپنی گردن آگے بڑھانے اور بروقت اسے اندر کھینچ لینے میں طاق تھا۔ وہ ان حربوں کے ذریعے خوب جانتے تھے کہ عوامی لیگ کو جرنیلوں کے مقابلے میں کس طرح کامیاب کرانا ہے۔ عوامی لیگ خوش تھی کہ یہ حضرت اس کلیدی آسامی پر فائز ہیں۔ بعض لوگوں کا خیال تھا کہ جنرل یحییٰ خاں نے انہیں عوامی لیگ کے کھنے پر یہ مقام دے رکھا ہے۔

اس صورت حال کا نتیجہ یہ نکلا کہ مشرقی پاکستان پر انتظامیہ کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی۔ مارشل لاء عام قانون سے بھی زیادہ غیر موثر ہو کر رہ گیا۔ گورنر احسن نے بعد میں اپنی کمزوری کا یہ جواز پیش کیا کہ بڑے بڑے جرائم مارشل لاء ضابطوں کی زد میں آتے تھے جنہیں نافذ کرنے کا اختیار صرف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر (جنرل یعقوب) کو تھا اور وہ صرف یحییٰ خاں کو جواب دہ تھے، مجھے نہیں۔

انتظامیہ کی بڑھتی ہوئی کمزوری اور عوامی لیگ کی بڑھتی ہوئی قوت کے اثرات جلد ہی ظاہر ہونے لگے۔ امن و امان کی حالت خراب ہو گئی۔ صنعتی، تجارتی اور تعلیمی زندگی تلیپٹ ہو کر رہ گئی۔ ہر شعبہ زندگی میں غیر یقینی، افراتفری اور بے راہروی درآئی۔ اس کا سب سے بڑا اثر فیکٹریوں اور کارخانوں پر پڑا۔ آئے دن ہڑتال، کام بندی اور تالا بندی بعض اوقات تو فیکٹریوں کیوں کھٹا کھٹ بند ہونے لگتی جیسے ان کے پیچھے کوئی طلسمانی ہاتھ کام کر رہا ہو۔

آدم جی جوٹ مل، نشتر جوٹ مل، کھٹا جوٹ مل، چٹا گانگ اسٹیل مل، وکرم اسٹیل مل اور پیر پل جیسے اہم ادارے طویل عرصے کیلے بند رہتے اور جب کبھی کھلتے تو میدان کارزار بن جاتے۔ کبھی مزدوروں کے اپنے گدہوں میں لڑائی اور کبھی آجروں اور مزدوروں کے درمیان معرکہ آرائی۔ مارشل لاء انتظامیہ حسب توفیق چیدہ چیدہ شرپسندوں کو جیل میں ڈالتی رہی مگر اس سے کوئی خاص افادہ نہ ہوا، بلکہ اٹا اشتعال بڑھا۔ نوبت یہاں تک پہنچی کہ ۲۹ اور ۳۰ مئی کو تقریباً دس ہزار مزدوروں نے کھٹا جیل کے دروازے توڑ کر اپنے مقید ساتھیوں کو رہا کرانے کی کوشش کی۔

اس سے ایک ہفتہ پہلے مزدوروں کے ایک اور مشتعل ہجوم نے ایک اسٹنٹ سپرنٹنڈنٹ پولیس (مسٹر فضل الرحمن گوری)



کو عین اُس وقت ہلاک کر دیا تھا جب وہ اپنے فرائض کی ادائیگی میں ناکہ بندی ختم کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ بوائیوں نے مقتول کی لاش کو گھسیٹا اور مسخ کیا۔ اس بے چارے کا تصور ہجوم کی نظر میں یہ تھا کہ وہ مغربی پاکستان کا پتھو تھا۔ جناب مجیب جو بنگالی پڑیا بھی مرنے لگی تھی تو دندناتا ہوا بیان داغ دیتے تھے، ایک فرض شناس پولیس آفیسر کی موت پر خاموش رہے۔

صنعتی افراتفری کے اس دور میں میں اسکیٹن روڈ (ڈھاکہ) پر ایک فرم (ڈھاکہ ڈائنگ) میں کپڑے کی چند مصنوعات خریدنے گیا۔ اس فرم کی جدید مشینری اور خوبصورت پارچات کی بڑی دھوم تھی۔ بیچنے والے نے میرے فوجی ہونے کا اندازہ لگایا اور اپنا ڈکھرائلٹا لگا، اس نے کہا:

”جناب ہم نے ایک کروڑ بیس لاکھ روپے کی غیر ملکی مشینری منگوا کر لگائی جس سے سالانہ ساڑھے بارہ کروڑ روپے کی مصنوعات تیار کی جاسکتی ہیں۔ ہم نے ڈیڑھ لاکھ روپے کی مالیت کی چیزیں ملکی ضروریات کے لیے الگ رکھنے کے بعد بعض غیر ملکی فرموں سے برآمدات کا معاہدہ کیا۔ اُدھر معاہدہ ہوا اور اُدھر ہڑتالوں نے زور پکڑا۔ فیکٹری بند رہنے لگی اور ہم وقت پر اشیاء سپلائی نہ کر سکے۔ اب ایک ہفتے سے سنگاپور کی ایک فرم کا نمائندہ آیا بیٹھا ہے تاکہ اپنی چیزیں اپنے سامنے جہاز پر لے دیا سکے، مگر میں اس کو کیا جواب دوں؟ بیشک اس کا رویہ ہمدردانہ ہے اور وہ ہماری مجبوریوں کو سمجھتا ہے، مگر اس کا اصرار ہے کہ مجھے کوئی حتمی تائید باوجود مال دستیاب ہوگا۔ آپ ہی بتائیے میں اسے کس طرح کوئی تائید بتاؤں جب مجھے یہ پتہ نہیں کہ فیکٹریاں کھلیں گی یا نہیں اور اگر کھلیں گی تو کتنے دنوں کے لیے....؟“

میں نے کہا: آپ نے حکام کو اس صورت حال سے آگاہ نہیں کیا؟

”جناب ایک مرتبہ نہیں کئی مرتبہ ہیں جب بھی مارشل لا والوں کے پاس جاتا ہوں تو وہ یہی کہتے ہیں یہ سول کا معاملہ ہے جسٹس والوں کے پاس جاتا ہوں تو وہ میٹھی میٹھی باتوں پر ٹر خادیتے ہیں لیکن ایکشن نہیں لیتے۔ یوں معلوم ہوتا ہے یہاں سرے سے کوئی حکومت ہے ہی نہیں۔ کم از کم میرے لیے تو کوئی حکومت نہیں جو میرا مسئلہ حل کر سکے۔“

مزدوروں کے علاوہ طلبہ بھی بد امنی پھیلانے میں پیش پیش تھے۔ گرمیوں کے آغاز میں انہیں امتحانات نے موقع مہیا کیا۔ انہوں نے کسی نہ کسی بہانے ان کا بائیکاٹ کر دیا۔ جن کا بائیکاٹ نہ کیا، ان کے نگرانوں اور ممتحنوں کا گھیراؤ کر کے انہیں زد و کوب کیا۔ بعض مقامات پر چاقو پھریاں بھی چلیں۔ جہاں کہیں وہ ترنگ میں آئے کھڑکیوں کے شیشے، بجلی کے قتمے اور فرنیچر توڑ پھوڑ دیا یا اسے آگ لگا دی۔ جب امتحانوں کا ناز گزر گیا، تو انہوں نے اپنے دیرینہ گیارہ نکات نکال لیے اور انہیں تسلیم کروانے کے لیے تحریک شروع کر دی۔ ان مطالبات کا تسلیمی مسائل سے بہت کم تعلق تھا۔ وہ سراسر سیاسی نوعیت (صوبائی خود مختاری وغیرہ) کے تھے۔ عجیب بات یہ ہے کہ وہی اساتذہ جو امتحانات کے سلسلے میں طلبہ کے ہاتھوں پھٹتے تھے، مطالبات منوانے کے لیے ان کے ساتھ ہوتے تھے۔

مزدوروں اور طالب علموں کی پھیلائی ہوئی یہ وبا سرکاری ملازمین تک بھی پہنچ گئی۔ ماہ جون کے شروع میں کوئی سولہ ہزار سرکاری ملازموں نے اپنے مطالبات منوانے کے لیے ہڑتال کر دی۔ حکومت نے اس ہڑتال کو غیر قانونی قرار دے کر وادینا چاہا، مگر مجیب الزحمن نے ہڑتالیوں کی حمایت میں بیان دے کر ان کو شیر بندویا۔ مجیب نے گورنر کے نام ایک تار بھی دیا کہ ان کے مطالبات فوراً مان لیے جائیں۔ سرکاری

لے روزنامہ مارنگ نیوز، ڈھاکہ۔ مورخہ ۲۶ جولائی ۱۹۷۰ء۔



ملازموں نے اس سے یہ تاثر لیا کہ ان کی ہمدرد حکومت نہیں، مجیب الرحمن ہے۔

ان کی دیکھا دیکھی سازش صہبانی، خاندانی منصوبہ بندی کے عملے، چٹڑے کے کارخانوں اور چائے کے باغوں میں کام کرنے والوں نے بھی ہڑتالیں شروع کر دیں۔ ان سب نے اپنے اپنے مطالبات کو باقاعدہ نکات کی شکل دی۔ مختلف طبقوں کے نکات کی تعداد مختلف تھی۔ کسی کی تین، کسی کی پانچ اور کسی کی پندرہ۔ یہ رجمان نقطہ عروج کو اس وقت پہنچا جب ۴ ستمبر ۱۹۷۰ء کو گدگروں نے بھی ایک انجمن قائم کر کے اپنے مطالبات منوانے کے لیے پلٹن میدان میں ایک جلسہ کر ڈالا۔

ان احتجاجی مظاہروں کے اثر کو دو آتش بنانے کے لیے بارودی دھماکوں کا سلسلہ شروع کیا گیا جس کی ابتدا ۵ مئی کو توپخانہ روڈ پر واقع قومی کھیتی کو نسل سے ہوئی (اس عمارت کے انتخاب کی وجہ اس کے نام سے ظاہر ہے)۔ ۵ مئی کو شام کے ساڑھے سات بجے تھے۔ کونسل کی بالائی منزل پر لائبریری میں بہت سے لوگ مطالعے میں مصروف تھے۔ قین لڑکے اندر داخل ہوئے انہوں نے حاضرین سے کہا: یہ لائبریری خالی کر دو ہم اس میں بم پھینکنے آئے ہیں۔

لوگوں نے بلاچون و چرا اس حکم کی تعمیل کی اور باہر آکر کھڑے ہو گئے۔ ان صاحبزادوں نے دو بم پھینکے اور اطمینان سے حیرپ میں بیٹھ کر چلتے بنے۔ لوگ گلی میں کھڑے آگ میں بھلتے فرنیچر کا تماشا دیکھتے رہے۔ کسی شخص نے نہ اس وقت ان شرپندوں پر ہاتھ ڈالا اور نہ بعد میں آنے والے تھمقانی افسروں سے تعاون کیا۔

بموں کے دھماکے پنے تلے دھنوں سے ہوا کرتے۔ جیسے ہی ذرا سکون ہونے لگا نیا دھماکہ نیا ارتعاش پھیلا دیتا۔ ان دھماکوں کی خبریں کھلنا چٹا گانگ، رنگ پور اور دوسرے شہروں سے بھی آرہی تھیں مگر ان کا اصل زور اخصابی مرکز ڈھاکہ میں تھا جہاں ان کا اثر زیادہ لیا جاتا تھا۔

انتظامی بد نظمی، صنعتی انتشار اور دہشت گردی نے ہر اس اور بے یقینی کی فضا پیدا کر دی تھی۔ امن پسند شہری گھروں کے اندر رہنا زیادہ محفوظ سمجھتے تھے، کیونکہ گلیاں موت کے کوبے بن گئی تھیں۔ مجھے یاد ہے انہی دنوں میں ایک مہمان کو لے کر ڈھاکہ کے اردو شاعر ظہور الحق کے گھر گیا۔ ظہور الحق اندرون شہر رہتے تھے۔ ہم غامی دیر ان کے آہنی پھانگ پر دستک دیتے رہے، مگر کوئی شوائی نہ ہوئی۔ جب ہمت ہارنے لگے تو ایک ملازم آیا اور پہلے تو اندر سے جھانک کر ہمارا جائزہ لیتا رہا، پھر ہمارا نام وغیرہ پوچھ کر اندر گیا اور خصوصی اجازت ملنے پر اندر لے گیا۔ میزبان نے موسیٰ مشروب اور تازہ غزل سے ہماری تواضع کی۔ غزل میں حُسن و عشق کم اور بلبُل کا نالہ زیادہ تھا۔ غزلیں سننے کے بعد اس نے مجھ سے کہا: آپ فوجی لوگ ادھر کا رخ نہیں کرتے، حالانکہ آپ ہماری جان اور ناموس کے نگہبان ہیں، سنا ہے آپ نے فوجیوں کے لیے اندرون شہر کا علاقہ ممنوع قرار دے رکھا ہے۔ آپ کو کیا معلوم کہ ہم پر وقت کی ایک ایک ساعت کس قدر گراں گزرتی ہے؟

واپسی پر میں ایک روز نامے کے دفتر میں رُکا جہاں ایک بنگالی بیرسٹر سے ملاقات ہوئی جو اس اخبار کے لیے قانونی شذ سے ملتا تھا۔ چائے کی یہالی پر قدرتی طور پر حالاتِ حاضرہ زیر بحث آئے، اس نے کہا: لاء کانسٹیبل تو نہ اڑیے خواہ یہ مارشل لاء ہی کیوں نہ ہو۔ یا تو اسے حقیقی معنوں میں نافذ کیجیے یا اسے اٹھالیجیے۔

لہ روزنامہ پاکستان، بروز ڈھاکہ، روز ۵ ستمبر ۱۹۷۰ء۔



میں نے اپنی اگلی ملاقات میں مارشل لا کے غیر مؤثر ہونے کا ذکر جنرل صاحبزادہ یعقوب سے کیا۔ انہوں نے بات پتلے بانڈھری اور

چند روز بعد مقامی ایڈیٹروں سے اپنی ماہانہ گفتگو میں اسے موضوع بنایا۔ انہوں نے مارشل لا کی بے اثری کا یہ جواز پیش کیا؛

پاکستان میں لوگ مارشل لا کو دہشت اور خوف کی علامت سمجھتے ہیں لیکن وہ بھول جاتے ہیں کہ موجودہ مارشل لا ملک میں

جمہوریت کی راہ ہموار کر رہا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ مارشل لا اور جمہوریت متضاد ہیں۔ اگر مارشل لا اپنی روایتی شکل میں نافذ کیا جائے، تو وہ

جمہوریت کی نفی کرتا ہے، مگر ان حالات میں جمہوریت کی نشوونما کے لیے ضروری ہے کہ مارشل لا کی کاٹ کو ذرا کند رکھا جائے۔ بعض اوقات

جب آپ لوگ سوچتے ہوں گے کہ کارروائی کیوں نہیں کی جا رہی، ہمیں یہ دیکھنا پڑتا ہے کہ کارروائی سے اُلٹا نقصان تو نہیں ہو گا۔ آپ

ہوا بازی کی اصطلاح میں یوں سمجھیے کہ کوئی پائلٹ دوران پرواز یہ سمجھنے لگے کہ اس کا جہاز میٹر جاہور رہا ہے اور وہ اسے سیدھا کرنے کی

کوشش میں پیڑ سے ٹکرا کر پاش پاش ہو جائے؛ حالانکہ اگر وہ جہاز کو نہ پھیڑتا، تو تنگ وادی کے نیچوں بیچ بخیر و عافیت گزر جاتا؛

بنگالی ایڈیٹر جنرل یعقوب کے استدلال اور استعارے سے بہت مرعوب ہوئے، مگر ان کا تاثر اپنی جگہ قائم رہا کہ مملکت کا جہاز

تشویشناک طور پر ڈگمگا رہا ہے اور اگر اسے بروقت سنبھالا نہ دیا گیا، تو تباہ ہو جائے گا۔

حکومت نے صورت حال کو درست کرنے کے لیے کوئی اقدام نہ کیا۔ نظم و نسق کی حالت خراب ہوتی گئی۔ صنعتی زندگی اُجڑ گئی،

تعلیمی ادارے تعلیمی مقاصد کے لیے بند اور غیر تعلیمی سرگرمیوں کے لیے کھلے رہے۔ عوامی لیگ کی بربریت اور دبدر روز بروز بڑھتا رہا اور اس

کے سیاسی حریف یکے بعد دیگرے میدان چھوڑتے گئے۔

— یہ سچی وہ فضا جس میں دسمبر ۱۹۷۱ء کے عام انتخابات ہونے والے تھے۔ —



شیخ صاحب جیت گئے

عوامی لیگ درحقیقت پونگ سے پہلے ہی انتخابات جیت چکی تھی، دسمبر اس کی رسمی توثیق کا دن تھا۔ اس کا احساس تقریباً بھی لوگوں کو ہو چکا تھا اور انہوں نے الیکشن سے پہلے ہی چڑھتے سونج کی پرستش شروع کر دی تھی۔ ڈھاکہ ٹیلی ڈرن کے بنگالی جنرل منجرنے یکم دسمبر کو منجھ سے کہا: مجھے شیخ صاحب کے پاس جا کر اس بات کی معذرت کر لینی چاہیے کہ ہم ڈور افتادہ علاقوں میں ان کے جلسوں کی تشہیر نہ کر سکے، کیونکہ بیڈ کوارٹر (راولپنڈی) سے حکم آیا تھا کہ صرف بڑے بڑے شہروں میں اپنی کیمپ نہیں بھیجیں، شیخ صاحب یقیناً اس پر خفا ہوں گے۔ وہ برسہا اقتدار کر مکن ہے آپ (باوردی) لوگوں کو کچھ نہ کہیں لیکن مجھے ہرگز نہیں بخشیں گے۔

ڈھاکہ کے ایک ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ پولیس نے ایسے ہی خدشات کا اظہار کرتے ہوئے کہا: میں نے ۲۲ مئی کو پوسٹو گولہ میں مجیب کے حامی مزدوروں پر لاشی چارج کروایا تھا۔ مزدوروں نے ضرور میرا نام شیخ صاحب کو بتا دیا ہو گا اور ان کو یہ واقعہ اب بھی یاد ہو گا۔ وہ مجھے نہیں بخشیں گے۔

عام شہری کے احساسات کی ترجمانی میرے ایک دوست رحمن نے یوں کی: "ملک بدمسئ کے دلہانے پر کھڑا ہے۔ اگر عوامی لیگ انتخابات جیت گئی، تو وہ حریفوں کی زندگی اجیرن کرے گی اور اگر نہ جیت سکی، تو تشدد پر اتر آئے گی تاکہ کوئی اور اقتدار میں نہ آسکے۔ وہ ہر قیمت پر اپنا تسلط قائم کرنے پر تلی ہوئی ہے۔"

فوجی حلقوں سے طبری اٹیلی جنس کے ایک افسر نے کہا: حکومت کی باگ ڈور سنبھالنے پر اگر شیخ صاحب نے اگر تراسا شس کیس کے کاغذات طلب کیے تو ان کو کئی مقامات پر فدوی کا نام نظر آئے گا اور وہ اتنے باخبر اور کشادہ دل انسان نہیں کہ کسی کو معاف کر دیں یا ان باتوں کو نظر انداز کر دیں۔ فوج کے کسی سینئر افسر جنہوں نے بظاہر عجیب کو ناراض کرنے والی کوئی حرکت نہیں کی تھی، وہ بھی اس کی حمایت میں زور بیان کر رہے تھے، وہ بلند بانگ چھ نکات کے گن گاتے اور عوامی لیگ کے منشور کی برکات گنواتے۔ ان کا خیال تھا کہ وہ یوں تقبل کے حکمرانوں کی خوشنودی حاصل کر سکیں گے۔

جب کہ فوجی اور غیر فوجی حلقوں کو عوامی لیگ کی فتح یقینی نظر آرہی تھی، خود عوامی لیگ عجب ذہنی کیفیت کا شکار تھی۔ اس کی حالت اس تحلیل سے طبعی جلتی تھی جس نے دوڑ جیتنے کی پوری تیاری کر رکھی ہو، لیکن اسے یقین نہ ہو کہ دوڑ ہوگی بھی یا نہیں اور اگر ہوئی، تو اس کو اپنی محنت کا ثمر ملے گا یا نہیں۔ عوامی لیگ سے تعلق رکھنے والے کئی افراد نے مجھ سے اور دوسرے حضرات سے اس بات کی تصدیق کرنا چاہا کہ واقعی، دسمبر کو حسب وعدہ الیکشن ہوں گے، اس تشویش کا باعث یہ افواہ تھی کہ بری فوج کے چیف آف اسٹاف جنرل حمید نے جنرل کچی سے اقتدار چھین لیا ہے۔ یہی خاں بے بس ہیں اور حمید کسی وقت انتخابات منسوخ کر کے ایک نئے باب کا آغاز کرنے والے ہیں۔ اتفاق

سے یہ دونوں جرنیل ان دنوں ڈھاکہ میں مقیم تھے۔

۳ دسمبر کو جنرل یحییٰ خاں مغربی پاکستان روانہ ہونے کے لیے ڈھاکہ ایئرپورٹ پر پہنچے تو ایک غیر ملکی صحافی نے خود ان سے پوچھ لیا: مسٹر پریذیڈنٹ! کیا اب بھی ملک کی باگ ڈور آپ کے ہاتھ میں ہے؟ صدر نے کہا: ہاں ہاں بالکل بالکل! صحافی بولا: مگر یہاں یہ افواہ گشت کر رہی ہے کہ.... یحییٰ خاں نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا: سراسر کھوس... لغو! انہوں نے جھنجھلاہٹ میں بائیں جانب گردن موڑی (جہاں میں اور چند افسر کھڑے تھے) اور اپنی بھاری پلکیں تیز تیز جھپکتے ہوئے کہا: کون ہے جو میرے اختیارات میں شریک ہے؟ کون ہے؟... جب تک میں زچا ہوں یہاں کوئی پر نہیں مار سکتا! یہ کہتے ہی وہ ہونٹ بھینچتے، ڈنڈا اٹھاتے بونٹنگ میں سوار ہو گئے۔

انتخابات کی تاریخ قریب پہنچی تو کوئی ایک سو غیر ملکی صحافی ڈھاکہ پہنچ گئے۔ میں نے اس سے پہلے صحافیوں کی اتنی بڑی تعداد وہاں کبھی نہ دیکھی تھی؛ حالانکہ ہم سیلاب اور سائیکلون جیسے قومی سانحوں سے گزر چکے تھے۔ وزارت اطلاعات، نشر و اشاعت نے ان صحافیوں کے اعزاز میں ۲۴ دسمبر کو پوربانی ہارٹل میں عشاءِ دیدار جس میں میں بھی مدعو تھا۔ کھانے کی میز پر میرے ساتھ تین غیر ملکی صحافی تھے۔ گفتگو کا موضوع اگلے روز کے الیکشن تھے۔ ان میں سے ایک نے مجھ سے پوچھا:

”میجر، یہ بتاؤ تم اپنا ووٹ کس کو دو گے؟“

میں نے جواب دیا:

”صرف ایک ہی تو پارٹی ہے۔ عوامی لیگ۔“

وہ اس جملے کو سنجیدہ جواب کجا اور صادم میں اپنا سر ہلانے لگا۔

کھانے سے فارغ ہو کر میں مارشل لا ہیڈ کوارٹر گیا جو صوبائی اسمبلی کی عمارت میں واقع تھا۔ وہاں چند افسر بیٹھے غیر رسمی طور پر اس مسئلے پر تبادلہ خیال کر رہے تھے کہ آیا نظم و ضبط رکھنے کے لیے دفعہ ۱۴۴ لگادی جائے جس کے تحت چار یا چار سے زائد افراد کے اجتماع اور اسلئے کر چلنے کی ممانعت ہوتی ہے۔ جو افسر یہ پابندی لگانے کی حمایت کر رہے تھے ان کا خیال تھا کہ اس کے بغیر امن و امان بحال رکھنا ناممکن ہوگا اور جو اس کے مخالف تھے ان کا استدلال یہ تھا کہ الیکشن کے دن یہ تجویز ناقابل عمل ہوگی۔

مجھے کمرے میں داخل ہوتے دیکھ کر ایک صاحب بلند آواز میں بولے: ”بیجیے ہمارا رائے عامر کا باہر آ گیا اس سے پوچھتے ہیں: میں نے اپنے اوپر ماہرانہ سنجیدگی طاری کرتے ہوئے کہا،

”میں رائے عامر کے متعلق اپنے تجربے کی روشنی میں کہہ سکتا ہوں کہ اس موقع پر یہ پابندی موزوں نہیں کیونکہ میں سمجھتا ہوں کہ کثیدہ ماحول میں یہ جلتی پرتیل کا کام کرے گی۔ عوامی لیگ کی جیت یقینی ہے۔ وہ اپنے مفاد میں امن و امان بھی بحال رکھے گی؛ تعجب کی بات کہ میرے انداز فکر کو واقعی ماہرانہ رائے سمجھ کر تسلیم کر لیا گیا۔ میں اس سے بہت محفوظ ہوا۔“

الیکشن سے چار روز پہلے عساکر پاکستان (زیادہ تر بڑی فوج) کو انتخابات کی نگرانی سونپی گئی تھی، مگر ان کا دائرہ کار مستحق کر دیا گیا تھا۔ راولپنڈی سے موصول ہونے والی ہدایات کا پتھر یہ تھا:

(ا) پونٹنگ میں کسی قسم کی مداخلت نہ کی جائے۔

(ب) صرف نازک مقامات (ٹیلیفون ایکسچینج، تار گھر، بینک، ریڈیو اسٹیشن وغیرہ) پر نگاہ رکھی جائے۔



(ج) سپاہیوں کو عوام کی نظروں سے اوجھل رکھا جائے تاکہ وہ اشتعال کا باعث نہ بنیں)

(د) صرف بڑے کو فرو کرنے کے لیے کارروائی کی جائے۔

ان ہدایات کی روشنی میں انتخابات کی نگرانی کرنے کے لیے مارشل لا ہیڈ کوارٹر میں ایک آپریشن روم قائم کیا گیا۔ ردسبر کا سٹیج پوری آب و تاب سے طلوع ہوا۔ متعلقہ افسروں نے آپریشن روم میں اپنے فرائض نبھائے اور جنرل یعقوب ہیلی کا پٹر کے ذریعے پونگ اسٹیشنوں کا فضائی جائزہ لینے گئے۔ میں بھی ان کے ساتھ تھا۔ ہم نے اوپر سے لوگوں کے ٹھٹھ کے ٹھٹھ دیکھے۔ مگر منظم اور پرامن جنرل صاحب یہ منظر دیکھ کر بہت خوش ہوئے۔

واپس آکر میں آپریشن روم میں بیٹھ گیا، کیونکہ حملہ معلومات کا یہی مرکز تھا۔ دن کے ابتدائی حصے میں وہاں پرتین فوجی افسر چپ چپ اور کسی حد تک سناؤ کا شکار تھے، مگر جب دوپہر تک کسی ناخوشگوار واقعے کی خبر نہ پہنچی، تو وہ شدید کج نارمل ہونے لگے۔ ماحول میں طماننت اور ان کے چہروں پر اطمینان کے آثار نظر آنے لگے۔ تھوڑی دیر بعد گپ شپ کا ماحول عموماً آیا، ہم گپ شپ لگاتے رہے اور ایک صاحب دائیں اور ٹیلیفون سے بچتے رہے۔ جو کوئی ان سے پوچھتا وہ اس کو پرامن انتخابات کا مزہ سنا دیتے۔ ایک دوبارہ راولپنڈی سے بھی فون آیا، انہیں بھی سب ٹھیک ہے کی رپورٹ دے دی گئی۔

پونگ اسٹیشنوں پر حالت مختلف تھی۔ عوامی لیگ کے غنڈوں نے اکثر مقامات پر دہرہ بجا رکھا تھا، وہ مرضی سے ووٹ ڈال رہے تھے۔ پونگ افسروں اور پریذیڈنٹنگ افسروں نے اپنے مستقبل کے حکمرانوں کو من مانی کرنے کی چھیٹی ڈے رکھی تھی۔ حریف جماعتوں کو داوری کے لیے فوجی افسروں کی طرف رجوع کرنا پڑتا تھا، مگر وہ اس وقت تک مداخلت کرنے کے مجاز نہ تھے جب تک کہ امن عامتہ میں خلل نہ پڑے۔ مثال کے طور پر دو واقعات درج کرتا ہوں:

ضلع نواکلی میں چومو بانی کے مقام پر ایک بارہ سالہ لڑکا بنگلہ دیشی زہد بادی کے نعرے لگاتا پونگ بوتھ میں ووٹ ڈالنے آیا۔ عوامی لیگ کا مخالف امیدوار اس لڑکے کو پکڑ کر کیپٹن چودھری کے پاس لے گیا جو اپنی پلاٹن سمیت ساتھ والی عمارت میں چھپے بیٹھے تھے۔ امیدوار نے شکایت کی کہ اول تو یہ لڑکا عمر کے لحاظ سے ووٹ دینے کا اہل نہیں، دوم یہ پونگ بوتھ میں نعرے لگا کر قانون کی خلاف ورزی کر رہا ہے۔ کیپٹن صاحب نے عرضداشت ہمدردی سے سنی، مگر یہ کہہ کر کسی قسم کی کارروائی کرنے سے مندرت کر لی کہ میں اس کا مجاز نہیں آپ پریذیڈنٹنگ

فسر سے شکایت کیے۔

دوسرا واقعہ ٹیکل سے متعلق ہے جہاں رحمن نامی شخص کو میجر خان کے سامنے پیش کیا گیا، کیونکہ وہ پونگ افسر کی ملی بھگت سے پانچویں مرتبہ اپنی پرچی ڈالنے جا رہا تھا۔ میجر صاحب نے شکایت سننے کے بعد فرمایا: بندہ نواز! آپ کا ارشاد درست، مگر یہ میرا دوسرا نہیں کہ کون کتنی مرتبہ ووٹ ڈالتا ہے۔ مجھے یہ بتانیے کون کون خراب ہوا ہے یا نہیں۔

سارا دن یہ تماشا دیکھنے کے بعد جب، ردسبر کا سٹیج مغربی افق میں اپنا منہ چھپانے لگا، تو جنرل یعقوب، میجر جنرل راولفرمان علی کے دفتر میں (جو سول معاملات کے انچارج تھے) داخل ہوئے۔ ان کے چہرے پر طماننت اور فخر کے آثار نمایاں تھے۔ انہوں نے داخل ہوتے ہی کامرانی کے انداز میں کہا: مجھے خوشی ہے حالات پرسکون رہے اور انتخابات منصفانہ اور آزاد ماحول میں منعقد ہو گئے، جنرل فرمان نے کہا: بیشک۔ آزاد۔۔۔ یکسر آزاد!

چار روز بعد (۱۱ دسمبر) جنرل یحییٰ خاں نے عساکر پاکستان کے تمام افسروں اور جوانوں کو داد و تحسین کا یہ پیغام بھیجا: پرامن انتخابات



منعقد کرنے میں عساکر پاکستان کے تمام افسروں نے جس غیر جانبداری فرض شناسی اور ضبط کا مظاہرہ کیا ہے وہ داد اور تحسین کا مستحق ہے۔ اس پر اس ماحول کا نتیجہ یہ نکلا کہ دو نشستوں کے سوا ساری سیٹیں عوامی لیگ کی جھولی میں جا پڑیں۔ غیر سرکاری گنتی مکمل ہوتے ہی اس غیر ملکی صحنہ نے جس کے ساتھ میں نے ۶ دسمبر کو ایک ہی میز پر کھانا کھایا تھا، اپنے ہومل سے مجھے فون کیا: میجر! بہت بہت مبارکباد! آپ کی پارٹی بجاری اکثریت سے جیت گئی۔ بلکہ اس نے گویا جھاڑو ہی پھیر دیا۔ میرے لیے یہ مبارکباد مفہم کرنے کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔ آخر جیتنے والے گھوڑے کو کون نہیں اپناتا!

عوامی لیگ نے الیکشن تو جیت لیا، اب دیکھنے کی بات یہ تھی کہ اس بھرپور کامیابی سے اس کے رویے میں فریاد آتی ہے یا اس کا سر غرور سے اُٹھ جاتا ہے۔ اس کا کوئی جواب دستیاب نہ تھا۔ مجھے رہ رہ کر شیخ مجیب کے آئینی مشیر ڈاکٹر کمال حسین (جو بعد میں بنگلہ دیش کے وزیر خارجہ بنے) سے اپنی ملاقات یاد آ رہی تھی جو ایک ماہ قبل ڈھاکہ انٹر کانٹینینٹل کے صحیح بستہ بار میں ہوئی تھی۔ اس ملاقات کے دوران میں نے عوامی لیگ کی یقینی کامیابی کے پیش نظر ڈاکٹر صاحب کو مشورہ دیا کہ وہ شیخ مجیب الرحمن کو صوبائی لیڈر کے بجائے قومی قائد کے طور پر پیش کریں اور اگر ممکن ہو تو مغربی پاکستان کا بھی دورہ کر لیں تاکہ پورے پاکستان کے وزیر اعظم کے طور پر قابل قبول ہو سکیں۔ انہوں نے میری تجویز کو سراہتے ہوئے کہا تھا: اس پر ہم انتخابات کے بعد ہی عمل کر سکیں گے، کیونکہ ہم آئندہ انتخابات چھ نکات اور بنگالی قومیت کی بنیاد پر لڑ رہے ہیں۔ اگر ہم نے اس وقت پینتہ بدلا، تو کوئی عجب نہیں یہاں بھی الیکشن ہار جائیں۔ ایک مرتبہ ہم عوام کی حمایت حاصل کر لیں تو چھ نکات میں ایسی ترمیم کر دیں گے کہ وہ مغربی پاکستان کے لیے بھی قابل قبول ہو سکیں۔

میں الیکشن کے بعد ڈاکٹر صاحب سے ملنے کے لیے بے تاب تھا تاکہ اندازہ کر سکوں کہ وہ کہاں تک اپنی بات پر قائم ہیں۔ دسمبر کے وسط میں ان سے پھر ملاقات ہوئی، میں نے سابقہ ملاقات کا حوالہ دیا، مگر وہ مشرقی پاکستان کے متکون مزاج موسم کی طرح بدل چکے تھے انہوں نے فرمایا: اب چھ نکات میں کوئی تبدیلی نہیں ہو سکتی، کیونکہ یہ قوم کی امانت ہیں، ان سے کسی قسم کا انحراف لوگوں کے اعتماد کو ٹھیس پہنچانے کے مترادف ہو گا۔

اسی نقطہ نظر کا اعلان خود پارٹی کے صدر شیخ مجیب الرحمن نے الیکشن کے دو روز بعد ان الفاظ میں کر دیا تھا: بنگلہ دیش کے عوام نے یہ انتخاب چھ نکات، گیارہ نکات اور صوبائی خود مختاری پر ریفرنڈم کی حیثیت سے جیتے ہیں، لہذا چھ نکات پر مبنی ایسے دستور کی تشکیل از بس ضروری ہے جس میں مکمل خود مختاری کی پوری پوری ضمانت دی گئی ہو۔

اگر مجیب الرحمن اس موقف پر سختی سے قائم رہتے ہیں اور اپنی اکثریت کے زور پر چھ نکات پر مبنی آئین پاکستان پر ٹھونسنے کی کوشش کرتے ہیں تو ان کا راستہ کون روک سکتا ہے؟ ایسی صورت میں افواج پاکستان کا کردار کیا ہو گا؟ کیا وہ باعزت طریقے سے اقتدار سے الگ ہو کر ملک کی قسمت عوامی لیگ کو سونپ دیں گی؟ اس کا جواب میں ڈھاکہ میں نظر نہیں آتا تھا، البتہ جنرل یحییٰ کے ایک مختصر جنرل..... دسمبر کے آخر میں وہاں پہنچے اور گورنمنٹ ہاؤس میں ایک میمانٹ کے بعد اربابِ حل و عقد کی سوچ سے اتنا پردہ اٹھایا، آپ ٹھکر نہ کریں ہم ان کالے حرامیوں کو اپنے اوپر پر گڑھ حکومت نہیں کرنے دیں گے۔

۱۔ روزنامہ پاکستان آبزور، ڈھاکہ - ۱۲ دسمبر، ۱۹۷۰ء

۲۔ روزنامہ پاکستان آبزور، ڈھاکہ - ۱۰ دسمبر، ۱۹۷۰ء



یہ بات شاید مجیب الرحمن تک بھی پہنچ گئی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ جب انہوں نے حسب وعدہ انتخابات کرانے پر جنرل یحییٰ خاں کا شکریہ ادا کیا وہاں یہ انتباہ کرنا بھی ضروری سمجھا کہ جنرل صاحب کے بعض متحدہ انتخابات کے نتائج کو سبوتاژ کرنے کی کوشش کر رہے ہیں اور اس ٹولے کے بعض سازشی پھیلے دنوں ڈھاکہ آکر خفیہ اجلاس کرتے رہے ہیں، میں صدر کو متنبہ کرتا ہوں کہ وہ ان لوگوں کو لگام دیں، ورنہ انہیں بنگلہ دیش کے لوگوں کی لائٹھیوں کا سامنا کرنا پڑے گا۔

البتہ محاذ آرائی کے حقیقی عناصر کہیں اور تھے جن کا ذکر اگلے باب میں آئے گا۔

لے پاکستان آہر روز ڈھاکہ۔ ۲۴ جنوری ۱۹۷۱ء



لاڑکانہ پلان

عوامی لیگ نے مشرقی پاکستان میں ۱۹۶۲ میں سے ۱۹۶۰ نشستیں جیت کر زبردست معرکہ مارا، مگر مغربی پاکستان میں ایک سیٹ بھی حاصل نہ کر سکی۔ اسی طرح ذوالفقار علی بھٹو کی پاکستان پیپلز پارٹی نے مغربی پاکستان میں ۱۳۸ میں سے ۸۱ نشستیں جیت کر پورے مغربی بازو میں اکثریت حاصل کر لی مگر مشرقی بازو میں ایک امیدوار بھی کھڑا نہ کر سکی۔ اس سے ایک دلچسپ، گمنازک صورت حال پیدا ہو گئی۔

میں پہلے باب میں الیکشن کے فوڈ ایجنٹ شیخ مجیب الرحمن اور ان کے رفقاء کے سخت رویے کا ذکر کر چکا ہوں۔ جہاں تک بھٹو کا تعلق ہے وہ بھی پنجاب اور سندھ میں اپنی جیت سے خوب پھولے بیٹھے تھے۔ ۲۰ دسمبر کو انہوں نے لاہور میں کہا: میری جماعت کے تعاون کے بغیر نہ تو کوئی دستور بنایا جاسکتا ہے اور نہ مرکز میں کوئی حکومت چلائی جاسکتی ہے۔ انہوں نے یہ بھی کہا کہ پنجاب اور سندھ طاقت کے سرچشمے ہیں جن میں ان کی پارٹی کو اکثریت حاصل ہے اس لیے مرکز میں قائم ہونے والی کسی بھی حکومت کے لیے ان کا تعاون حاصل کرنا ضروری ہوگا۔ انہوں نے لوگوں کو یقین دلایا کہ پی پی پی اپنے اغراض و مقاصد سے سربمواخراہ نہیں کرے گی اور وہ اگر برسرِ اقتدار آئی۔ اور جب بھی آئی۔ اپنے پروگرام کی ایک ایک شق کو عملی جامہ پہنائے گی۔

ڈھاکہ میں عوامی لیگ کے جنرل سیکرٹری مشرانج الدین نے مشر بھٹو کے اس بیان کا تڑکی بڑکی جواب دیا۔ انہوں نے کہا کہ عوامی لیگ ملک کا دستور بنانے اور مرکز میں حکومت چلانے کی پوری صلاحیت رکھتی ہے۔ ہم کسی دوسری پارٹی کے تعاون سے۔ اور اس کے بغیر بھی۔ یہ کام انجام دے سکتے ہیں۔ پنجاب اور سندھ اب طاقت کا سرچشمہ ہونے کا دعویٰ نہیں کر سکتے۔ اگر ہم بہتر مستقبل کے خواہشمند ہیں تو ہمیں اس قسم کے دعوؤں سے احتراز کرنا چاہیے کیونکہ اس سے غیر ضروری اور نقصان دہ بحث چھڑ سکتی ہے۔

دونوں ضوبوں کے درمیان یہ ٹوٹوٹوٹو میں یقیناً تشویش کا باعث تھی۔ میں نے اس پر بہت سے نوجوان فوجی افسروں کو بھی متفکر دیکھا، حالانکہ وہ سیاسی الجھاؤ سے عموماً دور ہی رہتے ہیں۔ ان میں سے وہ جوانوں و نوجوانوں کو اپنی آرزوؤں کا منظر سمجھتے تھے، اکثر کہتے: یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ ایک صورت سائے ملک پر سواری کرنے لگے؟ اس کے برعکس دوسرے لوگ جو مقامی حالات کا پورا پورا ادراک رکھتے تھے، کہتے: ہم گزشتہ ۲۳ برسوں سے بنگالیوں پر سواری کر رہے ہیں۔ اب ان کی باری ہے۔ یہ کوئی ضروری نہیں کہ ہم ہمیشہ ان پر کاٹھی ڈالے رکھیں۔ یہ احساسات و جذبات جن میں میں بھی سانس لے رہا تھا، اس سطح سے کہیں نیچے تھے جہاں ملک کی قسمت کے فیصلے ہوتے ہیں۔

۱۔ پاکستان آئین روز ڈھاکہ۔ ۲۱ دسمبر ۱۹۶۰ء

۲۔ پاکستان آئین روز ڈھاکہ۔ ۲۲ دسمبر ۱۹۶۰ء



اور اونچی سطحیں عموماً برف پوش رہتی ہیں۔ ان دنوں بھی اونچی سطح پر برف پڑی ہوئی تھی اور مصالحت کی طرف کوئی پیش قدمی نہیں ہوئی تھی؛ البتہ ۱۹۷۱ء کے ابتدا میں برف پگھلنے کی ایک صورت پیدا ہوئی۔ دونوں صوبوں میں راہ درسم کی کچھ ابتدا ہوئی۔ ذوالفقار علی بھٹو نے عوامی لیگ سے مذاکرات کی خواہش ظاہر کی اور اس کے لیے راہ ہموار کرنے کی غرض سے اپنا خصوصی ایچی ڈھاکہ بھیجا۔ ایچی کی روانگی سے چند روز قبل ضنا کو خوشگوار بنانے کے لیے مسٹر بھٹو نے کہا، ہم مشرقی پاکستان کی اکثریت کا خیر مقدم کرتے ہیں، ہمیں ان پر اعتماد ہے۔

مجیب الرحمن نے بھی اس پیش قدمی پر خوشگوار رد عمل کا اظہار کیا۔ انہوں نے ۳۰ دسمبر کو ڈھاکہ کے ایک عظیم اجتماع میں اعلان کیا، آسلی میں اکثریت رکھنے کے باوجود میں یہ نہیں کتا کہ دستور سازی کے مرحلے میں ہمیں مغربی پاکستان کے تعاون کی ضرورت نہیں۔ ہمیں یقیناً ان کا تعاون چاہیے۔

اب حالات کچھ درست سمت میں چلتے نظر آنے لگے۔ یچی خاں کے ایک حواری نے چپکے چپکے یہ بات پھیلائی کہ یہ سب صدی بچی کا کرشمہ ہے جو اب محض ریفرمی ہونے کے علاوہ ایک اہم اور بااثر کھلاڑی کا کردار بھی ادا کر رہے ہیں۔ ہمیں اس سے سروکار نہ تھا کہ اس مظاہمت کا سراجزل یچی خاں کے سر بند تھا ہے یا کسی اور کے، ہمیں اس بات سے دلچسپی تھی کہ دونوں صوبوں کے درمیان یہ خطرناک محاذ آرائی کسی صورت تل جائے۔

پھر اچانک ۳ جنوری ۱۹۷۱ء کو امیدوں کا یہ عمل گرنا نظر آنے لگا۔ عوامی لیگ نے قومی اور صوبائی آسلی کے تمام اراکین کو (جن کی تعداد ۱۱۱ بنتی تھی) ڈھاکہ میں جمع کیا اور سر عام ان سے چھ نکات سے وفاداری کا حلف لیا، اس حلف میں انہوں نے اقرار کیا کہ:

— خداوند رحیم و قدیر کے نام پر

— ان شیدوں اور مجاہدوں کے نام پر جنہوں نے جبر کے ہاتھوں مظالم سے اور جان کی قربانیاں دیں۔

— ان کسٹوں، مزدوروں، طالب علموں، محنت کش عوام اور ہر طبقے کے لوگوں کے نام پر۔

ہم نومنتخب اراکین کے نام سے اس بات کا حلف اٹھاتے ہیں کہ ہم چھ نکات اور گیارہ نکات کے وفادار رہیں گے، کیونکہ یہ نکات عوام کی امنگوں کے منظر ہیں۔

یہ اعلان پڑھ کر ایسا نظر آتا تھا کہ ہم جہاں سے چلے تھے پھر لوٹ کر وہیں آگئے ہیں۔ میرا ذاتی تاثر یہ تھا کہ عوامی لیگ نے یہ حلف لے کر اہم تفہیم کے راستے سدود کر دیے ہیں۔ چند روز بعد مجھے ایک سینئر صحافی، علامہ مجیب الرحمن کے بہت قریب تھا۔ میں نے اس سے عرض کیا، سال بھر کی انتخابی مہم میں جذبات کا پارہ بہت چڑھ چکا ہے۔ آسلی کا اجلاس ہونے میں کچھ وقت باقی ہے، کیوں نہ اس درمیان عرصے کو بھرکتے ہوئے جذبات ٹھنڈے کرنے کے لیے استعمال کیا جائے تاکہ جب آئین سازی کا مرحلہ آئے تو لوگ جذباتیت میں نہیں کر رہے جائیں۔ اس نے کہا، شیخ صاحب لوگوں کے جذبات کو ٹھنڈا نہیں ہونے دیں گے۔ آپ کے پاس تو ہیں اور ٹینک ہیں اور ان کے پاس یہی عوام کے جذبات ہیں۔

حلف والی تقریب کے اگلے روز ایسٹ پاکستان اسٹوڈنٹس لیگ نے اپنا تیسواں یوم تاسیس منایا۔ ایک بھر پور جلسہ بھی کیا جس میں

۱۹۷۰ء دسمبر ۲۸ - کراچی

۱۹۷۰ء دسمبر ۳۱ - پاکستان آبز روز ڈھاکہ



انہوں نے مجیب الرحمن سے بڑھ چڑھ کر اپنی منزل پانے کے لیے بے قراری کا اظہار کیا۔ بعض طالب علم رہنما مجیب کے گھر بھی گئے اور جلد از جلد اقدامات کرنے کے لیے ان پر زور دیا۔ مجیب الرحمن نے انہیں یہ کہہ کر واپس بھیج دیا، ضرورت پڑنے پر میں خود تمہیں انقلاب برپا کرنے کی دعوت دوں گا، مگر تب تک صبر سے کام لیجیے۔

بگڑتے حالات کو اگر کوئی شخص سنبھالا دے سکتا تھا، تو وہ جنرل یحییٰ خاں تھے۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں توفیق اور ان کی مصروفیات نے انہیں مہلت دی، تو وہ ۱۲ جنوری ۱۹۷۱ء کو برہنہ نفسی ڈھاکہ تشریف لے گئے اور پہلی بار سنجیدگی سے چھ نکات کو سمجھنے کی کوشش کی۔ ایوان صدر میں مجیب الرحمن اور ان کے نصف درجن رفقاء کو طلب کیا گیا۔ اس میٹنگ کے لیے صدر مملکت کے دست راست اور پرنسپل اسٹاف انسٹریٹ جنرل ایس جی ایم پیرزادہ نے گورنر احسن کو بھی بلایا، حالانکہ ماضی میں انہیں مشرقی پاکستان سے متعلق اہم فیصلوں میں ہمیشہ نظر انداز کیا جاتا رہا۔ اگرچہ وہ آزدگی سے آئے، مگر آگے۔ ان کا خیال تھا اب چھ نکات کو سمجھنے کا وقت گزر چکا ہے۔ اگر یہ مشق کرنی ہی تھی تو الیکشن سے بہت پہلے کرنی چاہیے تھی، اب اس سے کوئی فائدہ نہ ہوگا۔

جنرل یحییٰ جنرل پیرزادہ اور ایڈمرل احسن میز کے ایک طرف بیٹھے اور مجیب، خوند کر مشاق احمد تاج الدین اور ان کے ساتھی میز کی دوسری جانب۔ عوامی بیگ کی طرف سے زیادہ تر گفتگو مجیب الرحمن نے کی۔ وہ ایک ایک نکتہ لیکر چھ نکات کی وضاحت کرتے گئے۔ ہر نکتے کی تشریح کے بعد کہتے: دیکھا آپ نے اس میں کوئی بات بھی تو قابل اعتراض نہیں ہے... اس میں جلا کون سی قباحت ہے... دیکھیے کتنی صاف اور سادہ سی بات ہے... وغیرہ۔ جنرل یحییٰ خاں اور ان کے معاون خاموشی سے سنتے رہے۔ ایک دوسرے جنرل پیرزادہ نے کوئی نکتہ اٹھایا جس کی مجیب نے نہایت تحمل اور شائستگی سے وضاحت کر کے ان کی تشفی کر دی۔ آخر میں جنرل یحییٰ خاں نے کہا: میرے لیے آپ کے چھ نکات قابل قبول ہیں، مگر مغربی پاکستان میں ان کے خلاف شدید رد عمل پایا جاتا ہے، آپ کو چاہیے وہاں کے لوگوں کو بھی ساتھ لے کر چلیں؟ اس پر مجیب الرحمن نے فوراً کہا: بے شک! بے شک! ہم مغربی پاکستان کو ساتھ لے کر چلیں گے۔ ہم ان سے مشورہ کریں گے ہم دستور بنائیں گے۔ ہم چھ نکات کو اس دستور کی اساس بنائیں گے۔ ہم اس دستور کی ایک نقل آپ کو بھی دکھائیں گے۔ آپ فکر نہ کریں اس میں کوئی غلط بات نہ ہوگی۔ اس اثنا میں جنرل یحییٰ خاں خاموشی سے اپنی بھاری بھوڑوں کو سیکڑتے اور بدیشی سگریٹوں کے کش لگاتے رہے۔

اس باقاعدہ کارروائی کے علاوہ بھی جنرل یحییٰ اور شیخ مجیب الرحمن کی ملاقات ہوئی، جس کا احوال پروفیسر جی۔ ڈبلیو چودھری کی کتاب سے ملتا ہے۔ وہ وزیر مواصلات تھے اور یحییٰ خاں کے ساتھ ڈھاکہ تشریف لے گئے تھے۔ ان کا کہنا ہے کہ اس ملاقات کے بعد جنرل یحییٰ بہت آزرہ تھے، انہوں نے یہ ملاقات ختم ہوتے ہی مجھے ایوان صدر بلوایا اور کہا: مجیب نے مجھ سے بد عہدی کی ہے، جو لوگ مجھے اس سے محتاط رہنے کی تلقین کرتے تھے، وہ سچے تھے۔ میں نے اس شخص پر اعتماد کر کے غلطی کی، میں نے ان سے خاص طور پر پوچھا کہ آپ نے مجیب کو اس کا وہ وعدہ نہیں یاد دلایا جو اس نے انتخابات سے پہلے آپ سے کیا تھا۔ اس کا جواب دیتے وقت جنرل یحییٰ کے لمبے میں دروندی تھی۔ یوں محسوس ہوتا تھا کہ ان کے گلے میں پھانس لپک رہی ہے۔ انہوں نے کہا: میں اور آپ سیاست دان نہیں ہیں میرے

۱۹۷۱ء - ۵ جنوری

LAST DAYS OF UNITED PAKISTAN متحدہ پاکستان کے آخری ایام



یہ ان کے انداز فکر کو بھنا شکل ہے، اب تو ہم بہتر دلوں کی توقع کرنے ہی پر قناعت کر سکتے ہیں۔

جنرل یحییٰ خاں اس ذہنی تلاطم میں ۱۴ جنوری کو ڈھاکہ سے روانہ ہوئے۔ روانگی سے قبل ایئرپورٹ پر صحافیوں نے انہیں گھیر لیا۔ میں بھی وہاں موجود تھا۔ جنرل یحییٰ خاں زیادہ پُر امید نظر نہیں آتے تھے، لیکن ان کے کسی جواب تبصرے یا اشارے سے ان کے آئندہ عزائم کی جھلک دکھائی نہیں دیتی تھی۔ وہ یہ تاثر دینے کی کوشش کر رہے تھے کہ مستقبل کا انحصار مجیب الرحمن کے فیصلوں پر ہے۔ ایک سوال کے جواب میں انہوں نے فرمایا: "ان (مجیب) سے پوچھو، وہ ملک کے آئندہ وزیر اعظم ہیں... جب وہ ملک کی باگ ڈور سنبھالیں گے تو میں یہاں نہیں ہوں گا۔"

جنرل یحییٰ خاں کی روانگی کے بعد ایک بنگالی اخبار نویس نے مجھ سے کہا کہ صدر کے بیان میں کلیدی جملہ یہ تھا کہ... "تو میں یہاں نہیں ہوں گا۔" اس صحافی کے مطابق عوامی لیگ نے جمہوری نظام میں یحییٰ خاں کو صدر بنانے سے انکار کر دیا تھا تا آنکہ وہ عوامی لیگ کے آئینی مسودے کی تصدیق پر تیار نہیں ہوتے۔

جنرل یحییٰ خاں ایک دن کراچی میں سستانے کے بعد سیدھے لاڑکانہ نیچے جہاں ذوالفقار علی کے مہمان بنے۔ بھٹو، یحییٰ خاں کے دورہ ڈھاکہ پر کڑی نظر رکھے ہوئے تھے۔ وہ کسی ایسی مصالحت کے حامی نہ تھے جس میں انہیں اور ان کی پارٹی کو نظر انداز کیا گیا ہو۔ بھٹو نے یحییٰ خاں اور ان کے ساتھیوں کی بڑی آؤ بھگت کی۔ مرغابی کا شکار کھلایا۔ اس مہمان نوازی میں چیف آف اسٹاف (آرمی) جنرل عبدالحمید بھی شامل ہوئے۔ ان کی موجودگی نے ڈھاکہ میں یک لخت شکوک و شبہات پیدا کر دیے۔ عوامی لیگ نے یہ تاثر پھیلانا شروع کر دیا کہ مجیب نے یحییٰ خاں سے جو سخت رویہ اختیار کیا ہے، اسے اس کی سزا دینے کے لیے لاڑکانہ میں سازش کی جا رہی ہے اور ظاہر ہے کہ کوئی سازش (بقول عوامی لیگ) اس وقت تک کامیاب نہیں ہو سکتی جب تک اسے فوج کی اشر باد حاصل نہ ہو۔

انہی دنوں ڈھاکہ کے اخبارات میں صفحہ اول پر ایک تصویر چھپی جس میں جنرل یحییٰ خاں اور مشر بھٹو کو المرتضیٰ کے وسیع اور خوبصورت سبزہ زار میں چہل قدمی کرتے دکھایا گیا تھا۔ اس تصویر نے ڈھاکہ میں پیدا ہونے والے شبہات کو تقویت بخشی۔ اکثر بنگالیوں نے اس سے تاثر لیا کہ بھٹو اور یحییٰ کی دوستی اور بنگالیت مشرقی پاکستان کے لیے اچھی علامت نہیں۔ ایک بنگالی دوست نے مجھ سے کہا: "ذرا اس (یحییٰ) کو دیکھو، جب یہاں آتا ہے تو اپنے کسی اشارے کے ذریعے (اکثر ترقی پارٹی کے سربراہ) مجیب الرحمن کو ایوان صدر میں طلب کرتا ہے اور جب وہاں جاتا ہے تو (قلیتی پارٹی کے سربراہ) بھٹو کے پاس ٹھہرتا ہے۔ کیا فوج، جمہوریت کے لیے یہی جذبہ احترام رکھتی ہے؟"

لاڑکانہ کی ملاقات کے متعلق کئی بائیں سٹنٹ میں آئیں۔ کسی نے کہا کہ وہاں بھٹو اور یحییٰ خاں کے درمیان باہمی تعاون کا خفیہ سمجھوتہ طے پایا ہے۔ کسی نے کہا کہ یحییٰ خاں نے صدر کی کرسی سے چمٹے رہنے کے لیے بھٹو کو استعمال کیا اور کسی نے کہا کہ بھٹو نے مجیب کو راستے سے ہٹانے کے لیے یحییٰ کو آمادہ کیا۔ میں ان خبروں کی تائید یا تصدیق کے قابل نہیں ہوں، کیونکہ یہ واقعات ڈھاکہ سے ہزاروں کلومیٹر دور ہوئے تھے۔ میں ان کا شائبہ نہیں۔ ان واقعات کا ایک ہی ریکارڈ دستیاب ہے جو مشر بھٹو کی لکھی ہوئی کتاب "گریٹ ٹریجڈی" (عظیم المیہ) میں ہے اس میں وہ لکھتے ہیں: (صفحہ ۲۰)

صدر نے مجیب سے اپنی گفتگو کے بارے میں مجھے آگاہ کیا اور بتایا کہ انہوں نے مجیب سے کہہ دیا ہے کہ اس کے سامنے تین راستے ہیں (۱)

لہ روزنامہ ڈان کراچی - ۱۳ جنوری ۱۹۷۱ء



وہ تنہا اپنی مرضی سے چلے (۲) پی پی پی سے تعاون کرے (۳) پی پی پی کو نظر انداز کر کے مغربی پاکستان کی چھوٹی چھوٹی شکست خوردہ پارٹیوں کی حمایت حاصل کرے۔ اس ضمن میں صدر نے اپنی ذاتی رائے کا اظہار کرتے ہوئے فرمایا کہ وہ ملک کی دونوں اکثریتی پارٹیوں میں مفاہمت کو ترجیح دیں گے۔ جہاں تک ہمارا تعلق ہے ہم نے صدر کو چھ نکات کے مضمرات سے آگاہ کیا اور ان کے بارے میں اپنے شکوک و شبہات کا اظہار کیا، تاہم ہم نے انہیں یقین دلایا کہ ہم کوئی قابل عمل راستہ تلاش کرنے کی پوری کوشش کریں گے اور عنقریب ڈھاکہ جا کر عوامی لیگ سے بات چیت کریں گے!

لاڑکانہ میں مرغابیوں کا شکار کھیلنے کے بعد صدر اور ان کے ساتھی راولپنڈی سدھائے اور چند روز بعد (۲۶ جنوری) مسٹر بھٹو اپنے رفقاء سمیت ڈھاکہ چلے گئے۔ ان کے پہنچنے سے پہلے لاڑکانہ سازش کے میسج سائے ڈھاکہ پہنچ چکے تھے۔ مجھ جیسے افراد جن کا تعلق براہ راست عوامی لیگ سے تھا پی پی پی سے، یہ سمجھتے تھے کہ اگر مسٹر بھٹو یحییٰ خاں کی میزبانی کا شرف حاصل کیے بغیر ڈھاکہ تشریف لے جاتے تو فضا اتنی مکدر نہ ہوتی۔ اس میزبانی کے جوازاٹ ڈھاکہ میں مرتب ہوئے تھے ان کا یا تو مسٹر بھٹو کو علم نہ تھا یا وہ جان بوجھ کر ایسی فضا قائم کرنا چاہتے تھے جس میں افہام و تفہیم کے بجائے شکوک و شبہات کو زیادہ دخل حاصل ہو۔

میرے ایک بنگالی دوست کا کہنا ہے کہ بھٹو کی آمد کو قابل قبول بنانے کے لیے عوامی لیگ کو بہت محنت کرنا پڑی۔ اس کی انتظامی کمیٹی کے بعض ارکان اس دورے کے سراسر مخالف تھے؛ البتہ کچھ ایسے بھی تھے جو سمجھتے تھے کہ اگر یحییٰ خاں ان کی بات نہیں مانتا تو انہیں بھٹو کا تعاون حاصل کرنا چاہیے تاکہ دونوں اکثریتی پارٹیوں کے متفقہ مطالبے کو جنرل یحییٰ خاں نظر انداز نہ کر سکے۔ اس ضمن میں غور طلب بات یہ تھی کہ عوامی لیگ کی عذارانہ شہرت کے باوجود اگر مسٹر بھٹو نے اس سے تعاون کیا، تو مغربی پاکستان میں ان کی کیا حیثیت رہ جائے گی۔

ان حالات میں مسٹر بھٹو اور ان کے رفقاء ڈھاکہ پہنچے۔ انہوں نے عوامی لیگ کی قیادت سے ملاقات کی جس کی تفصیلات صیغہ راز میں رکھی گئیں۔ اس کی زوداد بعد میں عوامی لیگ کے ایک ترجمان مسٹر رحمن سبحان کی زبانی ملتی ہے، وہ ایک غیر ملکی انگریزی جہدے میں لکھتے ہیں، "مسٹر بھٹو جنوری کے آخری ہفتے میں ڈھاکہ آئے۔ انہوں نے پہلے حبیب الرحمن سے ملاقات کی اور پھر دونوں پارٹیوں کے آئینی ماہرین نے آپس میں مذاکرات کیے۔ گفتگو جوں جوں آگے بڑھتی رہی یہ بات واضح ہوتی گئی کہ پی پی پی نے ابھی تک کوئی دستوری خاکہ تیار نہیں کیا۔ وہ بھی سردست یحییٰ خاں کی طرح چھ نکات کے مضمرات کو سمجھنے کی کوشش کر رہی ہے۔ اس صورت حال میں مذاکرات کا جاری رہنا لامحالہ تھا، کیونکہ مذاکرات کی غایت یہ ہوتی ہے کہ دو متبادل مجبوزہ تجاویز کو سامنے رکھ کر ان میں مفاہمت کی صورت تلاش کی جائے۔"

یہ زوداد مذاکرات کے کوئی چھ ماہ بعد منظر عام پر آئی، مگر عوامی لیگ کے ذرائع سے ایک تبصرہ جو فوری طور پر مجھے دستیاب ہوا یہ تھا کہ مسٹر بھٹو نے دستوری مسائل میں کوئی دلچسپی نہ لی۔ وہ تمام وقت اقتدار میں شرکت اور قلمدانوں کی تقسیم پر بات کرتے رہے۔ معلوم ہوتا ہے ان کے پیش نظر اقتدار کے سوا کوئی چیز نہیں۔

پروفیسر جی۔ ڈیوٹیو چودھری (جن کا ذکر اوپر آیا ہے) اس بارے میں مزید معلومات فراہم کرتے ہوئے لکھتے ہیں،

"مسٹر بھٹو اپنے ساتھیوں سمیت ۲۶ جنوری کو ڈھاکہ پہنچے۔ میں بھی مذاکرات کے رُخ کا جائزہ لینے کے لیے ڈھاکہ میں موجود تھا۔ بات چیت تین روز جاری رہی، مگر عوامی لیگ کی جہدے سے آگے نہ بڑھ سکی۔ مختلف ذرائع سے ملنے والی اطلاعات سے پتہ چلتا ہے کہ حبیب نے بھٹو سے صاف

صاف کہہ دیا تھا کہ ہم چند نکات میں کسی قسم کی ترمیم نہیں کریں گے۔ جو اب اسٹریٹجی نے بھی اتنی ہی صفائی سے بتا دیا تھا کہ ہم ملحدگی کی اس درپردہ ایکم کو کبھی تسلیم نہیں کریں گے۔

اسی دنوں ڈھاکہ میں ہم نے یہ سنا کہ بھٹو نے پھر میں سے ساڑھے پانچ نکات منظور کر لیے ہیں۔ صرف آدھے نکتے پر اتفاق رائے باقی ہے۔ عوامی لیگ کے حلقوں نے مجھے بتایا کہ درحقیقت انہوں نے سائے نکات مان لیے تھے، مگر انہوں نے ان کے لیے مغربی پاکستان میں رائے عامہ ہموار کرنے اور دوسرے سیاست دانوں سے بات چیت کرنے کے لیے وقت مانگا تھا۔ عوامی لیگ نے انہیں وقت دینے پر رضامندی ظاہر کر دی تھی۔

اسی شام (۲۹ جنوری) کورات آٹھ بجے کی خبروں میں ریڈیو پاکستان نے اسٹریٹجی کا بیان نشر کیا کہ میں اپنی پارٹی اور مغربی پاکستان کے لیڈروں سے مزید مشورہ کروں گا اور (عوامی لیگ) مذاکرات جاری رکھوں گا۔ پی پی پی کے سربراہ چار روزہ قیام کے بعد ایسے مغربی پاکستان آئے کہ یہاں آکر انہوں نے نقشہ ہی بدل دیا۔ اب ان کی توجہ کامرکز مجیب نہیں بچی خاں تھے جن سے ان کے مفصل مذاکرات لاڈکانہ میں ہو چکے تھے، لیکن قبل اس کے کہ بچی خاں کے ساتھ ان کی ملی جھگڑت کا تذکرہ کیا جائے چند درمیانی کڑیوں کا سلسلہ بھی ملا لیا جائے۔ ڈھاکہ میں اسٹریٹجی کی آمد پر جتنی اُمیدیں بندھی تھیں ۳۰ جنوری کو ان کی روانگی سے نہ صرف ختم ہو گئیں، بلکہ دونوں صوبوں کے درمیان بعد پہلے سے بڑھ چکا تھا۔ اس خلیج کو وسیع تر کرنے میں ہندوستان نے بھی اہم کردار ادا کیا۔ بظاہر دو کشمیری نوجوان ۳۰ جنوری کو ہندوستان کا ایک فوکر طیارہ اغوا کر کے لاہور لے آئے۔ بعد کی عدالتی سماعت سے پتہ چلا کہ یہ تو ہندوستان کی گہری سازش تھی۔ اُس نے اس واقعے کو بہانہ بنا کر ہندوستان کے اوپر سے جانے والی پی پی پی اے کی پروازیں بند کر دیں۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ دونوں صوبوں کے درمیان جو فاصلہ پہلے دو گھنٹوں میں طے ہوتا تھا اب اس کو (براہ راست سری لنکا) چھ گھنٹے لگتے تھے، میرے پاس اس کی کوئی شہادت تو نہیں، مگر میرا تاثر یہ ہے کہ اغوا کی یہ ایکم ہندوستان نے بہت پہلے تیار کی تھی، مگر اس پر عمل درآمد بھٹو اور مجیب کے مذاکرات ناکام ہونے پر کیا۔ میرے اس تاثر کی تصدیق بعد کے حالات سے بھی ہوتی ہے، جب ہندوستان نے کلم کھلا مشرقی پاکستان میں مداخلت شروع کر دی۔

جنوری ۱۷ء کے آخر تک عوامی لیگ کو معلوم ہو گیا تھا کہ وہ کہاں کھڑی ہے اور میرے خیال میں بچی اور بھٹو کو بھی احساس ہو گیا تھا کہ وہ کہاں تک اپنے اعزاز میں کامیاب ہو سکتے ہیں۔ مجیب کا اصرار تھا کہ زیادہ سے زیادہ ۱۵ فروری تک قومی اسمبلی کا اجلاس ہونا چاہیے، جبکہ اسٹریٹجی اسمبلی سے باہر کسی بھوتے کے لیے مزید وقت چاہتے تھے۔ بچی خاں اور ان کے میسر اپنا الگ الگ عمل بنائے بیٹھے تھے۔ سیاسی تکیوں۔ بچی، مجیب، بھٹو۔ روز بروز پیچیدہ ہوتی جا رہی تھی۔ روشنی کی کوئی کرن کہیں نظر نہ آتی تھی۔

اس اتھاہ تاریکی میں میں لیفٹیننٹ جنرل یعقوب علی کی خدمت میں حاضر ہوا اور چنگی بھر بصیرت مانگی۔ انہوں نے فرمایا: میری تربیت سپاہ گری کی ہے، سیاست کی نہیں۔ فوجی نقل و حرکت پر میرا ذہن بہت چلتا ہے، مگر سیاسی چالوں کے متعلق میرے قواد زیادہ حساس نہیں، مثلاً جب ہندوستان کشمیر سے ایک پہاڑی ڈویژن مغربی بنگال میں انتخابات کی نگرانی کے لیے بھیجا ہے تو میں فوراً جانپ جاتا ہوں اس کا اصل مدعا کیا ہے؟ کیا یہ ڈویژن واقعی انتخابات کے لیے آیا ہے یا اس کا مقصد کچھ اور ہے؟ یہ اپنا سارا جنگی سامان ساتھ لایا ہے یا صرف ہلکے ہتھیاروں سے لیس ہے؟ اس کو صوبے کے اندر رکھا گیا ہے یا اس کا منہ سرحدوں کی طرف ہے؟۔ لیکن جب مجیب ازخمن کوئی سیاسی چال چلتا ہے تو کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ وہ کتنا کیا ہے، اُس کا مقصد کیا ہے؟ وہ مجھ سے ایک بات کرتا ہے اور دوسری کو کچھ اور بتاتا ہے، میں نہیں جانتا کہ اس کی کس بات کا اعتبار کروں۔



اسی بوجھل خاموشی میں دس دن گزر گئے۔

پھر یکایک مغربی افق پر کچھ حرکت شروع ہوئی جیسے دس دنوں کی خاموشی اپنا اثر دکھانے لگی۔ اور مختلف واقعات دو دو دن کے مقررہ وقفے کے بعد رونما ہونے لگے جیسے کوئی ٹائم ٹیبل طے کر کے اس کو عملی شکل دی جاتی ہے۔ ۱۱ فروری کو مسٹر بھٹو نے راولپنڈی میں صدر مملکت سے طویل ملاقات کی۔ دو روز بعد حکومت نے اعلان کیا کہ قومی اسمبلی کا اجلاس ۳ مارچ کو ڈھاکہ میں ہوگا۔ دو روز بعد مسٹر بھٹو نے اس اجلاس کا بائیکاٹ کر دیا اور دھمکی دی کہ اگر پی پی پی کو نظر انداز کیا گیا، تو خیبر سے کراچی تک طوفان برپا کر دوں گا۔

بھٹو کے اعلان کے بعد صدر یحییٰ نے کابینہ کو برخواست کر دیا اور ملک پھر مکمل طور پر مارشل لا کی گرفت میں آ گیا۔ دو روز بعد صدر نے فوجی گورنروں اور مارشل لا ایڈمنسٹریٹروں کا اجلاس ۲۲ فروری کو طلب کر لیا۔ مشرقی پاکستان سے لیٹیننٹ جنرل یعقوب اور وائس ایڈمرل احسن کو اس میں شرکت کے لیے مدعو کیا گیا۔

راولپنڈی روانہ ہونے سے دو روز قبل (۱۹ فروری) جنرل یعقوب نے مجھے بلایا اور حالات حاضرہ پر بات کرنا شروع کی (یہ عنایت وہ پہلے بھی مجھ پر کرتے رہتے تھے) انہوں نے اس ملاقات میں دو باتوں کا بالخصوص ذکر کیا۔ ایک کا تعلق بھٹو سے تھا اور دوسری کا یہ تعلق سے۔ مسٹر بھٹو کے بائے میں انہوں نے فرمایا کہ انہوں نے اپنے موقف میں اتنی لچک رکھی ہے کہ اگر صدر یا مجیب ان کو اس بات کا یقین دلا دیں کہ ان کے خیالات کو اہمیت دی جائے گی تو وہ اسمبلی کے اجلاس میں شرکت پر تیار ہو جائیں گے اور صدر کے پاس قانونی ڈھانچہ (ایل ایف او) کے تحت اتنے اختیارات ہیں کہ وہ اپنی بات (مجیب سے) منوا سکیں۔ صدر یحییٰ خاں کے بائے میں انہوں نے اپنی دُور رس نگاہوں سے حالات کا جائزہ لیتے ہوئے فرمایا کہ اگر تعطل جاری رہا اور نتیجہ فوجی کارروائی ناگزیر ہوگئی تو یہ تباہ کن ہوگا۔ یہی خاں طمدگی کے عمل میں تاخیر کرنے کے لیے یہ کارروائی کریں گے، تو اس سے طمدگی کا عمل تیز تر ہو جائے گا۔ انہوں نے اس بات کی وضاحت کرتے ہوئے کہ ہم صرف مفروضوں کی بات کر رہے ہیں، پوچھا کہ اگر حالات ایسا رخ اختیار کر لیں کہ فوجی کارروائی ناگزیر ہو جائے تو تمہارے خیال میں کیا ہونا چاہیے۔ میں نے عرض کیا کہ اگر ایسی صورت حال کا سامنا ہو تو میرے خیال میں کارروائی مختصر اور تیز ہونی چاہیے، سرجن کے نشتر کی طرح اور اس جراحی کے فوراً بعد رنوں کو مندل کرنے کے لیے وسیع پیمانے پر سیاسی اور اقتصادی مرہم پٹی ہونی چاہیے۔

راولپنڈی روانہ ہونے سے قبل جنرل یعقوب اور ایڈمرل احسن شیخ مجیب الرحمن سے ملے۔ شیخ صاحب نے حالات کو کروٹ بدلتے ہوئے دیکھ کر انہیں یقین دلایا کہ چھ نکات میں ترمیم کی جاسکتی ہے۔ یہ رہی ایک اور قلابازی۔ غالباً بدلتے ہوئے حالات کے مطابق اپنا موقف بدلنے ہی کا نام سیاست ہے۔ بیشک اس کام میں مجیب الرحمن بہت طاق تھے۔

راولپنڈی میں اعلیٰ سٹی کانفرس ۲۲ فروری کو منعقد ہوئی۔ اس میں کیا فیصلے ہوئے اور نئے حالات سے نپٹنے کے لیے کیا اسٹریٹیجی وضع کی گئی ابھی تک صیغہ راز میں ہے، البتہ اس کی جو گنج ہم تک ڈھاکہ میں پہنچی وہ یہ تھی کہ مجیب الرحمن کو اپنی نیک نیتی اور حُب الوطنی کا ثبوت دینے کے لیے ایک اور موقع دیا جائے گا اور اگر وہ راہ راست پر نہ آیا، تو مارشل لا اپنے اصل اور روایتی انداز میں (دوبارہ) نافذ کیا جائے گا۔ اجلاس ختم ہونے کے بعد دو دن محاذوں پر فوراً کارروائی کا آغاز کیا گیا۔ سیاسی سطح پر ایڈمرل احسن نے شیخ مجیب سے ابتدائی مذاکرات شروع کیے اور چھ نکات کو مغربی پاکستان کے لیے قابل قبول بنانے کے لیے ان میں ضروری ترمیم پر زور دیا۔ مجیب الرحمن نے ترمیم والی بات تو زمانی، البتہ

۱۹ فروری ۱۹۷۱ء



یہ وعدہ کیا کہ وہ مغربی پاکستان میں چھ نکاتی پروگرام کے نفاذ پر زور نہیں دیں گے۔ شیخ صاحب نے چند روز بعد اس منہوم کا اعلان کر کے اپنا وعدہ پورا کر دیا۔

ہیڈ کوارٹر ایسٹرن کمانڈ میں ایک پلان پہلے سے تیار پڑا تھا جس کا مقصد یہ تھا کہ اگر اندرونی طور پر حالات خراب ہو جائیں تو کیا کارروائی کی جائے گی۔ اس پلان کا نام بلٹز (BLITZ) تھا۔ جنرل یعقوب نے راولپنڈی سے واپسی پر اس پلان کی ٹوک پلک درست کرنے اور اسے تازہ صورت حال سے ہم آہنگ کرنے کے احکامات دیے۔ ان کا اسٹاف فوراً تیل میں لگ گیا۔ اس پلان میں موٹائی سطح پر سنسر شپ لگانے کا منصوبہ بھی تھا جس کی تفصیلات طے کرنے کے لیے مجھے کہا گیا۔ بریگیڈیئر جی نے اس بارے میں مجھے تاکید کیا کہ ایسا لائحہ عمل تیار کرو جس کو اشارہ ملتے ہی نافذ کیا جاسکے۔ اُس وقت سوال جواب کا وقت نہیں ہوگا۔ عرض کیا: اگر اب وقت ہو تو ایک سوال پوچھنے کی جسارت کر سکتا ہوں؟ انہوں نے ازراہ نوازش یہ اہانت عنایت فرمائی تو پوچھا: فدایہ بتا دیجیے کہ اس منصوبے کی بنیاد (PREMISE) کیا ہوگی؟ یعنی کیا نہیں جنگالیوں کو اپنی طرف بھول یا نہ مقابل کی طرف۔ یہ سوال میرے لیے یوں اہم ہے کہ سنسر شپ نافذ کرنے کے لیے سویٹین انفارمیشن افسروں پر انحصار کرنا پڑتا ہے... انہوں نے میری بات کاٹتے ہوئے سختی سے کہا: تم نہیں جانتا یہ تمہارا مسئلہ ہے اس کا حل بھی تم ہی ڈھونڈو!... مگر دیکھنا اس (منصوبے) کو ٹاسپ ہرگز نہ کرانا۔ اپنے ہاتھ سے لکھنا اور میرے حوالے کر دینا۔ آج ہی!

ادھر یہ منصوبہ تیار ہوا اور ادھر مزید فوجی مغربی پاکستان سے پہنچنا شروع ہو گئے۔ ۲۶ فروری سے یکم مارچ تک دو ٹینس (۲۲ بلوچ اور ۱۳ ایف ایف) ہٹی آئی اے سے ڈھا کہ پہنچ گئیں۔ اس اضافی نفری کو بلٹز (BLITZ) میں ضم کرنے کے لیے ڈھا کہ میں مقیم، بریگیڈ کو ذمہ داری سونپی گئی۔ بریگیڈ کمانڈر نے تازہ نفری کو خفیہ رکھنے کے لیے اپنے بنگالی بریگیڈ میجر کو بالکل علیحدہ رکھا تاکہ فضا مزید خراب نہ ہو جائے مگر یہ راز راز نہ رہ سکا، کیونکہ جب ایک جیسی وضع قطع رکھنے والے ہزار ڈیڑھ ہزار افراد طیاروں سے اترے تو ایئر پورٹ پر بنگالی طیاروں کو صاف پتہ چل گیا کہ یہ شلوار قمیص اور جناح کیپ پہنے ہوئے سویٹین درحقیقت فوجی ہیں۔ انہوں نے بات عوامی لیگ تک پہنچائی اور خود ہسپتال کر دی۔ تمام پروازوں کی آمد و رفت پاکستان ایئر فورس کے عملے کو بسٹھانا پڑی۔

عوامی لیگ جو ایک ماہ پہلے فرعون بنی ہوئی تھی، فوجی نفل و حرمت سے سوچ میں پڑ گئی۔ خود عجیب الرحمن نے ہونہار کی تباہی کے امکانات دیکھے تو ہاتھ پیر مارنا شروع کر دیے۔ وہ شاید نفل و غارت کے بجائے پُر امن طریقوں سے اپنے نصب العین تک پہنچنا چاہتے تھے یا شاید ان کے غیر ملکی آقا ابھی جنگ و جدل کے لیے تیار نہ تھے یا خود عوامی لیگ کو مدافعت کی تیاری کے لیے مزید وقت درکار تھا، بہر حال وہ کچھ بھی سہی عجیب الرحمن اور عوامی لیگ میں کھلبلی مچ گئی۔ انہوں نے یحییٰ خاں سے رابطہ قائم کرنے کے لیے سرٹوڈ کو کشمیش شروع کر دیں۔ فروری کے آخر میں ایک بااثر بنگالی روزنامے کے ایڈیٹر نے مجھے فون کیا اور فوراً ملاقات کی خواہش ظاہر کی۔ میں جانتا تھا کہ عوامی لیگ کی اعلیٰ قیادت کے بہت قریب ہے اور اس جلد ملاقات کی وجہ تازہ صورت حال ہی ہو سکتی ہے۔ میں صبح اخبار کے دفتر گیا۔ ایڈیٹر کے پاس دو اور حضرات بیٹھے تھے جن کا مجھ سے تعارف کرایا گیا جو عوامی لیگ کی مجلس عاملہ کے رکن تھے۔ انہوں نے کہا کہ صدر یحییٰ خاں کو فوراً ڈھا کہ آنا چاہیے کیونکہ حالات بڑے نازک ہیں۔ میں نے عرض کیا: مجھے افسوس ہے کہ صدر مملکت کی نفل و حرکت پر مجھے کوئی اختیار حاصل نہیں۔ انہوں نے اصرار سے کہا: نہیں آپ ضرور ہماری بات اُپر پہنچا سکتے ہیں۔ یحییٰ خاں کو فوراً آنا چاہیے! انہوں نے مزید کہا کہ اگر جنرل یحییٰ خاں تشریف لے آئیں تو عوامی لیگ ان کے احترام میں چھ نکات میں ایسی ترمیم کرے گی کہ وہ مغربی پاکستان کے لیے



قابل قبول ہوں گے۔ انہوں نے اس کی وضاحت کرتے ہوئے بتایا کہ بظاہر عوامی لیگ اپنے موقف پر قائم رہے گی، مگر اپنے پروگرام کے ہر نکتے میں ایسی شق کا اضافہ کرے گی کہ اس کا قابل اعتراض حصہ بے معنی ہو کر رہ جائے گا۔ مثلاً:

(الف) بیرونی تجارت صوبائی ذمہ داری ہوگی اور تجارتی وفد متعلقہ صوبے ہی بھیجیں گے اور تجارتی معاہدوں کے لیے غیر ممالک سے مذاکرات بھی وہی کریں گے، لیکن مرکز کی توثیق کے بغیر کوئی معاہدہ نافذ العمل نہیں ہوگا۔

(ب) ایک صوبے کی آمدنی خواہ وہ اندرونی وسائل سے حاصل ہو یا بیرونی ذرائع سے صوبائی ریزرو بنک میں جمع ہوگی، مگر یہ رقم صرف مرکزی رابطہ کمیٹی کی منظوری سے خرچ کی جاسکے گی جس میں تمام صوبوں کو برابر کی نمائندگی حاصل ہوگی۔

(ج) محصولات جمع کرنا صوبائی ذمہ داری ہوگی، لیکن اگر مرکز یہ کام اپنے ذمہ لینا چاہے تو ہمیں کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔

(د) ہم علیحدہ کرنسی یا موجودہ کرنسی کے علیحدہ نظام کے مطالبے پر اصرار نہیں کرتے۔

انہوں نے کہا کہ ہم ان باتوں کو تحریری طور پر دینے کے لیے تیار ہیں۔ جب میں نے پوچھا کہ آپ کی اتھارٹی کیا ہے تو انہوں نے بتایا کہ وہ مجیب الرحمن کی منظوری سے یہ ساری باتیں کہہ رہے ہیں۔

میں نے ان کی بات حکام اعلیٰ تک پہنچانے کا وعدہ کیا، لیکن ساتھ ہی مشورہ دیا کہ اگر مجیب الرحمن اب بھی مغربی پاکستان ہو آئیں تو اس سے یقیناً فائدہ پہنچے گا۔ وضاحت کرتے ہوئے میں نے عرض کیا، میرے پاس کسی کی کوئی اتھارٹی نہیں، لیکن اس ملک کے ایک شہری کی حیثیت سے میں محسوس کرتا ہوں کہ اگر شیخ صاحب مغربی پاکستان کا دورہ کر لیں تو قومی سلامتی کے لیے مفید ہوگا، انہوں نے کہا کہ ہم دوپہر کے کھانے پر شیخ صاحب سے بات کریں گے اور پچھلے پیر آپ کو ان کے رد عمل سے آگاہ کریں گے۔

سہ پہر کو پھر اسی دفتر میں ملاقات ہوئی۔ انہوں نے کہا کہ مجیب الرحمن سے بات ہوتی ہے، مگر وہ کہتے ہیں کہ حال ہی میں ایڈمرل احسن سے ان کی دوہین مفصل ملاقاتیں ہوئی ہیں، انہوں نے ایسا کوئی اشارہ نہیں کیا جس سے ظاہر ہوتا ہو کہ صدر مملکت راولپنڈی میں میری موجودگی ضروری سمجھتے ہیں۔ میں ایک دو روز میں منتقل ہونے والی پارٹی کنونشن کے سلسلے میں بے حد مصروف ہوں جب تک یہ معلوم نہ ہو کہ واقعی کوئی تازہ صورت حال پیدا ہوئی ہے جس پر گفتگو کرنا ضروری ہے، میں یہاں سے نہیں نکل سکتا۔

شام کو جنرل یعقوب سے میری ملاقات ہوئی، تو میں نے انہیں عوامی لیگ کی خواہش سے حسب وعدہ آگاہ کیا۔ انہوں نے مجھے ایک طویل تار کی نقل دکھائی جو انہوں نے صدر مملکت کو اسی روز بھیجا تھا اور انہیں جلد از جلد ڈھاکہ پہنچنے کا مشورہ دیا تھا۔ اس سے اندازہ ہوا کہ عوامی لیگ مختلف ذرائع سے وہی بات اوپر پہنچا چکی تھی۔

ہم اُمید و بیم کی حالت میں صدر کی آمد کا انتظار کرنے لگے، کیونکہ ہم سمجھتے تھے کہ اب بھی صورت حال کو سنبھالا جاسکتا ہے۔ سُننے میں آیا کہ صدر یحییٰ خاں تشریف لا رہے ہیں، بعض جو نیر افسران کی آمد سے متعلق حفاظتی اقدامات کی جزئیات طے کرنے لگ گئے تاکہ اگر وہ غیر مصدقہ اطلاعات کے مطابق اپنا ملک آن ہی اُتریں تو روایتی انتظامات میں کوئی کسر نہ رہ جائے۔

صدر مملکت تو تشریف نہ لائے، لیکن ان کی جگہ ایک اور شخص ڈھاکہ میں نازل ہوئی۔ جیلا بوجیے تو وہ کیا تھی؟



مجیب کی حکمرانی

۲۸ فروری کو یہ منحوس خبر ڈھاکہ پہنچی کہ ۳ مارچ کو ہونے والا اسمبلی کا اجلاس ملتوی کرنے کا فیصلہ کر لیا گیا ہے۔ راولپنڈی سے یہ خبر دیے والے صدیق رحیمی خاں کے پرنسپل اسٹاف آفیسر لیفٹیننٹ جنرل ایس جی ایم پیرزادہ تھے۔ انہوں نے اس کا جواز یہ پیش کیا کہ اس سے اسمبلی سے باہر کسی آئینی مجھوتے کے لیے سیاسی جماعتوں کو مزید وقت مل جائے گا۔ یہ فیصلہ ابھی خفیہ تھا۔ گورنر احسن کو قبل از وقت اعتماد میں اس لیے لیا گیا کہ وہ مجیب الرحمن کو اس سے آگاہ کریں اور ان کے ممکنہ ردِ عمل سے راولپنڈی کو مطلع فرمائیں؛ چنانچہ اسی شام مجیب کو گورنمنٹ ہاؤس طلب کیا گیا اور ایڈمرل احسن نے طویل تمہید کے بعد یہ خبر انہیں سنائی۔ تمہید کا مقصد ان کے ردِ عمل کی متوقع شدت کو کم کرنا تھا مگر تعجب کی بات ہے کہ احسن نے بات کہی اور مجیب نے سن لی۔ وہ ذرا بھی برا لگینے نہ ہوئے۔ انہوں نے صرف اتنا کہا اور وہ بھی نہایت معقولیت سے کہ میں التوا کو بہانہ بنا کر شور نہیں مچاؤں گا، البتہ اتنا ضرور کہوں گا کہ اگر التوا کے ساتھ ساتھ اجلاس کی نئی تاریخ کا بھی اعلان ہو جائے تو مجھے جماعت کے انتہا پسند عناصر کو کنٹرول کرنے میں سہولت ہوگی۔ اگر آئندہ تاریخ مارچ میں ہی ہو تو آسانی رہے گی۔ اگر اپریل میں ہو تو مشکلات پیدا ہو جائیں گی اور اگر اپریل کے بھی بعد ہو تو میرے لیے حالات پر قابو رکھنا ناممکن ہو جائے گا۔

مجیب الرحمن یہ ردِ عمل بنا کر چلنے لگے تو میجر جنرل راؤ فرمان علی سے کہہ گئے: ”آپ مجھے گرفتاریوں نہیں کر لیتے؟ آپ صرف ایک بار مجھے ٹیلیفون کر دیجیے اور میں حاضر ہو جاؤں گا۔“ مجیب نے اپنی امکانی گرفتاری کا اندازہ کرنے کے لیے خوب دانہ بھینکا، مگر جنرل فرمان خاموش رہے۔

تھوڑی دیر بعد مجیب کی گفتگو کا ٹپ لباب راولپنڈی پہنچا دیا گیا اور مجیب کی تجویز پہنچانے کے علاوہ یہ سفارش بھی کی گئی کہ التوا کے اعلان کے ساتھ نئی تاریخ کا اعلان ضرور کیا جائے۔ راولپنڈی سے جواب ملا: ”آپ کا پیغام پوری طرح سمجھ لیا گیا ہے؛ اس مختصر جواب کی ڈھاکہ میں یہ توضیح کی گئی کہ راولپنڈی نے تجویز کو شرفِ قبولیت بخش دیا ہے؛ چنانچہ بڑے پُر امید انداز میں اگلے روز کے اعلان کا انتظار ہونے لگا۔ یہ اعلان مشرقی پاکستان کے وقت کے مطابق یکم مارچ کو ایک بج کر پانچ منٹ پر نشر ہوا۔ ہم اس کی اہمیت کے پیش نظر ریڈیو سیٹوں سے کان لگائے بیٹھے تھے۔ میں عام ریڈیو سیٹ سے ہٹ کر خصوصی شعبے (MONITORING SECTION) میں چلا گیا تاکہ نشر لے کا کوئی لفظ شور کی نذر نہ ہو جائے۔ مختصر سا اعلان تھا، چند منٹوں میں ختم ہو گیا، مگر سارے فسانے میں اُس بات کا ذکر نہ تھا جس کا ہمیں بیانی سے انتظار تھا۔ نئی تاریخ کا ذکر سن



کر میری آنکھوں کے سامنے وحشت ننگ مناظر ناچنے لگے۔

اعلان میں ایک اور قابل غور بات یہ تھی کہ صدر کی آواز جو کئی غیر اہم موقعوں پر ہماری سماعت کا بار بار امتحان لے چکی تھی آج سُنانی نہ دی۔ ریڈیو کے کسی کارندے نے قوم کی قسمت کا یہ پروانہ کاغذ سے اٹھا کر ہوا میں بکھیر دیا۔ لیکن کیوں؟ کیا اس کا مطلب یہ تھا کہ صدر یحییٰ کی مرضی کے خلاف یا اُن کی اجازت کے بغیر ان کے ”انتہا پسند“ (HAWKS) جرنیلوں نے یہ اعلان نشر کروا دیا تھا؟ پروفیسر جی۔ ڈبلیو چودھری نے جن کا اوپر ذکر آچکا ہے، اس بارے میں یہ پُر معنی فقرہ لکھا ہے کہ ”یحییٰ خاں نے تو اس اعلان پر محض دستخط کیے تھے؛ اگر یہ جملہ تاریخی لحاظ سے درست ہے تو پھر سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس کا اصل مصنف کون تھا؟ بعض لوگوں نے اس کا الزام بھٹو پر دھرا ہے اور بعض نے بھٹو کے حامی جرنیلوں پر۔ اصل چہروں سے پردہ اٹھانا بھی باقی ہے۔“

میں اس منظر سے ہزار میل دور ہونے کی وجہ سے اصل ”جرموں“ کی نشاندہی کرنے سے قاصر ہوں؛ البتہ سقوطِ ڈھاکہ کی پیچیدہ لڑائیوں کو ملاتے وقت جب التوا کے بارے میں اس نکتے کے متعلق میں نے بعد میں جنرل الف سے پوچھا تو انہوں نے صرف اتنا بتایا کہ ”اُن دنوں صدر کراچی میں تھے ہم سب سبھی منزل میں تھے اور وہ اوپر۔ میجر جنرل ”ح“ اور میجر جنرل ”ع“ (جو بھٹو کے ذاتی دوست تھے) بار بار سیڑھیاں چڑھ اتر رہے تھے۔ انہوں نے اوپر جا کر حالات کا ایسا نقشہ کھینچا کہ صدر کو پہلے سے تیار کردہ سوڈے پر دستخط کرنے پڑے؛ کیا اس وضاحت کو جنرل یحییٰ خاں کی مصیبت کا ناقابلِ الصحت ثبوت مان لیا جائے؟ میرے خیال میں مستقبل کے مؤرخ کو یہ نازک گنتھی سلجھانے کے لیے بڑی محنت کرنا ہوگی۔

اگر یحییٰ خاں پر اپنے ”انتہا پسند“ (HAWK) جرنیلوں کا زور تھا، مجیب پر اپنے ”انتہا پسند“ فرقائے کار کا دباؤ تھا اور بھٹو مغربی پاکستان کی رائے عامہ کا غلام تھا۔ تو ان تینوں میں سے کون تھا جو صحیح معنوں میں لیڈر کہلانے کا مستحق تھا۔ میرے خیال میں لیڈر کی ایک خصوصیت یہ بھی ہوتی ہے کہ وہ نازک سے نازک موقع پر بھی اپنے عمل کی آزادی کسی نہ کسی حد تک اپنے ہاتھ میں رکھتا ہے۔

التوا کے اعلان کا ڈھاکہ میں فوری ردِ عمل ہوا۔ اس کی وجہ شاید یہ تھی کہ مجیب کو ایک روز پہلے اس کی اطلاع مل گئی تھی اور اس نے اس بات کا اہتمام کر لیا تھا کہ اگر اجلاس کی نئی تاریخ کا اعلان نہ کیا جائے تو اس کی ناپسندیدگی کا بھرپور اظہار ہو سکے؛ چنانچہ اعلان کے کوئی آدھ گھنٹے بعد لوگ سڑکوں پر نکل آئے۔ پھر سے ہوئے عوام، گروہ درگروہ بانس کی لاشیاں اور لوہے کی سلاخیں اٹھائے نعرے لگانے لگے۔ اُن کے الفاظ میں نفرت اور انداز میں وحشت تھی۔ اُن کے دشنام آمیز نعرے سُن کر یوں لگتا تھا کہ پورا شہر عفتے سے کانپ رہا ہے۔ مشتعل ہجوم نے دکانیں (جن میں سے زیادہ تر غیر بنگالیوں کی تھیں) ٹوٹ لیں، گاڑیوں کو نقصان پہنچایا اور ہر وہ چیز جو سامنے آئی، اُسے تہس نہس کر دیا؛ جی کہ ٹیڈیم میں ہونے والے بین الاقوامی کرکٹ میچ کو بھی درہم برہم کر دیا۔ کھلاڑیوں کو پھرے ہوئے ہجوم کے زرخ سے بمشکل بچا کر ایم۔ این۔ اے ہوٹل پہنچایا گیا۔ سڑکوں اور بازاروں میں اپنا ردِ عمل یوں ظاہر کرنے کے بعد عوامی لیگ کی پارلیمانی پارٹی نے شام کو ایک مقامی ہول میں اپنا اجلاس منعقد کیا جس کے بعد مجیب الرحمن نے ایک پُر ہجوم پریس کانفرنس سے خطاب کرتے ہوئے کہا: ”ہم اس





وائس ایڈمرل ایس۔ ایم۔ احسن
گورنر مشرقی پاکستان

صورتِ حال کو چیلنج کیے بغیر نہیں رہ سکتے۔ اسی موقع پر انہوں نے اعلان کیا کہ ۲ مارچ کو ڈھاکہ میں اور ۳ مارچ کو ساکر صوبے میں مکمل ہڑتال کی جائے گی اور حکومت کو غور و خوض کے لیے تین دن کی مہلت دینے کے بعد ۷ مارچ کو آئندہ لائحہ عمل کا اعلان کیا جائے گا۔

یہ بڑی زور دار پریس کانفرنس تھی اور دندنانے والے عجیب کے ایچ کے عین مطابق — مگر عجیب کی شخصیت کا ایک دوسرا رخ بھی تھا جو انہیں اسی شام گورنمنٹ ہاؤس میں لے آیا وہاں انہوں نے اعلیٰ فوجی حکام کے سامنے نہایت عاجزانہ انداز میں اپیل کی: ”حضور، اب بھی وقت ہے، مجھے اجلاس کی نئی تاریخ لے دیجیے، میں اب بھی صورتِ حال پر قابو پاؤں گا، البتہ اگر غیر معینہ عرصے کے لیے تاخیر ہوگی تو وقت ہاتھ سے نکل جائے گا۔“

عجیب کے جانے کے بعد مشرقی پاکستان کے حکام ہالا سر جوڑ کر بیٹھ گئے عجیب کی باتوں میں انہیں مصالحت اور حب الوطنی کی بو آئی۔ انہوں نے نئی تاریخ لینے کے لیے ٹیلیفون پر جنرل سچھی خاں سے رابطہ قائم کرنے کی کوشش کی، مگر صرف لیفٹیننٹ جنرل ایس۔ جی۔ ایم پرزادہ تک پہنچ سکے۔ پرزادہ نے بات کو وہ اہمیت نہ دی جو ڈھاکہ میں محسوس کی جا رہی تھی۔ پرزادہ سے مایوس ہونے کے بعد انہوں نے جنرل عبدالحمید سے بات کرنے کی کوشش کی تاکہ اس کے ذریعے جنرل سچھی خاں کو نئی تاریخ مقرر کرنے پر آمادہ کیا جاسکے۔ جنرل حمید بھی نہ مل سکے، کیونکہ وہ اُس رات سیالکوٹ چھاؤنی میں تھے۔ وہاں کال ملائی گئی اور اُن سے بات ہو گئی۔ وہ ویسے بھی بولتے کم اور سنتے زیادہ تھے۔ انہوں نے بڑے تحمل سے بات سنی اور جنرل سچھی خاں سے بات کرنے کی حامی بھری جس سے ڈھاکہ کی انتظامیہ نے اطمینان کا سانس لیا، مگر یہ وعدہ، وعدہ دلبرانہ سے بہتر ثابت نہ ہوا۔

وائس ایڈمرل احسن، لیفٹیننٹ جنرل صاحبزادہ یعقوب اور میجر جنرل راؤ فرمان علی گورنمنٹ ہاؤس ہی میں تھے کہ رات گئے جنرل پرزادہ نے راولپنڈی سے خود ٹیلیفون کیا۔ ایڈمرل احسن نے ریسپونڈ کیا۔ پرزادہ نے پوچھا: ”جنرل یعقوب ہیں؟“ ”جی ہاں، بیٹھے ہیں۔“ ”فون انہیں دیجیے۔“ جنرل یعقوب نے فون سلبنھا لیا تو پرزادہ نے کہا: ”آپ فوراً احسن سے چارج لے لیں۔“ ٹیلیفون بند کر کے جنرل یعقوب نے ایڈمرل احسن کو تازہ احکام سے آگاہ کیا اور یوں ایڈمرل احسن کی گورنری کا ایک اختتام کو پہنچی۔

یکم مارچ ۱۹۷۱ء ہمارے اپنے کا ایک اہم موڑ تھا۔ اس روز نئی تاریخ کے بغیر اسمبلی کا اجلاس ملتوی کیا گیا۔ اسی روز عوامی لیگ نے اپنا عوامی ردِ عمل دکھایا، اسی روز عجیب نے گورنمنٹ ہاؤس میں نرم رویے کا اظہار کیا اور اسی روز راولپنڈی اور سیالکوٹ ٹیلیفون کرنے کے بعد مشرقی پاکستان کے گورنر کو ہٹایا گیا۔

میرے خیال میں یہ عجیب کے رویے میں بھی ایک اہم موڑ تھا۔ اُس نے یہ کوشش ناکام ہوتے دیکھ کر یہ نتیجہ اخذ کیا کہ ڈھاکہ کی انتظامیہ کا رویہ ہمدردانہ نہ ہو، لیکن راولپنڈی میں بیٹھے ہوئے لوگ جو کچھ اور ہی سوچ رہے ہیں، اُس کی ایک نہیں سنتے۔ شاید وہ ”لاڈکانہ پلان“ کو عملی جامہ پہنانے کی تیاریاں کر رہے ہیں؟ شاید مصالحت کا وقت گزر چکا ہے،

لے پاکستان آبزور، ڈھاکہ ۲ مارچ ۱۹۷۱ء



چنانچہ اس نے مذاکرات کا راستہ چھوڑ کر عدم تعاون کی "پرامن" تحریک کا آغاز کر دیا اور کھلم کھلا محاذ آرائی کے راستے پر سفر شروع ہوا۔

عدم تعاون کی ابتدا ڈھاکہ ایئرپورٹ پر پی آئی اے کے بنگالی عملے کے بائیکاٹ سے ہوئی۔ انہوں نے یکم مارچ کو اُس وقت کام کرنے سے انکار کر دیا جب بوٹنگ طیارے فوجی جوانوں سے لڑے ہوئے اتر رہے تھے۔ دو بنگالی نوجوانوں نے تو ایک طیارے کو تباہ کرنے کی بھی کوشش کی مگر پاکستانی فضائیہ کے عملے نے اسے ناکام بنا دیا۔

فوجی جوانوں کی آمد سے عجیب الزمَن بہت بھرے۔ انہوں نے پر زور احتجاج کیا کہ جن بوٹنگ طیاروں میں ارکانِ اسمبلی کو آنا چاہیے تھا، ان میں بنگالی عوام کی آرزوؤں کا گلا گھونٹنے کے لیے فوجی جوان لائے جا رہے ہیں۔ عجیب کے اس احتجاج اور عوام کے پُر آشوب مزاج کو بھانپتے ہوئے جنرل یعقوب نے جی ایچ کیو سے درخواست کی "لنڈ فوجی جوانوں کی مزید روانگی روک لو، ورنہ الٹا نقصان ہوگا۔"

عجیب اب شعلے اگل رہے تھے۔ اُن کے الفاظ نفرت کے گولے بن کر بھٹ رہے تھے اور ہم ڈھاکہ چھاؤنی میں فکر مند بیٹھے تھے کہ پتہ نہیں کب یہ آگ پورے صوبے یا ملک کو اپنی لپیٹ میں لے لے گی۔

مقامی مارشل لا انتظامیہ نے ان شعلوں پر قابو پانے کی ایک ترکیب سوچی اور مارشل لا آرڈر عنایتاً جاری کر دیا جس میں ملکی سالمیت اور حاکمیت کے منافی خبریں اور تصویریں چھاپنے کی ممانعت کی گئی، مگر ماحول میں حدت اتنی بڑھ چکی تھی کہ اس آرڈر کا خاطر خواہ اثر نہ ہوا۔ یہ حکم کاغذی پروانہ بن کر رہ گیا، کیونکہ اس کی زد میں جو مواد آتا تھا وہ زیادہ تر عوامی لیگ ہی جاری کر رہی تھی اور مشرقی پاکستان سے چھپنے والے کسی اخبار میں اتنی جرأت نہ تھی کہ وہ عوامی لیگ کی خبریں بلیک آؤٹ کر سکے۔ عوامی لیگ کے غنڈے ہر طرف دندناتے پھرتے تھے اور جو کوئی عوامی لیگ سے تعاون نہیں کرتا تھا، اُسے ٹھکانے لگا دیتے تھے۔ حکومت کے وسائل اجازت نہ دیتے تھے کہ وہ معتوب صحافیوں یا دوسرے شہریوں کو فرداً فرداً تحفظ مہیا کر سکے۔ مثلاً وہ کس کس اخبار کے سامنے اور کس کس صحافی کے گھر پر پیر پیر کھڑے کرنی۔ نتیجتاً اس مارشل لا آرڈر عنایتاً کے باوجود عوامی لیگ کا پلڑا بھاری رہا اور عملی طور پر زندگی اسی ڈگر پر چلتی رہی جس پر گزشتہ چند دنوں سے چل رہی تھی۔

یہ صورتِ حال چیف سیکرٹری شفیع الاعظم کے لیے بہت زرخیز تھی۔ انہوں نے اس سے پورا فائدہ اٹھایا ایک سوچی سمجھی حکیم کے تحت (سول امور کے انچارج) میجر جنرل راؤ فرمان علی کو فون کیا: "حالات بدستور بگڑتے جا رہے ہیں آپ فوج کو بلا لیجیے۔" جنرل فرمان نے جواب دیا: "فوج کو طلب کرنا اتنا آسان نہیں، اس میں کئی پیچیدگیاں ہیں، بہتر ہوگا آپ تعلقہ نافذ کرنے والے سول اداروں (پولیس، ایسٹ بنگال رائلز) کو کام پر لگائیں۔" چیف سیکرٹری نے اصرار کرتے ہوئے کہا: "نہیں جنرل صاحب، ان اداروں کے بس کی بات نہیں رہی، فوج کو لو آنا ہی پڑے گا۔"

شفیع الاعظم کے علاوہ صوبائی ہوم سیکرٹری اور انسپکٹر جنرل پولیس نے بھی مارشل لا احکام کو اسی نوعیت کے ٹیلیفون کیے اور فوج بلانے پر زور دیا۔ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ ایک طرف بنگالیوں کو فوج سے اتنی نفرت ہے اور دوسری طرف اس کو بلانے پر اتنا اصرار ہے آخر کیوں؟

مقوڑی دیر بعد شفیع الاعظم نے پھر جنرل فرمان کو فون کیا اور اپنی "درخواست" پر زور دیا۔ جنرل صاحب نے پوچھا:



”آپ فوج، فوج کرتے ہیں، شاید آپ کو اس کی پیچیدگیوں کا احساس نہیں، آپ پہلے شیخ صاحب (مجیب) سے تو بات کر لیں۔“ چیف سیکرٹری نے جواب دیا: ”میں ان کی منظوری کے بعد ہی آپ سے عرض کر رہا ہوں۔“

مارشل لا انتظامیہ نے یہ درخواست قبول کر لی اور یوں ایک دام میں جا لہی۔ ادھر ۲ مارچ کی شام کو کرفیو لگانے کا اعلان ہوا اور فوج اسے نافذ کرنے کے لیے شہر میں داخل ہوئی اور ادھر عوامی لیگ نے کرفیو کی خلاف ورزی کرنے کے لیے اپنے کارکن بھیج دیے صورت حال گھمبیر ہو گئی۔ اسی رات ۳۲ پنجاب رجمنٹ کی ایک پلاٹون کو مہلی کا پٹر کے ذریعے چھاؤنی سے گورنمنٹ ہاؤس پہنچایا گیا تاکہ اقتدار کی اس علامت کو کوئی گزند نہ پہنچے۔

فوجیوں کو حکم تھا کہ کرفیو نافذ کرنا ہے، مگر گولی نہیں چلانی۔ ادھر عوامی لیگ کے کارکنوں کو یہ ہدایت تھی کہ کرفیو توڑنا ہے خواہ اس میں جان ہی چلی جائے۔ یہ بڑی آزمائش کا وقت تھا۔ فوجیوں نے ابتدائی چند گھنٹے بڑے ضبط سے گزارے اور متواتر اشتعال کے باوجود گولی نہ چلائی۔ ڈھاکہ میں کرفیو نافذ کرنے کے اچھا سچ بریگیڈیر ارباب نے سپاہیوں کو ان کے متعلقہ افسروں کی کمان میں چھوڑا اور خود رات گئے مارشل لا ہیڈ کوارٹر پہنچے۔ وہ خاصے برہم نظر آ رہے تھے۔ انہوں نے داخل ہوتے ہی احتجاج کیا کہ ”آپ نے میرے ہاتھ باندھ کر مجھے آگ میں دھکیل دیا ہے۔ فوجی جوانوں کا مذاق اڑایا جا رہا ہے، انہیں گالیاں دی جا رہی ہیں اور ادھر آپ کا حکم ہے کہ گولی ہرگز نہ چلانا۔ ابھی تک سپاہی اس حکم کے پابند ہیں، مگر پتہ نہیں کہ ان کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو جائے۔“ میں بریگیڈیر ارباب کو ۱۹۶۵ء کی جنگ سے جانتا ہوں، وہ عین لڑائی میں بھی کبھی اتنے مضطرب نہ ہوئے جتنے آج دکھائی دے رہے تھے۔

آزمائش کے چند گھنٹے اور گزرے۔ پُراشتعال ہجوم کی اشتعال انگیزیاں اور بڑھیں۔ سپاہیوں کا صبر اور گھٹا اور لہذا دم ہو کر رہا۔ ہجوم نے پتھر اور اینٹیں پھینکیں اور سپاہیوں نے حکم کے مطابق گولیوں سے جواب دیا۔ چھ بنگالی ڈھیر ہو گئے جن میں سے تین وہ تھے جنہوں نے گورنمنٹ ہاؤس پر ہلہ بولا تھا۔ ایک رات میں چھ لاشیں! یہ سراسر شفیق الاعظم اور ان کے آقاؤں کی جیت تھی۔ فوج کی پوزیشن اور پیچیدہ ہو گئی۔ عوامی لیگ کی تحریک کو نیا ٹانگ مل گیا۔

اگلے روز عوامی لیگ نے ان چھ لاشوں کا جلوس نکالا۔ شہر کی بڑی بڑی سڑکوں پر نعرے لگائے۔ فوج پرعین طعن کی اور لوگوں کے جذبات ابھارے۔ خود مجیب نے ان لاشوں کو سامنے رکھ کر اپنی خطیبانہ صلاحیتوں کا خوب مظاہرہ کیا اور اشتعال انگیزی کی رہی سہی کسر بھی پوری کر دی۔ اسی شام مجیب نے چار صفحات کا ایک تند و تیز اخباری بیان جاری کیا جس میں سرکاری ملازموں سمیت معاشرے کے تمام طبقوں سے کہا گیا تھا کہ وہ اس ”غیر قانونی حکومت“ کے خلاف اٹھ کھڑے ہوں اور صرف ”عوامی نمائندوں“ کو طاقت اور اختیارات کا اصلی اور قانونی منبع تصور کریں۔

۲ اور ۳ مارچ کی درمیانی رات کو یہ اخباری بیان مجھے گیارہ سوا گیارہ بجے ملا۔ میں یہ بات فوراً افسران بالا کے نوٹس میں لایا جس پر عقل کے ایک اجارہ دار جھٹ بولے: ”مت چھپنے دو، اخبار والوں سے کہہ دو، یہ مارشل لا کا حکم ہے۔“ عرض کیا: ”ہم تو سکتا ہوں، مگر اس کے نتائج کا ذمہ دار کون ہو گا۔ عوامی لیگ کے ہتھیار بند کارکن ایسے اخبار والوں کی زندگی اجیرن کر دیں گے اور مجیب اور زیادہ مشتعل ہو کر کل مارشل لا انتظامیہ پر اور زور سے برسے گا۔ سوچ لیجیے۔“

ساتھ والے دفتر میں جنرل یعقوب نے مجھے بلایا اور پوچھا: ”یہ اخباری معاملہ ہے، تمہارا کیا مشورہ ہے؟“ میں نے جنرل



یعقوب اور مجیب الرحمن کے خوشگوار مراسم کے پیش نظر تجویز کیا: "آپ مجیب سے بات کر لیں، اگر وہ بیان واپس لے لے یا اسے نرم کر دے تو مسئلہ خود بخود حل ہو جائے گا۔" انہوں نے کہا: "بیٹھو۔" میں ان کی چمکدار میز کے دوسری جانب جنرل صاحب کے سامنے بیٹھ گیا۔ انہوں نے اے ڈی سی سے کہا: "مجھے مجیب الرحمن ملاؤ۔" چند لمحے بعد وہ مجیب سے محو گفتگو ہو گئے۔ میں بیٹھا سنتا رہا۔ انہوں نے شیخ مجیب سے ساڑھے گیارہ بجے سے بارہ بج کر دس منٹ تک بات کی اور انہیں قائل کرنے کے لیے ہر حربہ آزمایا، کبھی مدبرانہ انداز اختیار کیا اور کبھی مصالحانہ، کبھی ایک دلیل دی، کبھی دوسری، مگر ہر وار بے اثر رہا۔ مثلاً انہوں نے مجیب سے کہا: "شیخ صاحب! آپ خود بیان ہی، آپ کو پتہ ہے کہ حالات کتنے کشیدہ ہیں، آپ کے بیان سے صورت حال اور گھمبیر ہو جائے گی۔" مجیب نے جواباً کہا: "جی نہیں، اس میں تو کوئی اشتعال انگیز بات نہیں، یہ تو محض ایک سیاسی بیان ہے۔" جنرل یعقوب نے ٹیلیفون بند کر دیا اور کہا: "وہ کہہ رہا تھا میں بیان کو نرم نہیں کر سکتا۔ مجھ پر بہت دباؤ ہے۔ بہتر ہو گا کہ آپ مجھے گرفتار کر لیں، اس سے میرا مسئلہ حل ہو جائے گا۔ میں کہنے والا تھا کہ اس سے تمہارا مسئلہ تو حل ہو جائے گا، مگر میرا حل نہیں ہو گا، مگر میں نے سوچا یہ جملہ بازی کا موقع نہیں۔ . . . بہر حال یہ تو رہا تمہاری تجویز کا حشر! اب بتاؤ اگلا راستہ کدھر کو نکلتا ہے۔" میں خاموش رہا، کیونکہ اخباری معاملہ ختم تھا اور فوجی معاملہ شروع ہو چکا تھا۔

اس کے فوراً بعد جنرل یعقوب نے تین سینئر افسروں کی میٹنگ بلائی جسے انہوں نے ہلکے پھلکے موڈ میں "مینی وار کونسل" (تفنی مٹی جنگی مجلس مشاورت) قرار دیا۔ اس میں سید جنرل خادم حسین راجہ، سید جنرل رافو فرمان علی اور بریگیڈیر غلام جیلانی شامل تھے۔ مجھے بھی ساتھ بٹھایا گیا۔ صورت حال پر از سر نو غور کیا گیا اور مجیب الرحمن کے سخت رویے کے پیش نظر لائحہ عمل وضع کرنے کے لیے مختلف تجاویز پیش کی گئیں۔ فیصلہ اس بات پر ہوا کہ صوبے بھر میں متعین افواج کو پیشگی اطلاع دی جائے کہ یہ بیان چھپنے والا ہے جس کے رد عمل سے نپٹنے کے لیے وہ تیار رہیں۔

راتوں رات یہ احکام تمام چھاؤنیوں میں پہنچا دیے گئے۔

اگلی صبح جنرل یعقوب نے راولپنڈی فون کیا اور متعلقہ افسروں کو قائل کرنے کی کوشش کی کہ حالات روز بروز بگڑ رہے ہیں، صورت احوال سے نپٹنے کے لیے فوری اور حتمی فیصلہ کیا جائے یا ایسا کرنے کا مجھے اختیار دیا جائے۔ صدر سچی خاں کی طرف سے جواب آیا: "مجھے آپ کی صائب رائے پر پورا اعتماد ہے۔ اگر کسی موقع پر ڈھاکہ اور راولپنڈی کے درمیان مواصلاتی رابطہ منقطع ہو گیا، تو اپنی صوابدید کے مطابق ایکشن لیں۔" درحقیقت ڈھاکہ اور راولپنڈی کے درمیان رابطہ پہلے ہی منقطع ہو چکا تھا، صرف تار اور ریڈیو جیسے مادی ذرائع باقی رہ گئے تھے۔

راولپنڈی میں کسی کے کان پر سون نہ رہی۔ وہ اپنی مصروفیات میں غور ہے۔ عوامی لیگ اپنی تحریک کو تیز تر کرنے کے لیے سر توڑ کوشش کرتی رہی۔ نتیجتاً جگہ جگہ مشتعل ہجوم اور سرکاری عمارتوں (فوج، ایسٹ پاکستان رائفلز اور پولیس) کے درمیان جھڑپیں ہوتی رہیں۔ خون بہتا رہا، جاٹیاں دتباہ ہوتی رہی اور حالات میں کشیدگی بڑھتی رہی۔ تصادم اور ہلاکت کی خبریں ڈھاکہ کے علاوہ چٹاگانگ، جیسور، کھٹنا، کومیل، سلہٹ اور رنگ پور سے بھی موصول ہو رہی تھیں جہاں تصادم کے لیے بنگالیوں کو فوج نظر نہیں آتی تھی، وہ غیر بنگالیوں پر ٹوٹ پڑتے تھے۔ ان میں سے ان گنت افراد بنگالی بلوایوں کے غیظ و غضب کا نشانہ بنے، کئی گھروں کے چراغ گل ہوئے اور کئی خاندانوں کی آبرو خاک میں ملی۔





یئقینٹ جنرل صابجزاده لعقوب خال
کمانڈر ایسٹرن کمانڈ

صورتِ حال سے صدریحی خاں کو متواتر باخبر رکھا گیا، لیکن ہر نئے تار کے جواب میں خاموشی — مجیب اور ناقابلِ برداشت خاموشی! وجہ سمجھ میں نہیں آتی تھی کہ کس وقت کا انتظار ہو رہا ہے۔ چند روز بعد جب جنرل یحییٰ خاں کو لفظ ہر تین ہو گیا کہ اب صورتِ حال ناقابلِ تلافی حد تک بگڑ چکی ہے، تو انہوں نے ۱۰ مارچ کو ڈھاکہ میں تمام سیاسی رہنماؤں سے ملاقات کرنے کا فیصلہ کیا۔ اس کا اعلان کرنے سے پہلے انہوں نے اپنے نائبین کو ڈھاکہ میں حکم دیا کہ وہ مجیب کو اس فیصلے سے قبل از وقت آگاہ کریں اور ردِ عمل انہیں بتائیں۔

جناب مجیب کو جب اطلاع دی گئی تو انہوں نے اس تجویز سے اتفاق کیا۔ حکام نے فوراً "رضامندی" کا تار راولپنڈی روانہ کر دیا۔ صدر نے اگلے روز اپنے فیصلے کا اعلان کر دیا۔ اس پر فوراً مجیب الرحمن چنگھاڑے: "اب کوئی گول میز کانفرنس نہیں ہوگی، اب یہ مذاق نہیں چلے گا۔" مجیب الرحمن جب گرج برس چکے، تو ڈھاکہ کے ایک حاکم اعلیٰ نے ان سے اس قلابازی کی وجہ پوچھی، تو وہ بولے: "میں نے کسی گول میز کانفرنس کی تجویز سے کبھی اتفاق نہیں کیا تھا۔ میں تو سمجھا تھا کہ یحییٰ خاں ڈھاکہ میں فرداً فرداً یا چھوٹی چھوٹی ٹکڑیوں میں سیاستدانوں سے ملنا چاہتے ہیں۔ کیا تم لوگ ایک ہی میز پر مجھے اس بھٹو کے ساتھ بٹھانا چاہتے ہو جو میرے لوگوں کا قاتل ہے؟" مجیب الرحمن کا خیال تھا کہ مشرقی پاکستان میں جو کشت و خون ہو رہا ہے، یہ سب بھٹو کے ایما پر ہو رہا ہے۔ — واللہ اعلم بالصواب!

گولیوں کا نشانہ بننے والوں کی تعداد روز بروز بڑھ رہی تھی۔ ۳۱ مارچ کو ڈھاکہ میڈیکل کالج ہسپتال اور مسعود ہسپتال میں ایک سو پچھن زخمی داخل ہوئے۔ اگلے روز آٹھ ماہے گئے۔ چار موقع پر اور چار ہسپتال میں۔ مجیب الرحمن خود زخمیوں کی خبر گیری کرنے ہسپتال گئے اور خون کے عطیات کے لیے اپیل کی۔

شیخ الاعظم کی درخواست پر — اور مجیب الرحمن کی رضا سے — فوج کو شہر میں داخل ہونے مشکل دو دن اور تین راتیں گزری تھیں کہ عوامی لیگ نے اس کی موجودگی کو "عوام کے لیے باعثِ اشتعال" قرار دے کر فوج کو واپس سیرکوں میں بھیجنے کا مطالبہ کر دیا۔ یوں معلوم ہوتا تھا مجیب صرف یہ دیکھنا چاہتے تھے کہ عوامی تحریک کو کچلنے میں فوج کتنی موثر (یا غیر موثر) ہو سکتی ہے، مگر سوال یہ تھا کہ اگر فوج کو واپس چھاؤنی میں بھیج دیا جائے تو شہر میں امن و امان کون بجال رکھے گا؟ اور عوامی لیگ سے اختلاف رکھنے والے اور دوسرے غیر بنگالیوں کا کیا بنے گا، ان کی جان و مال اور عزت کی حفاظت کا ذمہ کون لے گا؟ مجیب نے کہا: "یہ سب مجھ پر چھوڑ دو، میں اپنے رضا کاروں کی مدد سے امن و امان بجال رکھوں گا۔ اگر ضرورت پیش آئی تو انصار سے کام لوں گا۔ اگر بات آگے بڑھی، تو پولیس کو استعمال کروں گا، مگر آپ فوج کو واپس لے جائیے۔ اس کی موجودگی میں امن بجال نہیں ہو سکتا۔"

مجیب کی اس "پیشکش" پر مارشل لا ہیڈ کوارٹر میں سنجیدگی سے غور کیا گیا۔ اس میٹنگ میں یہ مقرر رہا کہ امن و امان برقرار رکھنے کی کوئی کوشش اس وقت تک کامیاب نہیں ہو سکتی جب تک کہ مجیب کا تعاون حاصل نہ ہو۔ — لیکن مجیب کی تجویز

لے یہ اشارہ صدر ایوب خاں کی گول میز کانفرنس کی طرف تھا جو ۱۵ تا ۱۹ مارچ ۱۹۷۹ء راولپنڈی میں ہوئی تھی۔
۱۷ نیم فوجی تنظیم جو پولیس کی طرح صوبائی حکومت کے ماتحت تھی اور اس میں زیادہ تر بنگالی نفری تھی۔



پر مقامی سطح پر فیصلہ کرنے کے بجائے راولپنڈی کو تازہ صورت حال سے آگاہ کیا گیا۔ وہاں سے حکم آیا مجیب الرحمن کی پیشکش قبول کر لی جائے اور فوج کو واپس بیرون میں بھیج دیا جائے۔

اس طرح حکومت نے رضا کارانہ طور پر مجیب الرحمن کو صوبے میں امن و امان قائم رکھنے کی ذمہ داری منتقل کر دی اور فوج واپس چھاؤنی بھیج دی۔ اس سے مشرقی پاکستان پر مجیب کی گرفت اور مضبوط ہو گئی جس کا ایک شاخسانہ یہ تھا کہ مجیب کے اس دور میں غیر بنگالیوں کا قافیہ تنگ ہو گیا۔ وہ ظلم و ستم سے تنگ آ کر اپنے گھر چھوڑنے اور چھاؤنیوں میں پناہ ڈھونڈنے لگے۔ ڈھاکہ چھاؤنی میں شاید ہی کوئی ایسا گھر ہوگا جس میں پانچ سے لے کر پچاس افراد پناہ گزین نہ ہوں۔ یہ لوگ برآمدوں میں صحنوں میں گیلروں میں حتیٰ کہ باورچی خانوں میں سمٹے بیٹھے تھے۔ جو لوگ سلامتی کا ٹکٹ خریدنے کی استطاعت رکھتے تھے وہ مغربی پاکستان پر واپس آ کر کئے جو بے کس اور بے مایہ تھے وہیں وار سہتے رہے۔

جنرل یعقوب ایک پڑھے لکھے انسان تھے، انسانی آلام کے بارے میں گہری تشویش رکھتے تھے۔ انہوں نے ہمارے بارے میں کو جنرل ایس۔ جی۔ ایم۔ پیرزادہ کو فون کیا اور کہا کہ صدر یحییٰ خاں کو بلا تاخیر ڈھاکہ پہنچنا چاہیے، کیونکہ ہر لمحہ ہمیں مسئلے کے حل سے دور لیے جا رہے ہیں۔ جنرل پیرزادہ نے یحییٰ خاں سے بات چیت کرنے کے بعد بتایا کہ صدر جلد ہی ڈھاکہ آئیں گے، البتہ قطعی تاریخ کا تعین اس وقت مشکل ہے۔ یہ بھی انکشاف کیا کہ وہ ابھی ٹیلیفون پر مجیب سے بات کریں گے اور ان سے کہیں گے کہ وہ حالات کو مزید خراب نہ ہونے دیں۔ اس کے بعد یحییٰ خاں کو مجیب الرحمن کے گھر ایک ایسے ٹیلیفون پر ملا دیا گیا جو کسی ٹیلیفون ڈائریکٹری میں درج نہ تھا۔ اس گفتگو کا ریکارڈ کہیں موجود نہیں۔

صدر یحییٰ خاں کی متوقع آمد کی خبر سن کر جنرل یعقوب اور ان کے رفقاء کو قد سے اطمینان ہوا۔ اڑتی اڑتی یہ خبر سنبھلی جیسے جو نیر افسروں تک بھی پہنچی۔ ہم سب نے اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کیا کہ بات آگے تو بڑھی۔

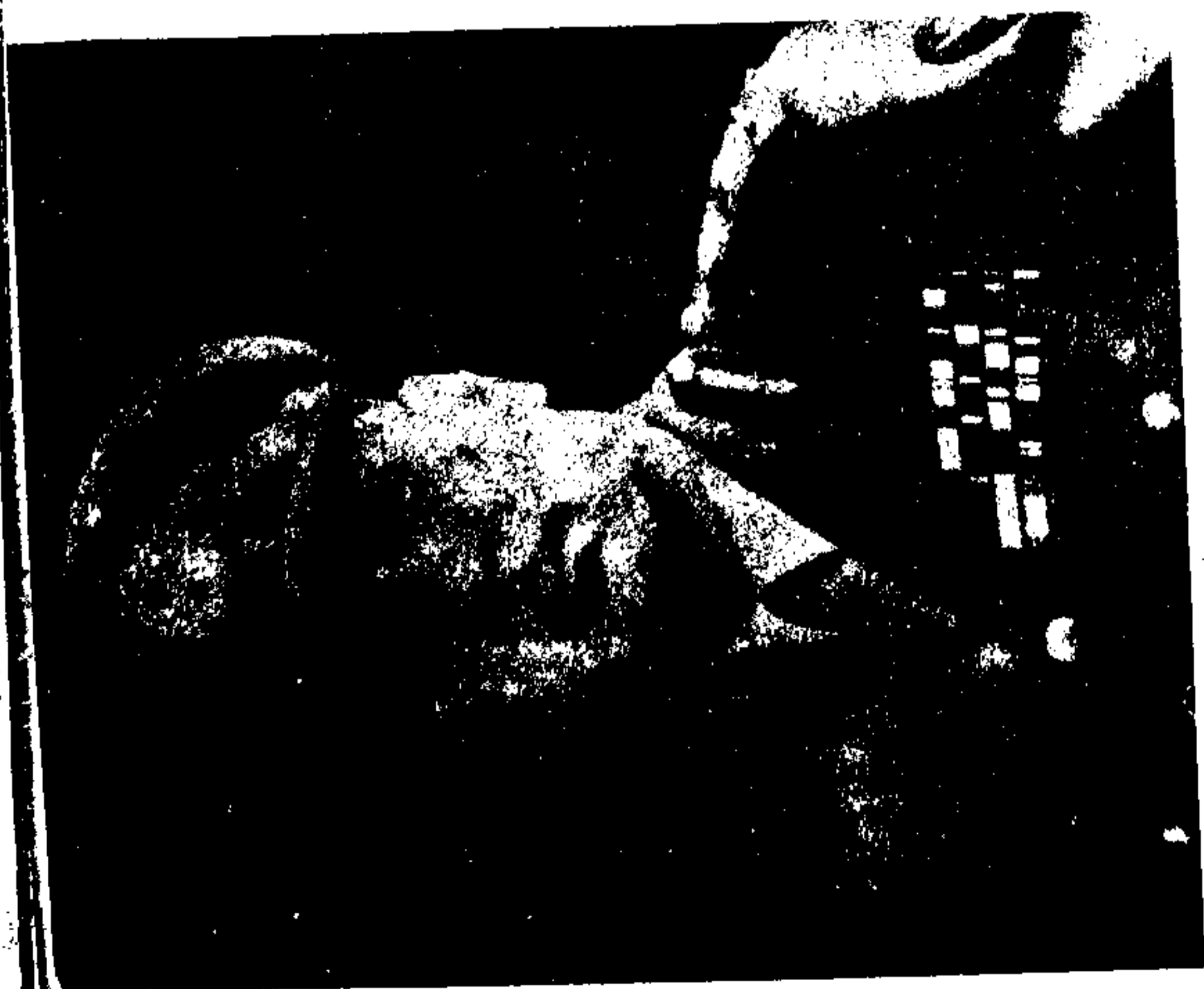
اسی رات (۲۴ اور ۲۵ مارچ کی درمیانی شب) گورنر احسن کو مغربی پاکستان روانہ ہونا تھا۔ وہ جنرل یعقوب کے گھر ایک الوداعی دعوت میں مدعو تھے۔ جنرل فرمان اور جنرل خادم بھی موجود تھے۔ والٹ ایڈمرل احسن کو جہاز پر چڑھانے کے بعد تینوں جنرل فلیگ سٹاف ہاؤس (جو جنرل یعقوب کا مسکن تھا) پہنچے اور صدر یحییٰ خاں کے متوقع دورے اور اس کے مفید نتائج پر تبادلہ خیال کرنے لگے۔ جب گھڑی پر نو بج کر دس منٹ ہوئے تو ٹیلیفون کی گھنٹی بجی یہ کال جنرل یحییٰ خاں کی طرف سے تھی۔ وہ جنرل یعقوب سے بات کرنا چاہتے تھے۔ جنرل یعقوب نے دل میں کئی دوسو سے لیے ٹیلیفون کا ریسپورڈ اٹھایا۔ جنرل خادم، جنرل فرمان اور تینوں بیگمات اُمید و بیم کی حالت میں دیکھتی رہیں کہ کیا خبر آتی ہے۔ جنرل یحییٰ خاں نے کہا: میں نے فی الحال ڈھاکہ آنے کا ارادہ بدل لیا ہے۔ جنرل یعقوب نے حسب توقع ان کے تشریف لانے پر اصرار کیا، مگر یحییٰ خاں نہ مانے، انہوں نے کہا: "نہیں، نہیں، میں نہیں آ سکتا، کیونکہ میں سمجھتا ہوں کہ میرے آنے سے صورت حال کو بہتر بنانے میں کوئی مدد نہیں ملے گی"۔ انہوں نے یہ فیصلہ سنا کر فوراً ٹیلی فون بند کر دیا۔

تینوں جنرل سخت مایوس ہوئے۔ صدر نے دو ٹوک فیصلہ دے کر اُمید کی آخری کرن بھی بچھا دی تھی۔ اب کیا ہو سکتا ہے؟ وہ سوچ میں پڑ گئے۔





لیفٹیننٹ جنرل امیر جی ایم پیڑا



لیفٹیننٹ جنرل ٹکا خان

جنرل یعقوب نے آپریٹر سے کہا کہ وہ جنرل پیرزادہ سے ملا دے۔ چشم زدن میں کال مل گئی۔ جنرل یعقوب نے کہا: پیرا! اگر صدر کو ڈھاکہ آنے پر آمادہ نہیں کیا جاسکتا، تو مجھے اپنی ذمہ داریوں سے سبکدوش کر دیا جائے۔ میں کل صبح استعفیٰ ارسال کر دوں گا۔“

بات ختم ہوئی، جنرل یعقوب چہرے پر برہمی کے آثار لیے واپس ڈرائنگ روم میں پہنچے۔ جنرل فرمان اور جنرل خادم نے بھی مستعفی ہونے کی پیشکش کی (کم از کم اب ان دونوں سینئر افسروں کا موقف یہی ہے)۔ اس پر جنرل یعقوب نے ان کی تائید اور حمایت کے لیے اُن کا شکریہ ادا کیا اور کہا: یہ کوئی ٹریڈ یونین نہیں، فوج ہے، اس میں یوں استعفیٰ دینا مناسب نہیں۔“

رات گئے یہ عمل برخاست ہوئی اور تازہ صورت حال کے پیش نظر طے پایا کہ اسی رات جنرل فرمان راولپنڈی چلے جائیں اور بالمشافہ صدر سچی خاں اور جنرل پیرزادہ کو صبح صورت حال سے آگاہ کریں۔ جنرل فرمان بلا تاخیر اپنے مہمن پر روانہ ہو گئے۔ اگلی صبح جنرل یعقوب نے بذریعہ تار (سگنل) اپنا استعفیٰ راولپنڈی بھیج دیا۔

جنرل یعقوب کا تحریری استعفیٰ ملنے سے پہلے ہی جنرل سچی خاں اگلا قدم اٹھا چکے تھے۔ انہوں نے پنجاب کے مارشل لا ایڈمنسٹریٹر اور کور کمانڈر جنرل لکھا خاں کو راولپنڈی طلب کیا تاکہ انہیں جنرل یعقوب کی ذمہ داریاں سونپ سکیں۔

جنرل فرمان اور جنرل لکھا خاں جو مختلف مقامات سے مختلف جنموں پر مختلف اوقات میں روانہ ہوئے تھے، اپنی منزل پر تقریباً ایک ہی وقت پہنچے۔ انہوں نے صدر سے الگ الگ ملاقات کی۔ جنرل لکھا خاں نے فوراً جنرل سچی کے حکم پر سر تسلیم خم کر دیا۔ جنرل فرمان نے نسبتاً طویل گفتگو کے دوران صدر کو حالات کی سنگینی سے آگاہ کیا اور بلا تاخیر فیصلوں کی ضرورت پر زور دیا۔ سچی خاں نے یہ رام کہانی سُننے کے بعد کہا: ”بچو، مجھے اپنے بس کا بھی تو خیال رکھنا ہے۔ میں مشرقی پاکستان کے لیے مغربی پاکستان کو نظر انداز نہیں کر سکتا۔“ یہ عقده ابھی تک حل نہیں ہو سکا کہ اُن کی مُراد مغربی پاکستان کے اکثریتی لیڈرز و افساد علی بھٹو سے تھی، فوجی جرنیلوں سے یا دونوں سے؟

اس اثنائے مشرقی پاکستان میں مزید خون بہتا رہا۔ ظلم و ستم کا نشانہ زیادہ تر وہ غیر بنگالی (بھاری اور مغربی پاکستانی) تھے جو عوامی لیگ کے دہشت پسندوں کے خلاف اپنا دفاع نہیں کر سکتے تھے۔ ان کی داستانِ غم اتنی طویل ہے کہ اس کے لیے ایک علیحدہ کتاب لکھی جاسکتی ہے۔ یہاں صرف اتنا ذکر کرنا ضروری ہے کہ مشرقی پاکستان میں زیادتیوں اور بنگالیوں پر ہی نہیں ہوئیں، غیر بنگالیوں پر بھی ہوئی ہیں اور وہ بنگالیوں کے بے انتہا غیظ و غضب کا نشانہ بنے ہیں۔

ایک دن میں سب سے زیادہ خون جس جگہ بہاؤ چٹاگانگ کا وہ جھتہ ہے جسے بہاڑ ملی کہتے ہیں۔ وہ واقعی ظلم کے بہاڑ تھے آگیا تھا۔ وہاں ۱۰۲ غیر بنگالیوں (زیادہ تر بہاریوں) کو تہ تیغ کر دیا گیا۔ بریگیڈیئر محمد ار نے جنہیں چٹاگانگ کا مارشل لا ایڈمنسٹریٹر بنایا گیا تھا، اس قتل و خون کو روکنے کے لیے کوئی موثر کارروائی نہ کی۔ یہ وہی بریگیڈیئر ہیں جن سے میں نے فوج میں بنگالیوں کا کوٹا دگنا کرنے کے سلسلے میں انٹرویو لیا تھا۔ چٹاگانگ کا ذکر صرف نمونے کے طور پر کیا ہے۔ اس طرح کی بہت سی وارداتیں مشرقی پاکستان کے کئی علاقوں میں ہوئیں جہاں عوامی لیگ کے غنڈوں کو من مانی کرنے کا موقع ملا۔

خود ڈھاکہ میں حالت تشویشناک تھی۔ شہریوں میں احساسِ تحفظ ختم ہو چکا تھا۔ ہر وقت موت سر پر منڈلائی نظر آتی تھی۔ لوگ

لہ BASE: بمعنی نیاد، یہاں مُراد طاقت کا ستون۔



اپنا گھر طبرستان اُونے پونے بیچ کر مغربی پاکستان جا رہے تھے۔ گلشن کالونی اور بانانی کالونی (جو ڈھاکہ کا گلبرگ کہلاتا تھا) کے لوگوں نے پی آئی اے کے ٹکٹ کے عوض (جس کی مالیت صرف ۲۵۰ روپے تھی) اپنی نئی کاریں لے دیں۔ بعض نے اپنا بھرا ہوا گھر دوسرے کو سوئپ کر راہ فرار اختیار کی۔

ہوائی اڈے پر دن رات ٹکٹ کے امیدواروں کی لمبی لمبی قطاریں لگی رہتی تھیں۔ لوگ رات کو بھی اپنی جگہ سے نہ ہٹتے تھے کہ اگلے روز ان کی باری سمجھے چلی جائے گی۔ یہ نظارہ بڑا رقت انگیز تھا جیسے سمندر کی بے رحم لہروں نے، بحری قزاقوں کے ہاتھوں لٹے پٹے اس بے یار و مددگار قافلے کو ساحل کی رخ بستہ ریت پر پھینک دیا ہے۔ اب اس کا کوئی پُرساں حال نہیں، اب اس کا کوئی مددگار نہیں۔

عوامی لیگ کے رضا کاروں نے ہوائی اڈے کی طرف جانے والی تمام سڑکوں پر چوکیاں (چیک پوسٹ) قائم کر رکھی تھیں تاکہ بنگلہ دیش کی دولت کے انخلاء کو روکا جاسکے۔ سب سے بڑی چوکی شہر سے ہوائی اڈے کو آنے والی بڑی سڑک پر فلام گیٹ کے قریب واقع تھی جہاں شہر سے آنے والے ہر مسافر کو روکا جاتا اور اس کی تلاشی لی جاتی۔ ایک روز ایک پٹھان رکشا میں سوار وہاں سے گزرنے لگا، تو اُسے بھی روک لیا گیا۔ اُس نے مزاحمت کی، تو وہیں قتل کر دیا گیا اور اس کی لاش گھسیٹ کر سڑک کے کنارے ایک نالی میں پھینک دی گئی۔ یہ واقعہ دن دہاڑے مارشل لا ہیڈ کوارٹر سے صرف چند سو میٹر کے فاصلے پر پیش آیا۔ تھوڑی دیر بعد فوجی جوانوں پر مشتمل ایک ٹولی بھیجی گئی تاکہ وہ میت لے کر چھاؤنی میں دفنادیں۔ کہ یہی واحد جائے اماں تھی زندہ اور مردہ محبت و وطنوں کے لیے۔

جوں جوں مارچ کی فیصلہ کن تاریخ قریب آتی گئی، ڈھاکہ اُونہوں اور خدشوں کی لپیٹ میں آتا گیا یہ وہ تاریخ تھی جب شیخ مجیب الرحمن کو رہنمائی کو رس میں جلسے عام سے خطاب کرنا تھا۔ عام خیال یہ تھا کہ اس روز وہ بنگلہ دیش کی آزادی کا ایک طرفہ اعلان کر دیں گے۔ کئی لوگوں کا خیال تھا کہ اس سے اس صورت حال کو باضابطہ اعلان نصیب ہو جائے گا جو واقعہ سارے مشرقی پاکستان میں پائی جاتی ہے، البتہ یہ کہنا بعید از قیاس تھا کہ مسلح افواج اس اعلان پر خاموش بیٹھی رہیں گی، تو کیا وسیع پیمانے پر خانہ جنگی کا وقت آگیا تھا؟

عوامی لیگ کو بھی اس خونی امکان کا احساس تھا اس کی سنجیدہ قیادت ایسی صورت حال ماننا چاہتی تھی، مگر انتہا پسند گروہ اعلان آزادی میں مزید تاخیر کے خلاف تھا۔ مجیب کا اپنا ذہن کس طرف تھا؟ اس کی کوئی نشاندہی نہیں ہو سکی۔ ان کے قریبی حلقوں کا کہنا تھا کہ وہ ایک گروہ کے دباؤ میں کبھی ایک طرف جھک جاتے اور کبھی دوسرے گروہ کے کہنے پر دوسری طرف۔ کسی قطعی فیصلے پر پہنچنے کے لیے مجیب الرحمن نے ہر مارچ کو رات کے کھانے کے بعد اپنے رفقاء کا اجلاس بلایا۔ مارشل لا ہیڈ کوارٹر بھی منظر تھا کہ دیکھیے اونٹ کس کروٹ بیٹھتا ہے۔ آدھی رات کو کسی فیصلے کے بغیر یہ تاریخی اجلاس اگلی صبح تک کے لیے ملتوی ہو گیا۔

اُس رات دو اور اہم واقعات ہوئے۔ صدر یحییٰ نے مجیب کو اپنی گفتگو کی تائید میں ایک برقی پیغام بھیجا جو آدھی رات کو میری موجودگی میں مارشل لا ہیڈ کوارٹر میں موصول ہوا۔ ایک سینئر افسر فوراً یہ پیغام لے کر مجیب الرحمن کے گھر چلے گئے اس پیغام کا لٹ بلباب یہ تھا:





میجر جنرل خادم حسین راجہ
جی او سی، ۴۴ اڈیشن

کتابت و تصدیق
محمد بن عبد الله
ابن عبد الله
ابن عبد الله
ابن عبد الله

”براہ کرم جلد بازی میں کوئی فیصلہ نہ کریں۔ میں جلد ہی ڈھاکہ آؤں گا اور آپ سے مفصل بات چیت کروں گا۔ میں آپ کو یقین دلانا ہوں کہ آپ کی آرزوؤں سے بڑھ کر آپ کے (عوام سے) وعدوں کی تکمیل ہوگی میرے ذہن میں ایسا نقشہ ہے جو چھ نکات سے بڑھ کر آپ کو مطمئن کر سکے گا۔ میں تاکید کروں گا کہ آپ کوئی عاجلانہ فیصلہ نہ کریں۔“

برگنڈر صاحب پیغام پہنچا کر واپس مارشل لا سڈ کو آ رہے تھے، تو عجیب الرحمن کی خوش خلقی اور تواضع کے گن گانے لگے۔ انہوں نے بتایا دھان منڈی میں عجیب کے گھر شادی کا سماں ہے۔ باہر بہت سی کاریں کھڑی ہیں اور غیر معمولی روشنیاں ہیں، بیسیوں لوگ بیٹھے ہیں۔ میرے پہنچنے پر شیخ صاحب نے میرا خیر مقدم کیا اور مٹھائی لانے کو کہا۔ بعض غیر ملکی اخبار نویسوں کا یہ دعویٰ کہ یہی خاں نے مذکورہ بالا پیغام ڈھاکہ کی مارشل لا انتظامیہ کے کہنے پر بھیجا تھا تاکہ فوجی کارروائی کے لیے مزید وقت مل سکے، سراسر بے بنیاد اور لغو ہے؛ البتہ یہ کہنا مشکل ہے کہ جنرل یحییٰ خاں کے ذہن میں ایسا کونسا نقشہ تھا جو عجیب کو بھی مطمئن کرتا اور پاکستان بھی بچ جاتا۔

اُسی رات دوسرا اہم واقعہ ڈھاکہ چھاؤنی میں میجر جنرل خادم حسین راجہ جی اوسی کے گھر رونما ہوا۔ رات کے دو بجے ان کے دروازے کی گھنٹی بجی۔ انہیں جگا کر اطلاع دی گئی کہ تین آدمی ان سے ملنے آئے ہیں۔ انہوں نے ان کے نام پوچھے، تو انہیں بتایا گیا کہ ان میں سے ایک ان کے اپنے انٹیلی جنس افسر اور دوسو پلین ہیں۔ جنرل راجہ نے انہیں اندر بولایا اور اتنے کا مدعا پوچھا۔ دوسو پلین جو عوامی لیگ کی طرف سے آئے تھے، کہنے لگے: ”انتہا پسند عناصر شیخ نجیب پر حد درجہ دباؤ ڈال رہے ہیں کہ سہ پہر کو آزادی کا ایک طرفہ اعلان کر دیں۔ شیخ صاحب اب تک یہ مطالبہ ٹالتے رہے ہیں، لیکن اب ان میں مزاحمت کی ہمت نہیں رہی۔ انہوں نے درخواست کی ہے کہ فوج انہیں اپنی تحویل میں لے لے۔“

میجر جنرل خادم حسین راجہ نے جواب دیا: ”مجھے یقین ہے کہ عجیب الرحمن جیسا مقبول رہنما ضرور جانتا ہوگا کہ دباؤ کو کس طرح ٹالا جاسکتا ہے۔ آپ انہیں میری طرف سے کہہ دیجیے کہ میں کل رنارلس کورس گراؤنڈ میں موجود رہوں گا اور انہیں انتہا پسندوں کے ہاتھوں کوئی گزند نہیں پہنچنے دوں گا۔ لیکن ساتھ ہی انہیں یہ بھی بتا دیجیے کہ اگر انہوں نے پاکستان کی سلامتی کے خلاف کوئی بات کہی تو میں اپنی تمام توپیں، ٹینک اور مشین گنیں لگا کر تمام غداروں کو نالود کر دوں گا اور ڈھاکہ کی اینٹ سے اینٹ بجادوں گا۔ حکومت کرنے کو کوئی بچے کا حکومت کر کے کے لیے کچھ باقی رہے گا۔“

ادھر مارچ کا سورج طلوع ہوا اور ادھر پاکستان میں متعین امریکی سفیر جناب فارلینڈ، عجیب کے گھر داخل ہوئے۔ وہ کچھ دیر اندر رہے، پھر واپس چلے گئے۔ ان حضرت کے جانے کے آدھ گھنٹے بعد عوامی لیگ کے قریبی حلقے سے تعلق رکھنے والے ایک اخبار نویس کا ٹھہرے ٹیلیفون آیا: ”ٹالک صاحب، مبارک ہو، ایک طرفہ اعلان آزادی کا خطرہ ٹل گیا ہے۔“ پروفیسر جی۔ ڈیو جو دھری امریکی سفیر کی اس بے وقت طاقات کا مدعا یوں بیان کرتے ہیں: ”امریکی سفیر فارلینڈ نے عجیب پر امریکی پالیسی واضح کر دی تھی اور کہا تھا کہ علیحدگی کے کھیل میں امریکہ سے کسی امداد کی توقع نہ رکھنا“ (صفحہ ۱۲۰)

پھر وہ فیصلہ کن لمحہ آن پہنچا۔ رنارلس کورس میں جلسے کا وقت ہو گیا۔ ریڈیو اسٹیشن ڈھاکہ نے افسران بالا کی اجازت کے بغیر جلسہ گاہ سے براہ راست کارروائی نشر کرنے کا بندوبست کر لیا تھا اور ریڈیو اناؤنسر ٹھکانے سے سامعین کو رواں تبصرے کی صورت

میں بتا رہا تھا کہ جلسہ گاہ میں دس لاکھ لوگوں کا ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر بنگلہ بندھو، مجیب الرحمن کا انتظار کر رہا ہے۔
یہ اعلان راولپنڈی میں بھی کسی نے سنا اور صدر سچی کے ہیڈ کوارٹر سے ایک بریگیڈیئر نے ڈھاکہ فون کیا کہ یہ بکو اس بند
کرواؤ۔ جب فون بریگیڈیئر "ج" کو ملا، تو میں ان کے پاس موجود تھا۔ انہوں نے مجھے فون دیتے ہوئے کہا: "لو، یہ تمہارے محلے کی
بات ہے تم سنبھالو،" میں نے احکام موصول ہوتے ہی ریڈیو اسٹیشن فون کیا، لیکن کوئی جواب نہ ملا۔ تقریباً تمام نمبر گھماتے، مگر
بے سود! بالآخر ریڈیو اسٹیشن کا ایک ادنیٰ سا انسرفٹا قابل گیا۔ میں نے اس سے کہا: "جلسہ گاہ سے براہ راست نشریات فوراً بند کی
جائیں۔ یہ مارشل لا ہیڈ کوارٹر کا حکم ہے، اگر اس کی تعمیل نہ ہوئی تو آپ ذمہ دار ہوں گے۔" اس نے غصے سے کہا: "اگر ہم ہاٹے
سات کروڑ عوام کی آواز نشر نہیں کر سکتے، تو پھر یہاں کام کرنے کا کوئی فائدہ نہیں۔" ٹیلیفون بند ہونے کے چند منٹ بعد
ریڈیو اسٹیشن خاموش ہو گیا۔

شیخ مجیب الرحمن پروگرام کے مطابق جلسہ گاہ پہنچے جہاں ٹھاٹھیں مارتا ہوا لاکھوں افراد کا ہجوم ان کے اشارے پر کٹ
مرنے کو تیار بیٹھا تھا۔ وہاں پہنچتے ہی انہیں آزاد بنگلہ دلش کا قومی پرچم لہرانے کو کہا گیا، لیکن انہوں نے انکار کر دیا، حالانکہ
اسی صبح ان کی موجودگی میں چند طلبہ نے ان کے ذاتی مکان پر یہ "قومی پرچم" لہرا دیا تھا۔ وہ شدت جذبات سے مغلوب اور حالات
سے پریشان ڈانس پر چڑھے اور ہجوم کا جائزہ لیا۔ مجیب نے اپنی تقریر کا آغاز حسب معمول گھن گرج سے کیا، مگر آہستہ آہستہ علوم کے
جذبات کو آنچ دینے کے بجائے ایک نئی راہ پر ڈالنا شروع کیا۔ انہوں نے پہلے کی نسبت مختصر تقریر کی اور اعلان آزادی سے
اجتناب کیا، البتہ انہوں نے قومی اسمبلی کے اجلاس میں (جو نئے اعلان کے مطابق ۲۵ اپریل کو ہونے والا تھا) شرکت کے لیے
چار شرطوں کا اعلان کیا:

(ا) مارشل لا اٹھایا جائے۔

(ب) اقتدار عوامی نمائندوں کو منتقل کر دیا جائے۔

(ج) فوج کو بیرونیوں میں بھیج دیا جائے۔

(د) حالیہ قتل و غارت کی عدالتی تحقیقات کرائی جائے۔

تقریر کے اختتام پر انہوں نے سامعین کو مشورہ دیا کہ وہ پرامن رہیں اور کسی تخریبی کارروائی میں حصہ نہ لیں، چنانچہ جلسہ ختم
ہوتے ہی حاضرین خاموشی سے اپنے اپنے گھروں کو واپس چلے گئے۔ یوں معلوم ہوتا تھا کہ عبادت گزاروں کا کوئی مجمع اطمینان بخش
و عظامن کر چکے سے واپس آ رہا ہے۔

ہم سب نے سکون کا سانس لیا اور اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کیا کہ بلا لگتی ہے، ورنہ اسی مشتعل ہجوم کو اگر وہ چھاؤنی پر یلغار
کرنے کا اشارہ کرتے، تو وہ ضرور دھاوا بول دیتا، خواہ اس میں اُسے جان کی بازی لگانا پڑتی۔ مارشل لا ہیڈ کوارٹر میں بھی اس
تقریر کا خوشگوار اثر ہوا اور راولپنڈی سے ٹیلیفون کال کا جواب دیتے ہوئے بریگیڈیئر "ج" نے کہا: "موجودہ حالات میں یہ
بہترین تقریر تھی۔"

لہ اس نے اپنی نشریات کا آغاز اگلی صبح کیا جب مجیب الرحمن کی تقریر کا ٹیپ نشر کرنے کی اجازت مل گئی۔



آزادی کے ایک طرف اعلان کا خطرہ مل گیا، تو اس کے اسباب پر اظہارِ خیال کیا جانے لگا۔ کسی نے اسے صدر سچی خاں کی بروقت مداخلت پر محمول کیا، کسی نے اسے جنرل راجہ کی دھمکی کا اثر بتایا اور کسی نے اس کا سلسلہ فارلینڈ کی ملاقات سے ملایا، لیکن غور طلب بات یہ ہے کہ کسی نے بھی اسے محیب الرحمن کی حبس الوطنی کی دلیل نہ سمجھا۔

جس سہ پہر کو محیب الرحمن کی یہ تقریر تھی، اسی سہ پہر کو تین بجکر چالیس منٹ پر مشرقی پاکستان کے نئے حاکم اعلیٰ ایفینڈنٹ جنرل

لگا خاں چارج لینے ڈھاکہ پہنچے ایفینڈنٹ جنرل صاحبزادہ یعقوب، میجر جنرل خادم راجہ اور دوسرے سینئر فوجی افسران کے استقبال کے لیے ہوائی اڈے پر موجود تھے۔ میں بھی حاضر تھا۔ جنرل لگا خاں نیلے رنگ کا سوٹ پہنے ہشاش بشاش طیارے سے اترے، وہ بھرپور اعتماد اور نئے عزم کی زندہ مثال تھے۔ اس کے برعکس جنرل یعقوب پڑمردہ اور بچھے ہوئے تھے۔ وہ اپنے اندرونی ہیجان کو چھپانے کے لیے بار بار اپنی پتی سی چھڑی اپنی خاکی پتلون پر مار رہے تھے۔ تاریخ کے اس دور ہے پر ان دو جرنیلوں کے روپ اور رول میں فرق بڑا نمایاں تھا۔

ہوائی اڈے پر رسمی علیک سلیک کے بعد کاروں کا قافلہ روانہ ہوا۔ سب سے آگے سیاہ مرسدیز تھی جس کی چمکتی چھت پر ڈوبتے سورج کی آخری کرنیں پڑ رہی تھیں۔ رات کی تاریکی آخری کرنوں کے ڈوبنے کے انتظار میں تھی۔

جنرل لگا خاں موسم کی نزاکتوں سے بے نیاز مرسدیز کار میں روانہ ہو گئے۔ جنرل راجہ ان کے ہمراہ تھے۔ راستے میں جنرل لگا خاں نے کہا: "آپ لوگوں نے یہاں کیا گند پھیلا رکھا ہے؟" جنرل راجہ جنہوں نے گزشتہ دو برسوں میں بہت سے موسمی اور سیاسی طوفان دیکھے تھے، اس جملے سے تمللا اٹھے۔ وہ سیٹ کے کنارے پر جا اٹکے اور جنرل لگا خاں کی طرف دیکھتے ہوئے کہنے لگے: "سزا اپنا تبصرہ کچھ دیر کے لیے اپنے پاس رکھیے ہم یہاں روزانہ ایک دوزخ سے گزرتے ہیں کیا ہماری خدمات کا یہی صلہ ہے؟" جنرل لگا خاں خاموش ہو گئے۔

ایک گھنٹے بعد جنرل لگا خاں بریفنگ لینے اور چارج سنبھالنے مارشل لا ہیڈ کوارٹر تشریف لائے۔ مجھے حکم ہوا کہ ساتھ والے کمرے میں انتظار کروں، اگر ضرورت پڑی تو اندر بلا لیا جاؤں گا۔ میں بیٹھا دوش و فردا کے غموں سے کھیلتا رہا اور اعلیٰ افسر دوسرے کمرے میں مصروف رہے۔ کوئی دو گھنٹے بعد بریفنگ ختم ہوئی اور جنرل یعقوب میرے کمرے میں آئے۔ میں نے انہیں سلیوٹ کیا، تو انہوں نے کہا: "نہیں جانے سے پہلے آپ سے ملاقات ہوگی۔" پھر انہوں نے شفقت سے اپنا ہاتھ میرے دائیں کندھے پر رکھا اور داغ دہلوی کا یہ شعر پڑھا:۔

نہیں کھیل اے داغ یاروں سے کہہ دو
کہ آتی ہے اردو زباں آتے آتے

اسی شام آٹھ بجے راولپنڈی تاریک بھیج دیا گیا کہ جنرل لگا خاں نے اپنے غم سے کچھ سنبھال لیا ہے، گویا اب ان پر ایک وقت تین ذمہ داریاں تھیں مشرقی پاکستان میں متعین افواج کے کمانڈر، مارشل لا ایڈمنسٹریٹر اور گورنر۔ جنرل لگا خاں کو پہلی دو ٹوپیاں پہننے کے لیے کسی کی مدد کی ضرورت نہیں تھی، البتہ تیسری ٹوپی پہنانے کے لیے ڈھاکہ ہائی کورٹ کے چیف جسٹس کا تعاون ضروری

لے BRIEFING کسی کو متعلقہ صورت حال سے آگاہ کرنا۔



تھا، کیونکہ قانون کے تحت وہی ان سے گورنر کے ہمدے کا حلف لے سکتے تھے جسٹس صدیقی نے حلف لینے سے انکار کر دیا، وہ ناسازشی طبیعت بتائی، مگر اصل وجہ عوامی لیگ کا اثر تھا جو صرف عوام ہی میں نہیں، بنگالی انتظامیہ اور عدلیہ تک بھی پھیل چکا تھا۔ اس انکار کے چند روز بعد ڈھاکہ بار ایسوسی ایشن نے ایک باقاعدہ قرارداد پاس کی جس میں جسٹس صدیقی کے اس جرات مندانہ اقدام کو خراج تحسین پیش کیا گیا۔

جنرل لکھاؤں نے اپنے بنگالی چیف سیکرٹری کو خود فون کیا کہ وہ حلف اٹھانے کی رسم کا بندوبست کرے۔ وہ بھی ٹال مٹول کرتا رہا۔ ادھر یہ قانونی رکاوٹ بھی تھی کہ کسی اور نزع کو اس کام کے لیے نامزد کرنے کے لیے صدارتی حکم میں ترمیم ضروری تھی جس کے لیے نئے کاغذات راولپنڈی سے آنے تھے۔ لکھاؤں حلف اٹھانے بغیر جو فرٹن انجم دے سکتے تھے، دینے لگے۔

اس اثنا میں عوامی لیگ نے اپنی "حکومت" چلانے کے لیے مختلف ہدایات جاری کرنے کا سلسلہ شروع کر دیا تھا یہ ہدایات جن کی کل تعداد ۳۱ تھی، اخبار میں چھپوا دی جاتیں اور تمام افراد کو ان پر عمل کرنے کا حکم دیا جاتا۔ ان ہدایات کی زد میں تقریباً سبھی شعبے مثلاً سرکاری محکمے، صنعتی ادارے، بینک اور تعلیمی درسگاہیں، ریڈیو اور ٹی وی سٹیشن آتے تھے۔ لوگ عوامی لیگ سے دلی ہمدردی یا اس کے دہشت پسندوں کے ڈر سے ان ہدایات پر عمل کرتے تھے۔ وجہ کچھ بھی سی، صوبے پر مجیب کی گرفت مضبوط تھی۔ صرف سات چھاؤنیاں سات جزیروں کی طرح اس کے تسلط سے باہر تھیں جہاں فوجی افسر اور جوان نہایت صبر آزما دن بسر کر رہے تھے۔ اگرچہ وہ اس صورت حال کو فوراً بدلنے کے لیے بے قرار تھے، مگر ابھی تک فوجی ڈسپن سے مجبور ہر چیز سے جا رہے تھے۔

مجیب نے اشتعال انگیزی کا ہر حربہ آزمایا۔ فوج کے لیے ریل اور سڑکیں استعمال کرنے کی ممانعت کر دی، مقامی ٹھیکیداروں کو راشن سپلائی کرنے سے روک دیا اور جہاں ان کا سامنا ہوتا، انہیں گالیاں دی جاتیں، مگر آفرین ہے ڈسپن کے ان مجتہدوں پر کہ انہوں نے خشک راشن کی وال اور عوامی لیگ کی ترہتر گالیاں کھا کر گزارہ کر لیا، مگر فوجی ڈسپن کے خلاف کوئی حرکت نہ کی۔ ان فوجیوں میں سے بعض اب بھی شہوں میں متعین تھے جہاں وہ بینک، ریڈیو اسٹیشن، بجلی گھر، ٹیلیفون ایکسچینج اور دیگر نازک مقامات کی دیکھ بھال کر رہے تھے۔ مشتعل عوام ان کے پاس آکر پھتیاں کتے، گالیاں دیتے اور بعض اوقات پتھر اڑاتے۔ جب حالات بے قابو ہونے لگتے اور متعلقہ تنصیبات کو نقصان پہنچنے کا خطرہ ہوتا، تو فوج، ایسٹ پاکستان رائفلز اور پولیس کے دستوں کو گولی چلانا پڑتی، جس سے بعض افراد ہلاک یا زخمی ہو جاتے۔ یہ تقریباً روز کا معمول تھا۔

۷ مارچ کو ایک ہفتے کی جھڑپوں کا خلاصہ ایک سرکاری اعلیٰ سے کی صورت میں جاری کیا گیا جس میں اس بات کا اقرار کیا گیا کہ گزشتہ چھ دنوں میں ۱۷۲ افراد ہلاک اور ۳۵۸ زخمی ہوئے۔ اس کی تفصیلات یہ تھیں:

چٹاگانگ میں وارنٹس کالونی، باغ کالونی، فیروز باغ اور پہاڑی میں ایک تصادم کے دوران میں ۷۸ افراد ہلاک اور ۲۰۵ زخمی ہوئے۔ فوج کے ہاتھوں پانچ افراد ہلاک اور ایک زخمی ہوا، جبکہ ایسٹ پاکستان رائفلز کے ہاتھوں دو آدمی گولیوں کا نشانہ بنے۔ ۳ اور ۴ مارچ کو بنگالیوں اور غیر بنگالیوں کے درمیان جھڑپیں ہوئیں۔ صورت حال پر قابو پانے کے لیے پولیس کو گولی چلانا پڑی جس میں ۴۴ افراد مارے گئے۔ رنگپور میں ایک ایسے ہی تصادم کو روکنے کے لیے سیکورٹی فورس کو سختی کرنا پڑی جس کے نتیجے میں تین افراد ہلاک اور گیارہ زخمی ہوئے۔ ۴ مارچ کو کھٹنا کے قریب تخریب کاری کی وجہ سے ریل گاڑی پٹری سے اتر گئی اور پولیس فائرنگ سے چار افراد وہیں ڈھیر ہو گئے اور ایک آدمی



کو چوٹیں آئیں۔ ۶ مارچ کو ۳۴۱ افراد نے جوڈھاکہ سنٹرل جیل میں بند تھے جیل کے دروازے توڑ کر بھاگنے کی کوشش کی۔ پولیس نے ان کی کوشش ناکام بنانے کے لیے فائرنگ کی۔ سات آدمی ہلاک اور تیس زخمی ہوئے۔ ۳ اور ۴ مارچ کو مشتعل ہجوم نے جیسور، کھلنا اور راجشاہی کے ٹیلیفون ایکسچینج پر ہلہ بول دیا۔ فوجی جوانوں کو جو ان نازک تنصیبات کی حفاظت پر مامور تھے، مجبوراً گولی چلانا پڑی جس کے نتیجے میں ۸ آدمی ہلاک اور ۱۹ زخمی ہوئے۔ ۵ مارچ کو کھلنا جاتے ہوئے فوجیوں پر ایک ہجوم نے حملہ کر دیا۔ فوجیوں کو اپنی مدافعت میں گولی چلانی پڑی تین افراد ہلاک اور چند زخمی ہوئے۔

”اپنے فرائض کی ادائیگی میں قانون نافذ کرنے والے افراد کو بھی قربانی دینا پڑی۔ ایک افسر ہلاک اور ایک زخمی ہوا۔ ۲ اور ۳ مارچ کی درمیانی شب کو ڈھاکہ میں ٹھٹھڑی بازار اور نواب پور کے علاقے میں ایسٹ پاکستان رائل فلیز کے ہاتھوں ۶ افراد ہلاک اور ۵۳ زخمی ہوئے۔ ای پی آر کے ایک سپاہی کو اپنی مدافعت میں گولی چلانا پڑی جس کی وجہ سے چار افراد ہلاک اور تین زخمی ہوئے۔

”یوں صوبے بھر میں فوج کے ہاتھوں کل ۲۳۳ افراد ہلاک اور ۲۶ زخمی ہوئے۔ ان میں سے چھ افراد اس وقت مائے گئے جب ایک ہجوم نے صدر گھاٹ (ڈھاکہ) ۲ اور ۳ مارچ کی درمیانی رات کو فوجیوں کی ایک ٹولی پر حملہ کر دیا۔ اگلی صبح ڈھاکہ ہی میں ایک پھرنے ہوئے ہجوم نے مقامی ٹیلی وژن اسٹیشن پر ہلہ بول دیا۔ وہاں متعین فوجی دستے نے گولی چلانی اور ایک شخص ہلاک ہو گیا۔“

یہ تھے ایک ہفتے کے سرکاری اعداد و شمار۔ بنگالیوں نے مرنے اور زخمی ہونے والوں کی تعداد تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔ ان کا خیال تھا کہ حقائق کو کئی گنا گھٹا کر بیان کیا گیا ہے۔ انہیں سرکاری اعلانیے کے بجائے ان خبروں پر زیادہ اعتماد تھا جو عوامی لیگ کے ذرائع سے مقامی اخبارات میں شائع ہو رہی تھیں۔ یہ اخبار ان واقعات کو خوب اچھا لے رہے تھے اور اشتعال انگیز سرخیاں جھاتے تھے، مثلاً ”آج ہزاروں افراد کو گولیوں کا نشانہ بنایا گیا“۔ ”سینکڑوں افراد موقع پر ہی ڈھیر ہو گئے“۔ ”گولیوں کا نشانہ بننے والوں میں بڑی تعداد عورتوں اور بچوں کی ہے“ وغیرہ

اگر سرکاری سینڈ آؤٹ میں بنگالیوں پر تشدد کی تفصیلات کو گھٹا کر بیان کیا گیا تو مقامی اخبارات نے انہیں کئی گنا بڑھا کر کسر نوپری کر دی، لیکن جو قیامت غیر بنگالیوں (بہاریوں) پر ٹوٹی، اس کا نوحہ نہ سرکاری اعلانیوں میں درج ہوا نہ اخبارات میں۔ ان کا خون ان کی آہوں کی طرح بے اثر گیا۔ مجھ سمیت کئی لوگوں نے حکام بالا سے کہا کہ عوامی لیگ کے ”دور حکومت“ میں ہونے والے ان مظالم کی تفصیلات چھپنی چاہئیں، مگر وہ نہ مانے۔ ان کا اصرار یہ تھا کہ یہ دلخراش واقعات پردہ راز میں ہی رہنے چاہئیں، ورنہ دو نقصان ہوں گے: اول یہ کہ ایسی خبروں سے مسلمانوں نے مسلمانوں کا گلا کاٹنا شروع کر دیا، دو قومی نظریے کی لٹھی ہوگی۔ دوئم اس سے مغربی پاکستان میں انتقام کی فضا پیدا ہوگی جہاں ہزاروں بنگالی پرامن زندگی گزار رہے ہیں۔

ان دلائل کے باوجود میرے جیسے بعض افراد کا خیال تھا کہ غیر بنگالیوں پر ہونے والے مظالم کی تشہیر ضرور ہونی چاہیے، ورنہ یہ تاثر لیا جائے گا کہ بنگالی محصوم ہیں اور وہ فوج کے ہاتھوں ستم سہہ رہے ہیں، حالانکہ ستم سہنے والوں میں غیر بنگالیوں کی بھی بڑی تعداد شامل ہے اور ان پر ظلم ڈھانے والے خود بنگالی ہیں۔ یہ دلیل ایک تجویز کی شکل میں چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر کے دفتر (راولپنڈی) میں بھیجی گئی۔

۱۹۶۱ء



گئی، مگر کوئی جواب نہ آیا۔

اسی مہرے میں مجیب الرحمن نے ایک اور محاذ پر اپنی تیاریاں مکمل کر لیں۔ یہ تھا براہ راست فوج سے ٹکرائیے کا محاذ۔ اس سلسلے میں انہوں نے کرنل (رٹائرڈ) ایم۔ اے۔ جی عثمانی کو (رحمن کی ہونجھوں کا ذکر پہلے آچکا ہے) یہ ذمہ داری سونپی کہ وہ مدافعت کے لیے ایک فورس تیار کریں۔ مجیب کی اس پرائیویٹ فوج کے افراد سابق فوجیوں، عوامی لیگ کے رضا کاروں اور یونیورسٹی کے طالب علموں سے لیے گئے۔ اسلحے کی ضروریات اسلحہ خانوں کو لوٹ کر پوری کی گئیں۔ صوبائی حکومت کے تحت انصار فورس کی ہزاروں رائلٹیں جوہول انتظامیہ کے پاس ہوتی تھیں، ان افراد میں بانٹ دی گئیں۔ کچھ اسلحہ بیرون ملک بھارت سے بھی آیا۔

اس کے علاوہ یونیورسٹی کے لڑکوں اور لڑکیوں نے سائنس لیبارٹری میں نصابی تجربات کرنے کے بجائے دیسی بم بنانے شروع کر دیے۔ یہ بم بنانے کے لیے زیادہ معلومات یا ساز و سامان درکار نہ تھا۔ ہر وہ چیز جو دھماکے سے پھٹ سکے اور قریب کھڑے افراد کو نقصان پہنچا سکے، کافی تھی۔

اس پرائیویٹ آرمی نے کرنل عثمانی کے زیر نگرانی بھر پور تربیت کا آغاز کیا اور لڑکوں نے مورچہ بندی اور سرنگوں پر ٹکاوٹیں کھڑی کرنے کی مشق شروع کر دی۔ یہ سب کچھ دیکھ کر ایک عمر رسیدہ بنگالی سیاستدان نے مجیب سے کہا: آپ کیا بچوں جیسی باتیں کرتے ہیں، کیا ان تیاریوں سے آپ پاکستان کی پیشہ ور فوج کا مقابلہ کر سکیں گے؟ مجیب نے جواب دیا: کوئی پیشہ ور فوج، وہ فوج جو ڈھاکہ میں کرفیو نافذ نہ کر سکی، ساڑھے سات کروڑ عوام کا مقابلہ کیسے کر سکتی ہے۔ خواہ ہتھیار کچھ بھی ہوں۔“

مجیب کے کہنے پر کرنل عثمانی نے ایسٹ بنگال رجمنٹ، ایسٹ پاکستان رائلٹز اور پولیس سے بھی رابطہ قائم کیا تاکہ وقت ضرورت ان سے بھی مدد لی جاسکے۔ ان تینوں شعبوں میں ملازمت کرنے والے بنگالی پہلے ہی تربیت یافتہ اور ہتھیار بند تھے اور اندر ہی اندر ان کی ہمدردیاں بھی عوامی لیگ کے ساتھ تھیں، لیکن اوپر سے ڈسپن کاغول یا بھرم قائم تھا، ان میں سے کئی در پردہ عوامی لیگ کی فوجی کمیٹی کے اجلاس میں باقاعدہ شرکت کرتے تھے۔

شیخ مجیب الرحمن اور ان کے مقرر کردہ کمانڈر انچیف کرنل ایم۔ اے۔ جی عثمانی کی اسٹیجی یہ تھی کہ اندر ہی اندر فوجی محاذ پر رٹنے کی تیاریاں مکمل کر لی جائیں اور اوپر سیاسی محاذ گرم رکھا جائے، کیونکہ سیاسی محاذ کی تپش ہی سے اندرونی محاذ کو حرارت مل سکتی تھی اور اگر سیاسی عمل سے نصب العین حاصل ہو جائے، تو ٹکرائیے کی کیا ضرورت ہے، البتہ تیاری دونوں محاذوں پر مکمل ہونی چاہیے۔

مزے کی بات یہ ہے کہ انٹیلی جنس والوں کا دعویٰ ہے کہ انہوں نے ان تمام تیاریوں کے متعلق حکام بالا کو باخبر رکھا، یہ نہیں ان کی رپورٹیں کس مرحلے پر بے اثر ہو کر رہ جاتی تھیں۔ میں نے خود ایک سینئر افسر سے فوج میں عوامی لیگ کے اثر و رسوخ اور موقع محاذ کا ذکر کیا۔ اس نے مجھے یہ کہہ کر چھٹک دیا: بلکہ اس بند کرو، تم دونوں کی بہترین فوج کے ڈسپن پر ہتھان لگا ہے ہو۔“

مجیب الرحمن کی حکومت کے پہلے پندرہ روز کی فضا یہ تھی جس میں ہمیں بالآخر بھی خاں کی آمد کا خروہ پہنچا۔

یہ بعد میں تقیث کے دوران جن فوجی افسروں نے اس فوجی سازش میں ٹوٹ رہنے کا اعتراف کیا، ان میں سے چند ایک کے نام یہ ہیں: بریگیڈیئر محمد ارکان، کمانڈنٹ ایسٹ بنگال سنٹرل ایسٹ کرنل سودا حسن، کمانڈنگ آفیسر ایسٹ بنگال رجمنٹ ایسٹ کرنل سلیم، گورنر کی معاونہ ٹیم کے رکن، ان کے علاوہ میجر مشرف، میجر جلیل، میجر عین، میجر فیاض الرحمن بھی شامل تھے، لیکن یہ گرفتار نہ ہو سکے، اس لیے تقیث کے دوران ان کے اعتراف کا سوال ہی پیدا

نہیں۔





شیخ مجیب الرحمن

صدر، عوامی لیگ



ذوالفقار علی بھٹو

صدر، پاکستان پیپلز پارٹی

بھو مجیب اور کئی

یوں تو میں نے کئی ملکوں کے سربراہوں کی آمد کا بارہا مشاہدہ کیا ہے، مگر ۱۹۷۱ء کو ڈھاکہ میں صدر یحییٰ خاں کی آمد کا منظر کبھی نہیں بھولوں گا۔ عجیب فضا تھی۔ ماہِ وصال کے لحاظ سے موسم بہار کے شباب کا وقت تھا، مگر سیاسی کشمکش نے اسے پُر آشوب دور میں بدل دیا تھا۔ — رُو پہلی سہ پہر کو کھلی ہوئی میں بھی دم گھٹتا تھا۔

ڈھاکہ ایئر پورٹ کے تمام راستے بند کر دیے گئے تھے، صرف پی۔ اے۔ ایف بیس والا گیٹ کھلا تھا جس کے باہر پنجاب کی ایک کپنی ہتھیاروں سے لیس سڑکوں میں سوار کھڑی تھی، ہر سڑک کی چوٹی پر مشین گن نصب تھی جس کا دستہ ایک چاق چوہنڈ مشین گن کے قبضے میں تھا۔ یوں معلوم ہوتا تھا اشارہ پاتے ہی وہ گولیوں کی بوچھاڑ کر دے گا۔ گیٹ سے اندر جانے پر سخت پابندی تھی، صرف مٹھی بھر افراد کو داخلے کے خصوصی پاس جاری کیے گئے تھے۔ ان میں سے ہر کسی کو گیٹ پر روک کر پوری چھان بین کی جانی کہ پاس کا کہیں غلط استعمال تو نہیں ہو رہا۔ میں بڑی مشکوں سے اندر داخل ہوا۔

ہوائی اڈے کی عمارت پر بھی فوج متعین تھی۔ ہتھیار بند، آہنی خود پہننے ہمہ تن مستعد۔ ہوائی جہازوں کی آمد و رفت بھی روک دی گئی تھی۔ صرف صدر کے جہاز کا انتظار تھا، جو کسی لمحے پہنچنے والا تھا۔

استقبال کرنے والوں میں لیفٹننٹ جنرل لگا خاں، میجر جنرل خادم راجہ، میجر جنرل فرمان، میجر جنرل ابوبکر عثمان، میجر ڈاکٹر ماسٹر جنرل جی ایچ کیو اور پانچ چھ اور افسر تھے۔ سرکردہ مشرکوں کی لمبی قطار تھی نہ سرکاری (سویلین) افسروں کی بیتاب نگاہیں پھولوں کے گلے سے تھے نہ اُدے اُدے لباس والے بچے۔ اخبار نویس تھے نہ فوٹو گرافر، حتیٰ کہ سرکاری فوٹو گرافر بھی غائب تھا۔

جنرل لگا خاں اور ان کے ساتھی پی آئی اے کے ہیڈنگر (HANGAR) کے پاس چھوٹے سے کنٹرول آفس کے باہر کھڑے تھے۔ ان سے تقریباً سو میٹر دور ایک چھوٹا ہیلی کاپٹر (الوہٹ III) اڑنے اور اترنے کی مشق کر رہا تھا۔ میں نے اُس کی موجودگی کی وجہ پوچھی تو بتایا گیا کہ ہوائی اڈے سے شہر کو جانے والی سڑک پر عوامی لیگ کی چیک پوسٹ ہے، لیکن یہ صدر کو ہیلی کاپٹر کے ذریعے ایوانِ صدر پہنچانا پڑے۔

میں نے کلائی کی گھڑی پر نظر ڈالی، یحییٰ خاں کی آمد میں صرف چند منٹ باقی تھے۔ میں نے مغرب کی جانب اُن کا بونگک طیارہ تلاش کیا، جو کہیں نظر نہ آیا، البتہ اچانک سیاہ رنگ کا ایک گدھ اڑتا ہوا آیا اور ہمارے سروں کے اوپر سے پرواز کرتا گزر گیا۔ اتنے میں ڈھاکہ کا بنگالی پرنٹنگ پوسٹ پولیس ہانپا ہوا آیا اور فوجی افسروں کو خوشخبری سنانے لگا کہ شیخ صاحب کمال مہربانی سے اس بات پر آمادہ ہو گئے ہیں کہ فارم گیٹ والی چوکی فوراً اٹھالی جائے تاکہ "مہمان کو کوئی پریشانی نہ ہو" اس سے پیشتر مجیب الرحمن کھلے عام یہ کہہ چکے



تھے کہ "صدر سچی خاں بنگلہ دیش کے مہمان کی حیثیت سے تشریف لاسکتے ہیں۔"

ٹھیک تین بجے سہ پہر صدر کا طیارہ اتر آیا۔ پی آئی اے کے عملہ کی عدم موجودگی میں پی۔ اے۔ ایف کے کواڈرن لیڈر قاضی نے ٹیڑھی لگائی صدر اترے۔ ان کا شگنیہ چہرہ صحت و توانائی کی تابانیاں بکھیر رہا تھا، بڑے پُر اعتماد اور خوش و خرم نظر آ رہے تھے۔ جہاز کے علی کے متعلق جو انہیں سری لنکا کے راستے ساڑھے پانچ گھنٹے میں ڈھاکہ لایا تھا، انہوں نے کہا: "یہ بڑے بہادر بچے ہیں، شاباش!" (ان میں کوئی بچی نہ تھی)۔ اس کے بعد انہوں نے سب سے ہاتھ ملایا۔ میرے ساتھ بھی۔ ان کے انداز سے معلوم نہ ہوا تھا کہ ان کے ذہن یا ضمیر پر کسی قسم کا بوجھ نہیں۔ وہ تفکرات سے آزاد یوں دکھائی دے رہے تھے جیسے کسی فوجی یونٹ کے معاینے پر آئے ہوں۔ معلوم ہوتا تھا انہیں حالات کی اس سنگینی کا علم نہ تھا جو ہماری نیندیں حرام کیے ہوئے تھی۔

مصافحہ ختم ہوا، تو صدر کے شایان شان کار سامنے آگئی۔ اس پر جرنیلی کی علامت چار ستاروں والی پلیٹ اور پاکستانی جھنڈا لگا تھا۔ جنرل لگا خاں نے کہا:

"سُر، کیا آپ کار میں تشریف لے جائیں گے؟"

"کیا آپ کو اس میں کوئی شک ہے؟"

"جی نہیں، میرا مطلب تھا کہ... کہ پہلی کار بھی تیار ہے۔"

"نہیں، نہیں، میں کار میں جاؤں گا۔"

"اچھا، میں آپ کے ساتھ چلتا ہوں۔"

"پھر آپ کو چھوڑنے کوں آئے گا؟"

کاروں کا کارواں روانہ ہوا۔ پی۔ اے۔ ایف گیٹ سے باہر، پنجاب کی کمپنی نے حفاظتی فراڈس سنبھالے اور میں چھاؤنی میں آپریشن روم میں چلا گیا جہاں صدر کے نازک سفر کی لمحہ بہ لمحہ خبریں آرہی تھیں: "اب وہ بحفاظت فارم گیٹ سے گزر گئے ہیں۔"۔۔۔۔۔ "اب وہ وی آئی پی سٹور کے پاس ہیں۔"۔۔۔۔۔ "اب کار ایوان صدر کی طرف مڑ رہی ہے۔"۔۔۔۔۔ "اب مہمان بخیر و خوبی اپنی منزل پر پہنچ گئے ہیں۔" آخری پیغام سن کر سب کے دم میں دم آیا۔

اسی شام جنرل سچی خاں نے اعلیٰ فوجی افسروں کا ایک اجلاس ایوان صدر میں طلب کیا۔ اس اجلاس میں جنرل لگا خاں میجر جنرل خادم راجہ، میجر جنرل فرمان اور ایئر کورڈور مسعود نے شرکت کی۔ یہ اجلاس کم اور برفینگ زیادہ تھی۔ اس کا مقصد تازہ صورت حال سے صدر کو آگاہ کرنا تھا۔ یہ برفینگ فوجی ضابطے کے مطابق شروع ہوئی۔ اس میں مشن، وسائل اور وسائل کی تقسیم وغیرہ کا ذکر کیا گیا اور امن عامہ کی حد تک موجودہ صورت حال کا تجزیہ پیش کیا۔ اس برفینگ کا اختتام روایتی انداز میں رجائیت پر ہوا۔ امن و امان کی صورت حال کے پیچھے کار فرما عوامل کی نشاندہی نہ کی گئی اور نہ کوئی ایسی سفارشات پیش کی گئیں جو بہتر مستقبل کی ضمانت دے سکتیں۔ میں نے بعد میں ایک سینئر فوجی افسر سے اس کو تاہی کی وجہ پوچھی تو انہوں نے فرمایا: "صدر نے کبھی ہمارے تجزیوں پر اعتماد نہیں کیا۔ ان کے اپنے سرکاری اور غیر سرکاری مشیر ہیں ان کے ہوتے ہوئے ہمیں ایسے تردد کی ضرورت نہ تھی۔"

اجلاس کے آخر میں صدر نے فرمایا: "آپ لوگ پریشان نہ ہوں، میں کل مجیب کو بلاؤں گا اور اُسے کھری کھری سناؤں گا، ایسی سرد مہری دکھاؤں گا کہ دوپہر کے کھانے کا بھی نہیں پوچھوں گا۔ اس کے بعد پرسوں اُس سے باقاعدہ ملاقات کروں گا اور دیکھوں گا کہ"



اس کی طبیعت ٹھیک ہوئی ہے کہ نہیں ساگر پھر بھی وہ راہِ راست پر نہ آیا، تو میں جانتا ہوں کہ اس کا علاج کیا ہے، صدر کے مُنہ سے یہ تند و تیز کلمات سُن کر حاضرین پر خاموشی چھا گئی۔ "میں جانتا ہوں اس کا علاج کیا ہے؛ بار بار ذہنوں میں بجنے لگا۔ چند لمحوں بعد ایک چُپت اور چھری سے بدن والا افسر سچ کی طرح کھڑا ہو گیا اُس نے ٹوڈ ب مگر سنجیدہ لہجے میں کچھ عرض کرنے کی اجازت چاہی۔ صدر نے سُر کی جنبش سے اجازت مرحمت فرمائی، تو اُس نے کہا: "جناب والا اب حالات بڑے ہی نازک ہیں، یہ بنیادی طور پر سیاسی مسئلہ ہے، اسے سیاسی طور پر ہی حل کرنا چاہیے؛ ورنہ ہزاروں بے گناہ مرد، عورتیں اور بچے خواہ مخواہ جان سے ہاتھ دھو بیٹھیں گے۔" جنرل یحییٰ خاں نے یہ جملے ہمہ تن گوش اور دُوروں نے ہمہ تن تشویش بن کر سُننے سامعین میں سے کئی دل تیز تیز دھڑکے۔ صدر یحییٰ خاں نے اپنی بھاری بلکیں جھپکتے ہوئے جواب دیا: "یس، مٹی یس، مجھے علم ہے۔۔۔ میں جانتا ہوں۔۔۔ بیٹھ جاؤ۔" مٹی بیٹھ گئے (کچھ عرصہ بعد مٹی کو اس جرأتِ زندان کی یاداش میں فرائض سے سبکدوش کر دیا گیا)۔ تھوڑی دیر بعد اجلاس ختم ہو گیا۔ ڈھاکہ میں صدر یحییٰ کا یہ آخری فوجی اجلاس تھا۔ اس کے بعد وہ اپنے سیاسی کاموں میں لگ گئے۔

اگلے روز یحییٰ خاں نے ایوانِ صدر میں مجیب سے ملاقات کی۔ اس ملاقات کے دوران کوئی اور موجود نہ تھا۔ باہر سے دیکھنے والوں کا خیال تھا کہ یہ سابقہ اعمد کی بکھری ہوئی دھجیوں کو جوڑنے کی ایک کوشش ہے۔ یحییٰ خاں نے اس ملاقات کے دوران محسوس کیا کہ مجیب اب انتخابات سے پہلے والا مجیب نہیں ہے۔ اب یہ جناب کی ہاں میں ہاں ملا کر دلجوئی حاصل کرنے کے بجائے احتیاط اور سرد مہری سے کام لے رہا ہے۔ یوں معلوم ہوتا تھا وہ دل کی بات کھل کر زبان پر نہیں لا رہا۔ صدر کو یہ نیا مجیب الرحمن دریافت کر کے ضرور تعجب ہوا ہو گا۔ یہ امر حیران کن ہے کہ لیڈروں کی تیز حیات کے متعلق تو مشہور ہے کہ وہ لان میں اکتے ہوئے گھاس کی آواز بھی سُن سکتے ہیں مگر یحییٰ خاں کو گھاس میں چھپا ہوا یہ سانپ پورا ایک سال نظر نہ آیا۔

درحقیقت ماہ مارچ کے پہلے پندرہواڑے میں حالات نے جو رخ اختیار کیا تھا اور یحییٰ خاں نے انہیں جس طرح خراب سے خراب تر ہونے کا موقع دیا تھا، اس کے بعد گفت و شنید اور صلاح مشورے کے امکانات خاصے کم ہو چکے تھے۔ اب جناب مجیب یہ سمجھنے لگے تھے کہ پورے صوبے پر میرا قبضہ ہے، میں یہ اقتدار یحییٰ خاں کو کیوں لوٹاؤں اور یحییٰ خاں سوچتے تھے کہ میں پورے ملک کا سربراہ اور چیف مارشل لائیڈ منسٹر بیٹھوں، میں رضا کارانہ طور پر (صوبے میں) مجیب کی حاکمیت کیسے تسلیم کروں۔ شیخ صاحب اسی صورت میں مغربی پاکستان سے آنے والے مہمان کی بات مان سکتے تھے جب وہ چھ نکات پر مبنی آئین پر صاد کرنے کو تیار ہو، لیکن یحییٰ خاں ایسے آئین کی تائید کر کے اپنے بیس (BASE) کو تباہ کرنا نہیں چاہتے تھے۔

مارچ کو یحییٰ خاں اور مجیب کے درمیان بات چیت کا ایک اور دور ہوا جس میں دونوں جانب سے ماہرین اور مشیر بھی شامل ہوئے طرفین نے اپنا اپنا نقطہ نظر بڑی وضاحت سے پیش کیا، مگر سمجھوتے کی کوئی صورت پیدا نہ ہوئی۔ عوامی لیگ کے ماہرین نے اپنے نقطہ نظر کی حمایت میں وزنی دلائل تیار کر رکھے تھے، مگر صدر اور ان کے مشیروں کو قائل نہ کر سکے۔ اجلاس تعطل کا شکار ہو گیا۔

اجلاس کے بعد مجیب الرحمن اپنی سفید کار پر سیاہ جھنڈا لہرائے ایوانِ صدر سے باہر نکلے، تو منظر اخبار نویسوں نے انہیں

لہ مارچ کے ابتدا میں جو بنگال مانے گئے، ان کا نام جگجگ سیاہ جھنڈے لہرا کر کیا گیا۔ مجیب الرحمن کی کار پر یہ جھنڈا بھی اسی ماتم کی علامت تھا۔



روک لیا، میں بھی وہیں موجود تھا، مگر عجیب اتنے بے قرار اور جنونی کیفیت میں تھے کہ انہوں نے میری وردی کا کوئی نوٹس نہ لیا۔ میں ان کے بائیں بازو کے پاس کھڑا ان کا چہرہ پڑھتا رہا۔ ان کا چہرہ راکھ کی طرح تھا، ہونٹ شدت جذبات سے پھٹک رہے تھے اور بدن کانپ رہا تھا۔ میں مشرقی پاکستان کے سب سے بااثر لیڈر کا یہ حال دیکھ کر گھبرا گیا۔ میں نے سوچا کہ اس دندانہ تے شیر کی کھال میں یہ طوفان بلاوجہ نہیں آسکتا۔ ضرور ہم کسی عظیم ایٹے کے دوراہے پر کھڑے ہیں۔

اخبار نویسوں نے ان سے جھٹ پٹ کئی سوال کر ڈالے، مگر وہ "ہاں، ہاں" "نہ، نہ" جیسے مختصر جواب دے کر دھان منڈی (گھر) کی طرف چل دیے۔ اخبار نویس ان کے پیچھے ان کے مکان کی طرف بھاگے۔ میں برگد کے درخت تلے اکیلا رہ گیا۔ ڈھلتے سورج کی وجہ سے سائے طویل ہو چکے تھے۔ ایوان صدر کا آہنی دروازہ کھٹ سے بند ہو گیا۔ اس کی جھریوں سے صرف سنتری کی سنگین دکھائی دے رہی تھی۔

چھاؤنی آکر پتہ چلا کہ مذاکرات کے نتائج معلوم کرنے کے لیے میجر جنرل خادم راجہ جنرل لنگا خاں کے پاس گئے، مگر لنگا خاں نے بھی لاعلمی کا اظہار کرتے ہوئے کہا: "خادم! میں بھی مذاکرات کے متعلق اتنا ہی جانتا ہوں جتنا تم۔" جنرل راجہ نے کہا: "لیکن مذاکرات کی رفتار اور نتائج سے باخبر رہنا تو آپ کے فرائض میں ہے، کیا پتہ آپ کو کس وقت کونسا ایکشن لینے کو کہا جائے؟" مزے کی بات کہ یہ نکتہ لنگا خاں کے پلے پڑ گیا اور وہ سدھے جنرل سحیحی خاں کے پاس گئے۔ کہا جاتا ہے جنرل سحیحی نے لنگا خاں کے سوالوں کے جواب میں بتایا: "وہ حرامی گڑ بڑ کر رہا ہے، آپ تیار رہیں"۔ واپس آکر لنگا خاں نے اسی رات ۱۰ بجے جنرل راجہ کو ٹیلیفون پر کہا: "خادم، آپ اپنی تیاری کر لیں۔ اس کا مطلب یہ لیا گیا کہ ہر طرح کی صورت حال سے نپٹنے کے لیے کاغذی تیاری اور منصوبہ بندی کرنے کو کہا گیا ہے، مگر اس منصوبے کا دار و مدار سیاسی مذاکرات پر ہوگا۔ یہاں یہ امر واضح کر دینا ضروری ہے کہ ہر ملک کی فوج ہر قسم کی ممکنہ صورت حال سے نپٹنے کے لیے منصوبہ بندی کرتی ہے جس کا مقصد اندرونی اور بیرونی خطرات کا مقابلہ کرنا ہوتا ہے۔ ان منصوبوں کی موجودگی کا ہرگز یہ مطلب نہیں ہوتا کہ یہ ممالک ایسی کارروائی کرنے پر تئلے ہوئے ہیں، اس لیے بعض غیر ملکی مصنفین کا یہ استدلال سراسر بے بنیاد ہے کہ جب صدر سحیحی خاں ایوان صدر میں سیاسی حل کے لیے کوشاں تھے، ڈھاکہ میں مقیم جنرلیوں نے انہیں فوجی کارروائی پر مجبور کیا۔ اگر بعض جنرلیوں کی طرف سے ان پر ایسا دباؤ تھا، تو یہ سحیحی خاں کے ساتھ اٹھنے بیٹھنے والے جنرلیوں کی طرف سے ہوگا۔ ڈھاکہ میں مقیم جنرلیوں کا انداز فکر مختلف تھا۔

اسی طرح میں بعض غیر ملکی صحافیوں کے ان الزامات کو بھی بعید از حقیقت سمجھتا ہوں کہ سحیحی خاں نے ڈھاکہ میں مذاکرات کا صرف اس لیے ڈھونگ رچا رکھا تھا کہ ان کے جنرلیوں کو فوجی کارروائی کی منصوبہ بندی اور تیاری کے لیے وقت مل سکے۔ میں ذاتی طور پر جانتا ہوں کہ مذاکرات کے دوران تو کیا عجیب الزحمن کے ۲۵ روزہ حکیم مارچ سے ۲۵ مارچ تک دور میں بھی کوئی فوجی ٹکٹ ڈھاکہ نہیں بھیجی گئی اور نہ فوجی کارروائی کی منصوبہ بندی میں دس دن لگے۔ میں ابھی عرض کرتا ہوں کہ یہ منصوبہ کب، کہاں اور کتنے وقت میں تیار ہوا۔

۸ مارچ کو صبح کے دس بجے ہوں گے کہ میجر جنرل راؤ فرمان علی، جی اوسی خادم راجہ کے دفتر تشریف لائے اور فوجی کارروائی کی منصوبہ بندی کرنے لگے۔ انہوں نے اس بنیادی مفروضے پر اتفاق کیا کہ حکیم مارچ سے رونا ہونے والے حالات نے ثابت کر دیا ہے کہ امن و امان قائم رکھنے کے لیے پہلے سے جو منصوبہ 'بلیٹز' (BLITZ) کے نام سے تیار پڑا



ہے وہ بیکار ہو چکا ہے، کیونکہ اس منصوبے کا بنیادی مفروضہ یہ تھا کہ بنگالی عوام ہمارے ساتھ ہیں اور صرف چند سرگھروں سے بننا ہے، لیکن اب ان کے خیال میں صورت حال یہ تھی کہ عوامی تعاون کی توقع نہیں کی جاسکتی، اس لیے ایک ایسے منصوبے کی ضرورت ہے جو مجیب الرحمن کی غیر قانونی حکمرانی کا فوراً قلع قمع کر کے حکومت کے مؤثر اقتدار کو مؤثر طور پر بحال کر دے۔

ابتدائی سوچ بچار کے بعد جنرل فرمان نے آسمانی رنگ کا سرکاری پیڈ نکالا جس کے بائیں جانب ڈیڑھ انچ حاشیہ چھوڑ کر لمبی لکیر لگی ہوتی ہے۔ انہوں نے سگے کی عام نپیل لے کر لکیر کے دائیں جانب منصوبے کا مسودہ لکھنا شروع کیا، جس میں فوجی کارروائی کی ضرورت، اس کے بنیادی لوازمات، مشن اور اس کی تکمیل کے لیے مختلف اقدامات کا ذکر کیا۔ منصوبے کا آخری حصہ جس میں صوبے بھر میں متعین مختلف یونٹوں کو مختلف کام سونپے گئے تھے، جنرل خادم نے سپردِ قلم کیا۔ دونوں کی کوششوں سے یہ منصوبہ اسی ایک نشست میں تیار ہو گیا۔

یہ منصوبہ جس کا نام "اپریشن سرچ لائٹ" رکھا گیا پانچ صفحات پر پھیلے ہوئے سولہ پیراگراف پر مشتمل تھا (تفصیلات کے لیے ملاحظہ ہو ضمیمہ سوئم)۔ اس منصوبے میں اور بالوں کے علاوہ دو بنیادی کارروائیوں پر زور دیا گیا: ایک یہ کہ بنگالی یونٹوں کو ردِ عمل کا موقع دیے بغیر فوراً غیر مسلح کر دیا جائے۔ دوئم یہ کہ عوامی لیگ کے سرکردہ رہنماؤں کو گرفتار کر کے عدم تعاون کی تحریک کو قیادت سے محروم کر دیا جائے۔ منصوبے میں ضمیمے کے طور پر عوامی لیگ کے ان سولہ رہنماؤں کے نام اور پتے بھی درج تھے جنہیں فوری طور پر گرفتار کرنے کی سفارش کی گئی تھی۔

مصلحتی کی سرگرمیوں کا لکھنا ہوا یہ مسودہ فلنگ ٹائٹ ہاؤس میں جنرل عبدالحمید خاں اور جنرل لکھنوا کو پڑھ کر سنایا گیا۔ دونوں نے اسے پذیرائی بخشی، البتہ جنرل حمید نے بنگالی یونٹوں کو غیر مسلح کرنے والی سبق یہ کہہ کر گواہی کہ اس طرح دنیا کی بہترین فوج تباہ ہو جائے گی۔ مگر انہوں نے نیم فوجی تنظیموں مثلاً پولیس اور ایسٹ پاکستان رائفلز کو غیر مسلح کرنے کی منظوری دے دی۔ آخر میں انہوں نے پوچھا: "تمام یونٹوں کو اتنے سائے کام سونپنے کے بعد کتنی نفری (ریزرو) بچتی ہے؟ جنرل راجہ نے جھٹ جواب دیا: "کچھ بھی نہیں"۔

بعد ازاں یہ منصوبہ جنرل سحی کو پیش کیا گیا۔ انہوں نے اسے ایک اور بنیادی خصوصیت سے محروم کر دیا۔ انہوں نے اس تجویز کو یکسر مسترد کر دیا کہ مذاکرات کے ہمارے عوامی لیگ کی اعلیٰ قیادت کو ایک جگہ جمع کر کے گرفتار کر لیا جائے، کیونکہ بقول اُن کے "میں مذاکرات میں لوگوں کے اٹھنا دیکھنے سے ہنچا کر قاتل جمہوریت کے طور پر تاریخ میں اپنا نام درج کروانا نہیں چاہتا"۔ ان ترامیم کے بعد منصوبے میں جو کچھ بچا، اسے آخری شکل دے دی گئی۔ اس پر عمل درآمد کا انحصار مذاکرات کے نتائج پر تھا۔

ادھر جب مجیب الرحمن مذاکرات میں مصروف تھے تو ان کا غیر سرکاری کمانڈر انچیف کرنل (ریٹائرڈ) ایم۔ اے۔ جی عثمانی اپنی فوجی کارروائی کو قطعی شکل دے رہا تھا۔ اس نے مجیب کی "پرائیویٹ آرمی" کو تازہ ہدایات دینے کے علاوہ مشرقی پاکستان میں متعین



بنگالی یونٹوں سے بھی رابطہ قائم کیا اور انہیں مقررہ اشارے پر کارروائی کرنے کو کہا۔ ہندوستانی میجر جنرل (ریٹائرڈ) ڈی۔ کے۔ پیلٹ، کرنل عثمانی کے منصوبے کے حسب ذیل مقاصد بتاتے ہیں:

(ا) ڈھاکہ کے ہوائی اڈے اور چٹاگانگ کی بندرگاہ پر قبضہ کر کے مشرقی پاکستان میں داخلے کی تمام راہیں سدود کر دی جائیں۔

(ب) ڈھاکہ یونیورسٹی کو مرکز بنا کر ایٹ پاکستان رائل فیلڈ، پولیس اور طلبہ کی مدد سے ڈھاکہ شہر کو کنٹرول کیا جائے۔

(ج) مختلف چھاؤنیوں میں مقیم بنگالی یونٹیں بغاوت کر کے متعلقہ چھاؤنیوں پر قبضہ کر لیں۔

اس طرح فریقین نے اپنے طور پر بدترین حالات کے لیے تیاری مکمل کر لی، تاہم یہ معلوم نہ تھا کہ پہل کدھر سے ہوگی۔ ایسا دکھائی دے رہا تھا دونوں دھڑوں کی یہ کوشش ہے کہ پہلے سیاسی بات چیت کو آزما یا جائے، اگر خاطر خواہ نتائج نہ نکلیں، تو پھر فوجی کارروائی کی جائے۔

۱۸ مارچ کو سرکاری ذرائع سے مذاکرات میں کچھ پیش رفت کی اطلاع ملی۔ اس کی بالواسطہ تصدیق مجیب الرحمن کے اُس بیان سے بھی ہوئی جو انہوں نے ایک صحافی کے سوال پر دیا تھا۔ انہوں نے فرمایا: "کوئی پیش رفت نہ ہوتی تو میں مذاکرات جاری کیوں رکھتا، یہ اطمینان بخش خبر جنرل لگا خاں اور پھر جنرل خادم راجہ کو ملی۔ ہوتے ہوتے جب اس کی بھینک ٹھہر جیسے جو نیر افسروں تک پہنچی، تو محسوس ہوا کہ روشنی طلوع ہونے لگی ہے۔ شاید تاریک سرنگ میں رہنے والوں کو ہلکی سی کرن بھی روشنی کا مینار دکھائی ہے۔ یہ خبر سن کر ہم میں سے بعض افسرانے پُر امید ہو گئے کہ انہوں نے اپنے بال بچوں کو مغربی پاکستان بھیجنے کا ارادہ ترک کر دیا۔"

سیحی خاں اور مجیب الرحمن کے درمیان مذاکرات آخر کار عوامی لیگ کی اس تجویز پر مرکوز ہو کر رہ گئے کہ سیحی خاں کی سربراہی میں وقتی طور پر کوئی تبدیلی کیے بغیر مارشل لا فوراً اٹھایا جائے اور اقتدار پانچ صوبوں میں عوامی نمائندوں کو سونپ دیا جائے۔ آئین سازی کے متعلق عوامی لیگ کی تجویز یہ تھی کہ مشرقی اور مغربی پاکستان کے ارکان اسمبلی پر مشتمل دو الگ الگ کمیٹیاں قائم کر دی جائیں جو اسلام آباد اور ڈھاکہ میں اپنے اجلاس منعقد کریں اور ایک معینہ مدت میں اپنی الگ الگ رپورٹ تیار کریں۔ بعد میں قومی اسمبلی کا اجلاس بلا کر ان دونوں رپورٹوں کو مدغم کر کے ایک قابل قبول آئین ترتیب دیا جائے۔ درمیانی مدت کے لیے چھ نکات کی روشنی میں ۱۹۶۲ء کے آئین میں صوبائی خود مختاری کی ضمانت دے کر اسے نافذ کیا جائے۔ جہاں تک مغربی پاکستان کے چار صوبوں کی خود مختاری کا تعلق ہے انہیں اپنی مرضی کے مطابق اپنی حدود و قیود متعین کرنے کا اختیار دیا جائے۔ انتقال اقتدار کی اس تجویز کو ایک صدارتی فرمان کے ذریعے نافذ کیا جائے۔

صدر سیحی خاں کو اس تجویز میں ایک خوبی نظر آئی کہ اس سے ان کی کرسی پر رکن ازم وقتی طور پر (کوئی زد نہیں پڑتی تھی۔ یعنی وہ اور ان کے منتخب کردہ مشیر بھی برسر اقتدار رہیں گے۔ مذاکرات میں جس امید یا روشنی کا اوپر ذکر آیا ہے، غالباً اس کا پس منظر بھی یہی تجویز اور اس پر سیحی خاں کا خوشگوار رد عمل تھا، لیکن اس تجویز کا سنگین پہلو یہ تھا کہ مارشل لا اٹھانے کے بعد سیحی خاں کی حکومت کے لیے کوئی قانونی بنیاد باقی نہیں رہ جاتی تھی۔ اس نکتے کو یا تو سیحی خاں سمجھے نہیں یا اس سے جان بوجھ کر پہلو ستی کر گئے۔ انہوں

یہ اقتباس اُن کی کتاب THE LIGHTNING CAMPAIGN سے لیا گیا ہے جو بھارتی سرکار کی اعانت سے ۱۹۶۱ء کی جنگ کے فوراً بعد شائع ہوئی۔

روزنامہ پاکستان آبرور ڈھاکہ، مورخہ ۲۰ مارچ ۱۹۶۱ء



نے مجیب الرحمن کو یقین دلایا کہ اگر بھٹو کو اس تجویز پر کوئی اعتراض نہ ہوا تو اسے تسلیم کر لیا جائے گا۔

ذوالفقار علی بھٹو اُن دنوں کراچی میں بیٹھے ڈھاکہ مذاکرات کا جائزہ لے رہے تھے۔ انہوں نے اس سے قبل سچی خاں کو اس مضمون کا ایک تار ارسال کیا تھا کہ اگر پی پی پی سے بالابالا کوئی فیصلہ کیا گیا، تو اس پر عمل نہیں ہو سکے گا۔" سچی خاں اور مجیب کے درمیان مذاکرات کی روشنی میں بھٹو کو پیغام بھیجا گیا کہ وہ ڈھاکہ تشریف لائیں۔ انہوں نے جواب بھجوایا کہ "میں پہلے ہی اپنا نقطہ نظر پر واضح کر چکا ہوں۔ سچی خاں کے لیے مشکل یہ پیدا ہو گئی کہ ادھر جناب مجیب، بھٹو کو منہ لگانے کے لیے تیار نہ تھے، کیونکہ اُن کے خیال میں بنگالیوں کے قتل و خون کا ذمہ دار بھٹو تھا اور ادھر بھٹو نے یہ شرط عائد کر دی تھی کہ وہ صرف اسی صورت میں ڈھاکہ آئے گا کہ مجیب الرحمن اُس کے ساتھ مذاکرات کے لیے آمادہ ہو۔

جب ٹیلی فون اور ٹیلی پرنٹر کے ذریعے بھٹو کو ڈھاکہ آنے پر آمادہ کیا جا رہا تھا، تو میں حسبِ عادت ڈھاکہ پریس کلب گیا جہاں ایک کہنہ مشق صحافی مسٹر حسین سے ملاقات ہوئی۔ اسے مجیب کا قریب حاصل تھا۔ اس نے کہا: "جہاں تک ہمارا تعلق ہے، بھٹو کی کوئی اہمیت نہیں۔ ایک بار ہم سچی خاں کو قائل کر لیں، تو بھٹو کو منانا اُن کا کام ہوگا، اور اگر بھٹو اُن کی بات نہیں ماننا، تو پھر سچی خاں جانیں اور بھٹو۔" وہ بیچارہ اس بات سے بے خبر تھا کہ سچی خاں بھٹو کے خلاف کسی قسم کی کارروائی نہیں کر سکتے تھے۔

پریس کلب سے واپسی پر میں روزنامہ "دی پبل" کے دفتر میں رُکا۔ صحافتی معیار سے گرا ہوا یہ اخبار فوج کے خلاف زہر اُگلنے میں سب سے آگے تھا۔ وہاں میری ملاقات عوامی لیگ کے تین بیسٹروں سے ہوئی، جنہوں نے موجودہ سیاسی بحران میں فوج کی نیت کے بارے میں مجھ پر جرح شروع کر دی۔ اگر میرا حافظہ جواب نہیں دے رہا، تو ان میں سے ایک کا نام شہاب الدین تھا۔ اس نے کہا: "کیا آپ یہ محسوس نہیں کرتے کہ فوج جو اپنے خون سے ملک کا دفاع کرتی ہے، اس پر حکمرانی کا بھی حق رکھتی ہے۔" میں نے عرض کیا: "ہرگز نہیں، ہم تو خلوص دل سے سمجھتے ہیں کہ ہمارا کام سرحدوں کا دفاع کرنا ہے۔" اگر یہ درست ہے، تو عوام کے نمائندوں کو اقتدار کیوں منتقل نہیں کرتے اور عوامی لیگ کا مسودہ آئین کیوں مان نہیں لیتے؟" اسے منظور یا منظور کرنا تو صدر کا کیا پھر سیاستدانوں کا کام ہے۔ اس میں فوج کے عام افسروں اور سپاہیوں کا کوئی دخل نہیں، میں نے جواب دیا۔

دوسرا بیسٹر جو سفید قمیص اور سیاہ فریم والا چشمہ پہنے ہوئے تھا، بات کو آگے بڑھاتے ہوئے کہنے لگا: "میرا تجویز یہ ہے کہ آپ عوامی لیگ کے آئین کو آزما کر تو دیکھیں۔ اگر آپ کے اندیشے درست ثابت ہوں اور واقعی ملکی سالمیت کو خطرہ لاحق ہونے لگے، تو آپ اسے فوراً منسوخ کر دیں۔ آپ کے پاس تب بھی تو ہیں اور یہ دلیل ہوگی کہ آپ قومی سلامتی کی خاطر یہ اقدام کر رہے ہیں۔" میں نے جواب دیا: "میں اس بات کا قائل نہیں کہ آئین کو تسلیم کر کے اسے بعد ازاں منسوخ کر دیا جائے۔ میں تو سمجھتا ہوں کہ آئین ایک ایسی مقدس دستاویز ہے جسے منظور کرنے کے بعد ہمیشہ قائم و دائم رکھنا چاہیے۔" بیسٹر طنزاً بولے: "واہ، میجر صاحب! فوج نے کب سے آئین کے تحفظ کا ٹھیکہ لے لیا ہے۔ دس سال میں دو آئین منسوخ کر کے آج آپ ہمیں اس کے تقدس کا سبق دینے لگے ہیں۔"

لہ روزنامہ پاکستان ٹائمز، راولپنڈی ۱۱ مارچ ۱۹۷۱ء



تیسرے بیسٹری بھی بحث میں الجھنے کے لیے پرتول رہے تھے کہ میں نے گھڑی دیکھی اور اس معلومات افزہ گفتگو سے اپنی محرومی کا گلہ کرتے ہوئے اٹھ کھڑا ہوا۔ میں نے اخبار کے مدیر سے اجازت چاہی اور چھاؤنی چلا گیا۔

چھاؤنی میں سیدھا گھر جانے کے بجائے میں نے آفسرز میس میں جھانکا جہاں کھانے کے بعد چند افسر بیٹھے ٹیلی وژن دیکھ رہے تھے جسے معمولی وی پروگرام عوامی لیگ کی عدم تعاون کی تحریک کی بھرپور عکاسی کر رہا تھا۔ پرجوش لڑکے اور لڑکیاں گلا پھاڑ پھاڑ کر آزادی کے نعے الاپ رہے تھے۔ مجھے دیکھتے ہی یہ فوجی افسر شہر کی تازہ خبر سننے کے لیے میری طرف متوجہ ہوئے۔ میں نے انہیں بیسٹریوں والا واقعہ سنایا جس سے تڑپ کر کیپٹن چوہدری جھٹ بولے: "صدر صاحب بلاوجہ معاملے کو طول دے رہے ہیں۔ ان کے حکم کی دیر ہے، فوج کی ایک کمپنی بنگالیوں کو سیدھا کر دے گی"

بھٹو اور ان کے ساتھی اہل مارچ کو دھاکہ پیچھے عوامی لیگ نے بنگلہ دیش کے مہاتوں کے استقبال کی ذمہ داری اٹھائی اور حفاظتی اقدامات سمیت تمام انتظامات اپنے ذمے لے لیے؛ البتہ فوج کو احساس تھا کہ آڑے وقت عوامی لیگ کا بندوبست قابل اعتماد ثابت نہ ہو گا اور بالآخر انہی کو یہ ذمہ داری سنبھالنا پڑے گی۔ پچنانچہ فوج نے بھی مغربی پاکستان سے آنے والے وفد کے لیے متبادل انتظامات کر لیے۔ حسب توقع جلد ہی عوامی لیگ کا بندوبست ناکام ہو گیا۔ ہر طرف الفراقی مچ گئی اور بھٹو اور ان کے ساتھیوں کی حفاظت کے لیے فوج کو آگے بڑھنا پڑا۔

بھٹو سب سے پہلے صدی سچی خاں سے ملے جنہوں نے مجیب الرحمن سے اپنے مذاکرات کے بارے میں پی پی پی چیئرمین کو مطلع کیا۔ بھٹو کا رد عمل ان کی کتاب (GREAT TRAGEDY) میں ملتا ہے۔ وہ کہتے ہیں: (صفحہ ۴۱)

"میں نے دو کمیٹیوں کی تجویز کے بارے میں اپنے رفقاء کو مطلع کیا اور انہوں نے اپنے خدشات کا اظہار کرتے ہوئے مشورہ دیا کہ میں اس تجویز کو نہ مانوں، کیونکہ اس میں پاکستان کو دو لخت کرنے کے جراثیم موجود ہیں"

مگر بھٹو نے اپنی صفائی میں جو دلیل دی ہے، اس کی تصدیق کہیں سے نہیں ہو سکی، اس لیے یہ کہنا مشکل ہے کہ سچی خاں مجیب الرحمن اور ذوالفقار علی بھٹو کے درمیان مذاکرات صرف بھٹو کی "حُب الوطنی" کی وجہ سے ناکام ہو گئے۔ مستقبل کے مورخ کو تاریخ کے اس اہم موڑ کے لیے مزید شہادتیں اکٹھی کرنا ہوں گی۔

تعلقل کے انہی دنوں میں ۲۳ مارچ کا سورج طلوع ہوا۔ یوم پاکستان عموماً فریڈاے پاکستان، تحریک پاکستان اور استقلال پاکستان کے پس منظر میں منایا جاتا ہے، مگر اس روز دھاکہ میں کچھ اور ہی منظر تھا۔ عوامی لیگ نے اسے "یوم مزاحمت" کے طور پر منایا۔ عوامی لیگ کے چند کارکنوں نے قومی پرچم جلا ڈالا، قائد اعظم کی تصویر بھاڑ ڈالی اور ان کا ہتلاسا کر نذر آتش کر دیا۔ پاکستان کی یہ نمائندہ علامتیں ختم کرنے کے بعد انہوں نے آزاد بنگلہ دیش کا پرچم ہر جگہ لہرایا اور مجیب الرحمن کی تصاویر جگہ جگہ آویزاں کر دیں۔ ریڈیو اور ٹیلی وژن نے نیگور کا مشہور نغمہ "سار بنگلہ" قومی ترانے کے طور پر نشر کیا۔

اس حرکت کو محض چند انتہا پسند طلبہ کی شرارت پر محمول نہیں کیا جاسکتا۔ اس کا روایتی میں مجیب الرحمن شامل تھے۔ انہوں نے اسی صبح کو طلبہ کے ایک وفد سے اپنے گھر پر طاقات کی (جسے عموماً غیر سرکاری ایوان صدر کہا جاتا تھا)۔ ان کی مرضی سے ان کے گھر پر آزاد بنگلہ دیش کا پرچم لہرایا گیا۔ مجیب الرحمن نے اسے سلامی دی۔

۲۳ مارچ کو سائے شہر پر سبز اور قرمزی رنگ کے بنگلہ دیشی پرچم لہرا رہے تھے۔ پاکستان کا جھنڈا صرف دو مقامات

پرنظر آ رہا تھا: ایک گورنمنٹ ہاؤس پر اور دوسرا مارشل لا ہیڈ کوارٹر کی عمارت پر، بلکہ گورنمنٹ ہاؤس کے مغربی دروازے پر بھی کسی نے بنگلہ دیش کا تختہ ساجنڈا لگا دیا تھا؛ تاہم اصل عمارت پر اب بھی پرچم ستارہ وہلال پھر پھرا رہا تھا۔ مگر تنہا تنہا —

بنگالی نوجوان شہر کی سڑکوں پر "جے بنگلہ" کے نعروں لگاتے خوب دندناتے پھرتے تھے۔ وہ واقعی اسے یوم آزادی کے طور پر منا رہے تھے۔ بنگلہ دیش کی آزادی! ان کی راہ میں صرف چند روڑے تھے جنہیں عجیب الرحمن پراسن طور پر مہانے کی کوشش کر رہے تھے۔

۲۴ مارچ کو عوامی لیگ نے نئی تجاویز پیش کر دیں۔ اس نے دو دستوری کمیٹیوں کے بجائے دو دستوری کنونشن (مجالس) بنانے پر اصرار کیا اور کہا کہ یہ مجالس مشرقی اور مغربی پاکستان کے لیے دو علیحدہ علیحدہ آئین مرتب کریں اور پھر ان دساتیر کو الحاق پاکستان یا کنفیڈریشن کے لیے بنیاد بنایا جائے۔

اسی روز بھٹو اور یحییٰ خاں کے درمیان علیحدہ ملاقات ہوئی اور انہوں نے اتفاق کیا (اور یہ اتفاق رائے پہلی بار نہیں ہوا تھا) کہ عوامی لیگ کی خود مختاری رفتہ رفتہ پاکستان کی آئینی شکست و ریخت تک پہنچ گئی ہے؛ لہذا قومی سلامتی اور بقا کے لیے ضروری کارروائی کرنی چاہیے۔ اس اتفاق رائے کے باوجود یہی اعلان کیا گیا کہ مذاکرات کا سلسلہ ابھی جاری ہے۔ عوامی لیگ کے جنرل سیکرٹری سرتاج الدین نے اسی شام اپنی پارٹی کی طرف سے یہ اعلان کیا کہ ہم نے "آخری تجاویز" پیش کر دی ہیں اور ہم ان میں کسی قسم کا رد و بدل کرنے کو تیار نہیں۔

مغربی پاکستان کے سیاستدان ماہرین اور مشیر سائنے پرندوں کی طرح آنے والے طوفان کی بوسونگھ کر اپنے اپنے آشیانوں کا رخ کرنے لگے۔ ان میں سے اکثر ۲۴ مارچ کی صبح کو مغربی پاکستان روانہ ہو گئے۔ صرف بھٹو اور دو تین حضرات پیچھے رہے۔

بعد میں عوامی لیگ کے ایک ہمدرد نے مجھ سے گلہ کیا کہ ہمیں تو آخری وقت تک یہی کہا گیا کہ مذاکرات جاری ہیں کسی نے اشارتاً بھی نہ بتایا کہ مذاکرات ناکام ہو گئے ہیں یا عوامی لیگ خطرے کی لکیر کو پار کرنے والی ہے۔" میں نے عرض کیا: "کیا کنفیڈریشن کی تجویز کے بعد بھی کوئی امید باقی رہ گئی تھی؟" اس نے جواب دیا: "ہمارا خیال تھا کہ مذاکرات آگے بڑھ رہے ہیں، فوج بدستور پیچھے ہٹ رہی ہے، ہم اپنی منزل کے بہت قریب ہیں، غلطی ہم سے یہ ہوئی کہ ہم یہ فراموش کر بیٹھے کہ بھٹو بھی ڈھاکہ میں موجود ہے۔"

جب مغربی پاکستان کے قائدین ڈھاکہ سے کراچی روانہ ہو رہے تھے، تقریباً اسی وقت میجر جنرل خادم راجہ اور میجر جنرل راؤ فرمان علی بھی علیحدہ علیحدہ ہلی کا پٹرلے کر بالترتیب جیسور اور کومپلا چلے گئے۔ ان کا کام یہ تھا کہ وہاں کے بریگیڈ کمانڈر، بریگیڈیئر ڈرائی او، بریگیڈیئر اقبال شفیع کو "آپریشن سرچ لائٹ" کی تفصیلات سے آگاہ کریں اور اشارہ ملتے ہی کارروائی کے لیے تیار رہنے کو کہیں۔ جنرل فرمان جیسور سے واپس ڈھاکہ آ گئے، مگر جنرل خادم کومپلا سے چٹاگانگ کے لیے چلے گئے تاکہ وہاں بھی یہی اہم ہدایت ہو سکے۔ چٹاگانگ کی حالت دوسری چھاؤنیوں کی نسبت خاصی نازک تھی۔ وہاں سب سے سینئر افسر بریگیڈیئر محمد ارشد تھے جو عوامی لیگ سے دلی وابستگی کے لیے مشہور تھے۔ انہیں اعتماد میں لینا خطرے سے خالی نہ تھا۔ جنرل راجہ نے نہایت ہوشیاری اور سلیقے سے کام لیتے ہوئے چٹاگانگ میں متعین ایک غیر بنگالی افسر لیفٹیننٹ کرنل فاطمی سے رابطہ قائم کیا۔ اسے اعتماد میں لیا، رازداری پر زور دیا اور

لے روزنامہ پاکستان آبزورڈھاکہ، مورخہ ۲۵ مارچ ۱۹۷۱ء



کہا: تمہارا کام یہ ہوگا کہ جب تک بریگیڈیئر اقبال شفیق اپنی فوج لے کر کوئٹہ سے پہنچ نہیں جاتے، تم چٹاگانگ کو سنبھال لے رکھنا۔ اس دورے میں جنرل خادم نے بریگیڈیئر محمد ارشد سے کہا کہ ڈھاکہ سے شمال میں چند میل کے فاصلے پر ۲ ایٹ بنگال رجمنٹ میں بے چینی کے آثار پائے جاتے ہیں، انہیں ٹھنڈا کرنے کے لیے "پاپا ٹائیگر" کی ضرورت ہے۔ آپ بنگال رجمنٹ کے سیریز افسر ہیں، میرے ساتھ چلیں اور انہیں تسلی دیں۔ بریگیڈیئر محمد ارشد فوراً رضامند ہو گئے اور وہ جنرل راجہ کے ساتھ سیلی کا پٹر میں بیٹھ کر ڈھاکہ آ گئے۔ وہ ڈھاکہ کیا آئے، میرے ہو کر رہ گئے (اور پھر ملازمت سے ہٹا دیے گئے)۔

باقی چھاؤنیوں کو فوجی کارروائی کی تفصیلات بتانے کے لیے چند اعلیٰ اہلکارات آفیسر سلٹ، رنگپور اور راجشاہی تشریف لے گئے اور وہاں کے کمانڈروں کو اعتماد میں لے کر واپس چلے آئے۔

ڈھاکہ شہر ۵ بریگیڈ کی ذمہ داری تھی۔ بریگیڈیئر ارباب نے چپکے چپکے ان مقامات کی نشاندہی کرائی جہاں کارروائی کرنا تھی۔ اس کام کے لیے انہوں نے سادہ لباس اور پرائیویٹ گاڑیوں میں اپنے عملے کو بھیجا۔ بظاہر یہ سارا معاملہ صیغہ راز میں رہا اور اس کا کوئی ناخوشگوار رد عمل نہ ہوا۔

صدر نے ۲۵ مارچ کو واپس راولپنڈی آنے کا فیصلہ کیا اور طے پایا کہ وہ اگلے روز قوم سے خطاب کریں گے۔ اس خطاب کے لیے میجر جنرل راؤ فرمان علی نے حسب ذیل نکات مرتب کر کے صدر کے حوالے کیے:

- ① مجیب الرحمن کو غدار قرار دینے کے بجائے ایسا محبت وطن بتایا جائے جو انتہا پسندوں کے زور سے بھینس گیا ہے۔
- ② یہ اعلان کیا جائے کہ مجیب الرحمن کو کسی جرم میں گرفتار نہیں کیا گیا، بلکہ حفاظتی اقدام کے طور پر فوج کی تحویل میں لیا گیا ہے۔
- ③ اس خطاب میں مشرقی پاکستان کے لیے خود مختاری کی حدود کا تعین کر دیا جائے۔

۲۴ مارچ کو صدر یحییٰ نے قوم کے نام جو تقریر لکھی، اس میں ان نکات کو سرسری نظر انداز کر دیا۔ ڈھاکہ میں مقیم اعلیٰ افسروں کی ٹے کو نظر انداز کرنے کا یہ پہلا — یا آخری — واقعہ تھا۔ قوم سے خطاب میں جنرل یحییٰ خاں نے ایک متوازی حکومت قائم کرنے کی وجہ سے مجیب الرحمن کو غدار کہا اور اعلان کیا "اُسے اُس کے کیسے کی سزا مل کر رہے گی"۔ یہ اعلان مجیب الرحمن کی مددگار کی تقریر کا جواب معلوم ہوتا تھا جس میں انہوں نے قومی اسمبلی کے اجلاس کے التوا پر کہا تھا: "ہم اسے چیلنج کیے بغیر نہیں جانے دیں گے"۔

صدر یحییٰ خاں کی روانگی کو ان کی آمد سے بھی زیادہ پراسرار بنا دیا گیا۔ لوگوں کو دھوکا دینے کے لیے ایک چھوٹا سا ڈرامہ کھیلا گیا۔ سہ پہر کو صدر چائے پینے کے بہانے ایوان صدر سے چھاؤنی میں واقع فلیگ اسٹاف ہاؤس تشریف لے گئے۔ دن کی روشنی ختم ہونے سے پہلے صدر کی سواری پوسٹے طرقات اور لوازمات کے ساتھ چھاؤنی سے شہر کی طرف روانہ ہوئی۔ اس کے آگے پیچھے جلیوں اور موٹر سائیکلوں کا قافلہ تھا۔ کار پر قومی پرچم لہرا رہا تھا اور اس کے آگے پیچھے چار ستاروں والی پلیٹیں لگی تھیں جو یہ ظاہر کرتی تھیں کہ انڈر جنرل صاحب بیٹھے ہیں۔ دراصل وہاں بریگیڈیئر رفیق بیٹھے تھے جن کا بھرا بھرا منہ اور چوکھا کسی حد تک جنرل یحییٰ خاں سے ملتا جلتا تھا۔ اس سوانگ کو رازداری قائم رکھنے کا بہت بڑا معرکہ سمجھا گیا، حالانکہ مجیب کے جاسوسوں کو حقیقت حال کا پتا چل چکا تھا۔ یحییٰ خاں کے ایک بنگالی اسٹاف افسر فیضینت کرنل اے۔ آر۔ چودھری نے صدر کا سامان لے جانے والا ڈاج ٹرک دیکھ لیا اور فوراً مجیب کو خبر کر دی۔ اسی طرح شام کو سات بجے جب جنرل یحییٰ خاں پی۔ اے۔ ایف گیٹ سے ہوئی

اڈے پیچھے، تو بنگالی ونگ کمانڈر خونڈ کر اپنے دفتر میں بیٹھا دیکھ رہا تھا۔ اُس نے جھٹ سیلی فون پر مجیب کو اطلاع دے دی۔
صدر یحییٰ خاں کی روانگی کے پندرہ منٹ بعد ایک غیر ملکی صحافی نے ہٹل انٹرکانٹی نینٹل سے مجھے فون کیا اور صدر کی
روانگی کی سرکاری تصدیق چاہی۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ صدر کی روانگی کاراز، راز نہیں رہا جب صدر نائل پرواز ہوئے، تو شب کی
تاریکی پھیل چکی تھی۔ اس وقت کوئی بھی نہیں جانتا تھا کہ اس شب کی سحر کبھی نہیں ہوگی۔





جنرل عبدالحمید خاں
چیف آف سٹاف (آرمی)

حصہ دوم

خانہ جنگی



آپریشن سرچ لائٹ

۲۵ مارچ: صبح اچھے میجر جنرل خادم راجہ اپنے دفتر میں بیٹھے تھے کہ ان کی صاف شفاف میسر پر پڑے ہوئے ٹیلیفونوں میں سے ایک اچانک بجنے لگا۔ یہ مقامی ہاٹ لائن تھی جو افسران بالا کے درمیان رابطے کا کام دیتی تھی۔ جنہی جنرل راجہ نے سیدو کہا، جنرل ٹکا خاں بولے: "خادم! آج رات!"

ٹھیک دو سال پہلے جنرل کبھی خاں نے فیلڈ مارشل ایوب خاں سے اقتدار وصول کیا تھا۔ آج وہ اپنے دور اقتدار کا سب سے بڑا فیصلہ دے چکے تھے۔ جنرل راجہ نے اپنے ہٹاف کو بلا کر ضروری ہدایات دے دیں۔ اونچی سطح پر شاید یہ ایکشن معمول کی کارروائی سمجھا گیا ہو لیکن نچلی سطح پر جب یہ خبر متعلقہ حضرات تک پہنچی تو خاصی پھیل گئی۔ کوئی ٹینک شکن توپ کا انیویشن لینے بجائے کوئی ہتھیار کٹھنے کرنے لگا کسی نے اپنے موجودہ ہتھیاروں کی کمی پوری کرنا چاہی اور کسی نے ان کے ناقص اجزا ہارنے کی کوشش کی۔ ۲۹ کیولری کے چند افراد جو کچھ روز پہلے زنگپور سے آئے تھے، ورکشاپ میں پڑے ہوئے چھ زنگ آلود ٹینکوں (ایم۔۲۴) کو صاف کرنے لگے۔ اگرچہ یہ ٹینک متحرک جنگ لڑنے کے قابل نہ تھے، مگر ڈھاکہ کی سڑکوں پر شور مچانے کے لیے کافی تھے۔

۱۴ ڈویژن کے ہٹاف نے ڈھاکہ سے باہر چھانونیوں کو آپریشن سرچ لائٹ کے متعلق ایک مخصوص کوڈ کے ذریعے اطلاع دینا شروع کر دی۔ اس کارروائی کے لیے ۲۴ اور ۲۵ مارچ کی درمیانی رات ایک بجے کا وقت مقرر کیا گیا۔ وقت کے تعین میں مصلحت یہ تھی کہ اس وقت تک جنرل کبھی خاں بخیر وعافیت کراچی پہنچ چکے ہوں گے۔

"آپریشن سرچ لائٹ" کے منصوبے کے مطابق ڈھاکہ میں تین مین بیڈ کوارٹرز قائم کیے گئے۔ ایک کے انچارج میجر جنرل زاؤ فرمان علی تھے۔ ان کے ذمے ڈھاکہ شہر تھا۔ ان کے وسائل میں بریگیڈیئر ارباب والا ۵ بریگیڈ تھا۔ دوسرے بیڈ کوارٹر کے انچارج میجر جنرل خادم راجہ تھے جنہوں نے (۵۶ بریگیڈ کے علاوہ) بقیہ ۱۴ ڈویژن کے ذریعے سارے صوبے کو کنٹرول کرنا تھا۔ اس کے علاوہ ایفٹینٹ جنرل ٹکا خاں نے جنرل فرمان اور جنرل راجہ کی کارکردگی پر مجموعی طور پر نظر رکھنے کے لیے مارشل لا بیڈ کوارٹر میں رات جاگ کر گزارنے کا فیصلہ کیا۔ یہ تیسرا بیڈ کوارٹر دارالحکومت ثانی کے علاقے میں واقع تھا۔

دارالحکومت ثانی شروع میں کابینہ ہوا جدید وضع کا زیر تکمیل منصوبہ تھا جس کا ڈیزائن امریکہ کے مشہور ماہر فن تعمیر لونی کاہن نے تیار کیا تھا۔ اس کی تعمیر کی بنیادی وجہ فیلڈ مارشل ایوب خاں (اکتوبر ۵۸ء سے مارچ ۱۹۶۹ء) کے زمانے میں اسلام آباد میں نئے دارالحکومت کا قیام تھا۔ بنگالیوں نے اسلام آباد کی تعمیر پر جو شدید رد عمل ظاہر کیا تھا اسے منہا کرنے کے لیے یہ دوسرا دارالحکومت شروع کیا گیا تھا۔ یہ ڈھاکہ انیر پورٹ کے جنوب مغربی کنارے پر واقع ہے۔



کارروائی سے چند روز قبل مغربی پاکستان سے میجر جنرل افتخار جنجوعہ اور میجر جنرل ابوبکر عثمان مٹھہ کو ڈھاکہ بھیجا گیا تھا تاکہ وہ ضرورت پڑنے پر میجر جنرل خادم راجہ اور میجر جنرل راؤ فرمان کی جگہ ذمہ داریاں سنبھال سکیں۔ یہ احتیاط اس لیے برتی گئی کہ تھوڑا عرصہ پہلے تک یہ دونوں افسر جنرل صاحبزادہ یعقوب کی ٹیم کے اہم رکن تھے جنرل یعقوب تو جا چکے تھے، مگر ڈر تھا کہ کہیں یہ دونوں فوجی کارروائی کرنے سے انکار نہ کریں۔ اس شک کی تصدیق کرنے کے لیے جنرل یحییٰ خاں اور ان کے قریبی حلقوں نے کئی طریقے اختیار کیے؛ حتیٰ کہ ان کے ہم نوالہ وہم پیالہ دوست جنرل عبدالحمید نے جنرل فرمان اور جنرل راجہ کی بیگیوں سے پوچھا کہ آپ کے شوہروں کے خیالات کیا ہیں۔ جب یہ بات جنرل فرمان اور جنرل خادم تک پہنچی تو انہوں نے جنرل حمید کو یقین دلایا کہ ہم آپ کے فرمان کے خادم ہیں۔

میرے جیسے ادنیٰ افسر دس بجے رات جنرل نکا خاں کے میڈیکو آرڈر میں جمع ہونا شروع ہو گئے۔ جب میں وہاں پہنچا تو دفتر کے احاطے میں صوفے اور آرام کرسیاں بچھائی جا رہی تھیں اور رات بھر کے لیے چائے اور کافی کا انتظام کیا جا رہا تھا۔ میرے ذمے کوئی خاص فرائض نہ تھے صرف "حاضر رہتے" کو کہا گیا تھا۔ میں ایک کرسی گھسیٹ کر بیٹھ گیا۔ صوفوں اور کرسیوں کے پاس ایک جیب کھڑی تھی جس میں وائریس سیٹ نصب تھی۔ یہ بیرون خانہ آپریشن روم تھا جس میں جنرل نکا خاں، جنرل مٹھہ اور چند اور حضرات تشریف فرما تھے۔

نٹنڈی چاندنی میں ڈوبا ہوا شہر سو رہا تھا اور موسم بہار کی خشک ہوا میرے گالوں کو چھو کر گزر رہی تھی۔ باہر جتنا سکون تھا میرے اندر اتنا ہی زیادہ تلامطم تھا۔ میں سوچنے لگا یہ خوشگوار رات خون کی ہولی کھیلنے کے لیے قطعاً نامناسب ہے۔

سلخ افواج کے علاوہ اگر کچھ اور لوگ اس رات سرگرم عمل تھے تو وہ عوامی لیگ کے قائدین اور ان کی پرائیویٹ آرمی تھی بنگالی نوجوانوں نے سڑکوں پر رکاوٹیں کھڑی کرنا شروع کر دی تھیں اور عوامی لیگ سے ہمدردی رکھنے والی پولیس اور ای پی آر مستعد تھی۔

شیخ مجیب الرحمن کا مقرر کردہ کمانڈر انچیف کرنل ایم۔ اے۔ جی عثمانی بنگالی یونٹوں سے رابطہ قائم کیے ہوئے تھا۔ ان تیاریوں کے باوجود ابھی تک ساری کارروائی پر خاموشی کی پتلی سی چادر تھی۔

رات ساڑھے گیارہ بجے جیب میں سویا ہوا وائریس سیٹ جاگا۔ ڈھاکہ کے مقامی کمانڈر نے کارروائی مقررہ وقت (ایک بجے) سے پہلے شروع کرنے کی اجازت چاہی، کیونکہ مخالفین کو فوجی کارروائی کا علم ہو چکا تھا اور وہ پوری شد و مد سے مزاحمت کی تیاریاں کر رہے تھے۔ ان کا خیال تھا اب وقت ضائع کرنے سے حریف ہی کو فائدہ پہنچے گا۔ ہم سب نے اپنی اپنی گھڑیوں پر نگاہ ڈالی اور اندازہ لگایا کہ ابھی جنرل یحییٰ خاں سری لنکا کے قریب ہوں گے۔ اگر ابھی کارروائی شروع کی گئی، تو عین ممکن ہے بھارت کے لڑاکا طیارے صدر کے بوئنگ کو کراچی پہنچنے سے پہلے شکار کر لیں؛ چنانچہ نکا خاں نے فیصلہ دیا: "بابی (ارباب) سے کہو کہ جب تک ممکن ہو صبر سے کام لے۔"

بریکڈیٹر ارباب کے بریکڈ کو وقت آنے پر حسب ذیل کارروائی کرنا تھی:

● ۱۳ فریئر فورس ڈھاکہ چھاؤنی میں ریزرو فورس کے طور پر ٹھہرے گی اور وقت ضرورت چھاؤنی کا دفاع کرے گی۔

● ۴۲ لائٹ ایک ایک رجمنٹ (آرٹلری) پہلے ہی ڈھاکہ ایئر پورٹ پر متعین تھی۔ اس کے ذمے ہوائی اڈے کا زمینی اور

فضائی دفاع تھا۔ ۲

● ۲۲ بلوچ ڈھاکہ شہر میں فیل خانہ میں تھی جہاں ایسٹ پاکستان رائفلز (ای پی آر) کا ہیڈ کوارٹر تھا۔ اس کے ذمے ای پی آر

کے پانچ ہزار افراد کو غیر مسلح کرنا اور ان کے ٹیلیفون ایسیٹینج پر قبضہ کرنا تھا۔

● ۳۲ پنجاب کے فتنے راجہ باغ پولیس لائنز میں ایک ہزار بنگالیوں کو غیر مسلح کرنا تھا۔ یہ فورس عوامی لیگ کی ہمدرد سمجھی جاتی تھی۔

● ۱۸ پنجاب کو نواب پورا اور پرنے شہر میں پھیل جانا تھا جن کے متعلق مشہور تھا کہ وہاں ہندوؤں کے ان گنت مکانات اسلحہ خانوں میں تبدیل ہو چکے ہیں۔

● فیڈرل جینٹ (آرٹری) کے فتنے محلہ پور، میر پور اور ان سے ملحقہ علاقوں کو کنٹرول کرنا تھا۔

● ۱۸ پنجاب، ۲۲ بلوچ اور ۳۲ پنجاب کی ایک ایک کمپنی پر مشتمل ایک خصوصی فورس تیار کی گئی تھی جس کے فتنے اقبال ہال

اور عین ناتھ ہال کو جو عوامی لیگ کے حامیوں کے کڑھ بھجے جاتے تھے۔ باعیوں سے صاف کرنا تھا۔

● (ایم۔ ۲۴) ٹینکوں کے نامکمل اسکوڈرن کو حکم تھا کہ وہ پوچھنے سے پہلے شہر کی شاہراہوں پر اپنی قوت اور ہیبت کا مظاہرہ

کریں اور اگر ضرورت پڑے تو فائر بھی کریں۔

● سپیشل سروس گروپ (کمانڈرز) کی ایک کمپنی کے فتنے مجیب الرحمن کو گرفتار کرنا تھا۔

● مذکورہ بالا ایجنٹوں کے فرائض میں حکومت کے اقتدار کو بحال کرنا، چیدہ چیدہ سیاسی قائدین کو گرفتار کرنا، اہم تنصیبات کی حفاظت

کرنا اور مزاحمت کی صورت میں باغیوں کو کھپل دینا شامل تھا۔ ان فوجیوں کو اپنے اپنے علاقوں میں رات ایک بجے سے پہلے

پہنچنا تھا، لیکن راستے میں بنگالیوں کی کھڑی کی ہوئی رکاوٹوں کے پیش نظر اکثر نوٹیس چھاؤنی سے ساڑھے گیارہ بجے ہی نکل پڑیں۔ جو فوجی

دستے پہلے ہی شہر میں ریڈیو اسٹیشن، ٹیلی وژن، ٹیلیفون ایسیٹینج بجلی گھر اور سٹیٹ بینک وغیرہ کی حفاظت پر مامور تھے انہوں نے بھی قوت

سے پہلے اپنی پوزیشنیں سنبھال لیں۔

چھاؤنی سے جو پہلا دستہ روانہ ہوا اسے فارم گیٹ پر مزاحمت کا سامنا کرنا پڑا۔ یہ وہی جگہ ہے جہاں عوامی لیگ کے رضا کاروں

نے چیک پوسٹ قائم کر رکھی تھی۔ اب انہوں نے وہاں درخت کاٹ کر سڑک پر گرا دیے تھے اور خالی جگہوں پر پرائی کار اور روڑی کوٹنے

والا بے کار انجن کھڑا کر دیا تھا۔ ان رکاوٹوں کے پار سینکڑوں بنگالی زور زور سے ننگے نعرے لگا رہے تھے۔ میں نے جنرل

لنگا خاں کے بیڈ کوارٹر میں کھڑے ان نعروں کا شور سنا، دفعۃً گولیوں کی تڑاخ تڑاخ سنا دی۔ پھر نعرے بلند ہوئے، پھر گولیوں کی بوجھا ہونی

پھر نعرے، گولیوں کی سرسراہٹ اور چیخیں کھل گئیں۔ ایک شور برپا ہوا۔ ایک دو مرتبہ کسی خود کار ہتھیار کے چلنے کی آواز بھی آئی۔

کوئی پندرہ منٹ بعد بنگامر فرو ہونے لگا اور نعرے دم دم بڑھنے لگے معلوم ہوتا تھا ہتھیاروں نے نعروں پر برتری حاصل کر لی ہے۔

فوجی دستے رکاوٹ پار کر کے شہر کی طرف بڑھنے لگے۔ چاند دور کھڑا تھا اور چاندنی اس آہ و بکا میں اپنا روپ کھو بیٹھی تھی۔

اب جب کہ کارروائی خود بخود شروع ہو چکی تھی رات ایک بجے کا انتظار بے معنی تھا۔ دوزخ کے دروازے کھل چکے تھے۔ اس

دوزخ میں بھڑکنے والا پہلا شعلہ بلند ہوا تو ریڈیو پاکستان کی ریڈیائی لہر کے عین قریب شیخ مجیب الرحمن کی آواز سنا دی۔ اس نے عوامی جمہوریت

بنگلہ دیش کی آزادی کا اعلان کر دیا۔ آواز سے ظاہر ہوتا تھا کہ یہ پیغام پہلے سے ریکارڈ کیا ہوا ہے۔ اس کا مکمل متن بھارتی وزارت خارجہ

کی ویب سائٹ پر درج ہے:

شاید یہ میرا آخری پیغام ہو۔ میں آپ کو بتا دینا چاہتا ہوں کہ آج سے بنگلہ دیش آزاد ہے۔ میں عوام سے ایمل کرنا ہور



کہ وہ جہاں بھی ہوں اور جو مسائل بھی رکھتے ہوں غاصب فوج کا اس وقت تک تہہ بہ تہہ نہیں جب تک کہ بنگلہ دیش کی
 ادھرئی سے پاکستان کا آخری سپاہی گل نہیں جانا جب تک آپ محل کامیابی حاصل نہ کریں اپنی جنگ جاری رکھیں۔

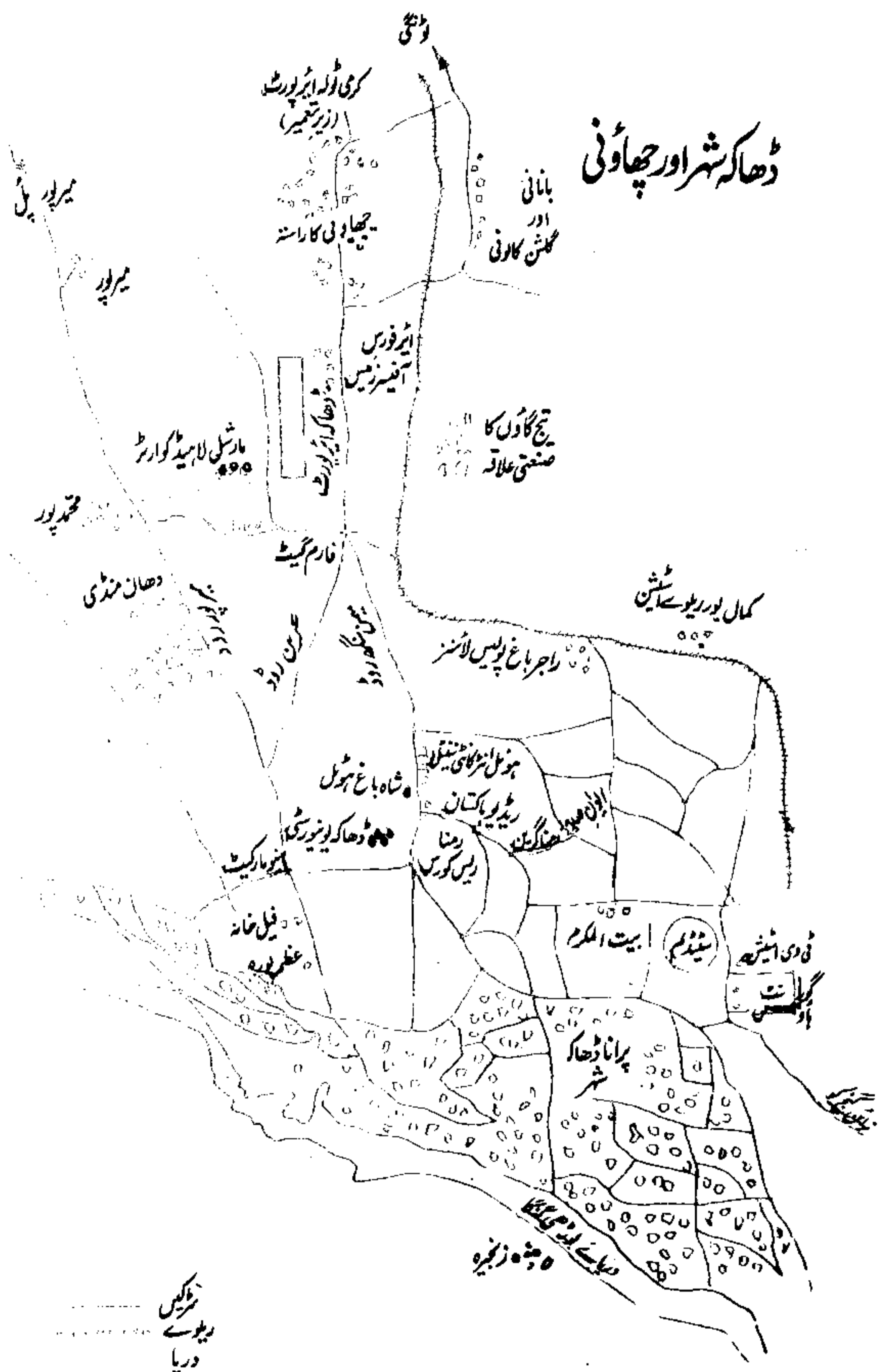
میں مجیب کا یہ نشر یہ نہ سن سکا؛ البتہ میں نے اس راکٹ لانچر کا دھماکا ضرور سنا جو کمانڈوز نے مجیب کے گھر جاتے ہوئے ایک
 زکاوٹ کو دور کرنے کے لیے فائر کیا تھا۔ اس کمانڈو پلانوں میں کمانڈنگ آفیسر لیفٹیننٹ کرنل زید۔ اے۔ خاں اور کپتی کمانڈر مہر بلال
 بنفس نفیس موجود تھے۔ جونہی وہ مجیب کے مکان کے قریب پہنچے وہاں گیٹ پر متعین حفاظتی رضا کاروں نے فائر کھول دیا۔ یہ رضا کار
 پیشہ ور سپاہیوں کا مقابلہ کیا کرتے۔ چند لمحوں میں بہت ہار بیٹھے اور کمانڈوز چار فٹ اونچی دیوار پھانڈ کر صحن میں اتر گئے۔ انہوں نے اپنی آمد
 کا اعلان ٹین گن کا ایک برسٹ (BURST) فائر کر کے کیا بلند آواز سے مجیب کو باہر آنے کو کہا گیا، مگر کوئی جواب نہ آیا۔ بالآخر وہ زبردستی
 اندر داخل ہوئے اور مجیب کے بیدروم کے پاس پہنچ گئے۔ دروازے کے باہر تالا پڑا تھا جسے گولی مار کر نیچے گرایا گیا۔ مجیب نے فوراً
 اپنے آپ کو گرفتاری کے لیے پیش کر دیا۔ ان کے لباس اور ٹوڈے یوں لگتا تھا کہ وہ پہلے سے تیار بیٹھے ہیں۔ سپاہیوں نے فوراً انہیں اور
 گھر کے باقی افراد کو حراست میں لے لیا اور جیپوں میں بٹھا کر زیر تعیر دارا حکومت ثانی میں لے آئے۔ چند منٹ بعد جنرل نکا خاں کے
 بیڈ کوارٹر میں کھڑی جیپ کے ڈائریس سیٹ پر ۵۰ بریگیڈ کے بریگیڈ میجر میجر جعفر کی صاف آواز سنائی دی: "بڑا پرندہ پھربے میں ہے۔۔۔
 دوسرے اپنے گھونسلوں میں موجود نہیں۔۔۔ اور۔"

جونہی پیغام ختم ہوا میری نظر بڑے پرندے پر پڑی جو سفید قمیص میں فوجی جیپ میں بیٹھا سفید چاندنی میں صاف دکھائی دے رہا تھا ایک
 صاحب نے جنرل نکا خاں سے کہا: کیا بڑے پرندے کو آپ کے حضور پیش کیا جائے؟ انہوں نے سختی سے کہا: میں اس کی شکل دیکھنے
 کا بھی روادار نہیں ہوں۔۔۔ مجیب الزحمن کو کھلی جیپ میں بٹھا کر شب باشی کے لیے چھاؤنی بھیج دیا گیا اور ان کے گھر پلو ملازموں کو شناخت
 کے بعد ربا کر دیا گیا۔

مجیب الزحمن نے اسیری کی پہلی رات آدمی سکول میں گزارا، پھر انہیں ایک اور جگہ منتقل کر دیا گیا اور تین چار روز بعد بندریہ روانی جانا
 کراچی بھیج دیا گیا۔ بعد میں جب مجیب الزحمن کی قسمت کا فیصلہ کرنے کے لیے بھیجیدگیاں پیدا ہونے لگیں اور غیر ملکی دباؤ بڑھنے لگا، تو میں
 نے اپنے عزیز دوست میجر بلال سے پوچھا: آپ نے کارروائی کی گراگرمی ہی میں اسے کیوں نہ لگا دیا؟ انہوں نے جواب دیا:
 "میرا بھی یہی ارادہ تھا، لیکن کارروائی سے ذرا پہلے جنرل بٹھہ نے مجھے ذاتی طور پر بلا کر حکم دیا تھا کہ مجیب کو زندہ پکڑ کر لانا ہے۔"
 جب مجیب الزحمن آدمی سکول میں آرام وہ بستر پر دراز تھے، تو دھاکہ شہر خانہ جنگی کی پلیٹ میں اچکا تھا۔ میں مارشل لا ہیڈ کوارٹر کے
 برآمدے میں کھڑا چار گھنٹے تک یہ جگر خراش منظر دیکھتا رہا۔ شعلے کبھی ماتمی لباس پہنے دھوئیں کے بادلوں میں منہ چھپاتے اور کبھی جھاگ کراسما
 میں پناہ لینے کی کوشش کرتے کبھی وہ چاند کی طرف لپکتے اور کبھی تاروں کو اپنی پتاسلنے کو دوڑتے، لیکن وہ کہیں بھی پہنچ نہ پاتے۔
 زمین سے اٹھتے، تھوڑی دور بلند ہوتے اور پھر بے اثر آہوں کی طرح ہوا میں تحلیل ہو جاتے۔ اس خپلی ہوئی چاندنی میں مہر عالم تاب تھر تھر
 کانپ رہا تھا کہ جب مجھے گواہی کے لیے بلا یا گیا، تو رت ذوالجلال کے حضور کیا جواب دوں گا؟

دھوئیں کے بلند ترین بادل اور پینکارتے ہوئے شعلے یونیورسٹی کمپس سے بلند ہو رہے تھے۔ اس کے علاوہ شہر کے دوسرے حصوں







بالخصوص روزنامہ "دی ٹریل" کی عمارت سے تباہی کے آثار نظر آ رہے تھے۔ بعض حصوں سے مختلف ہتھیاروں کے فائر کرنے کی آواز بھی سنائی دے رہی تھی۔

رات دو بجے کے قریب ایک بار پھر وائرلیس سیٹ نے ہمیں اپنی جانب متوجہ کیا۔ میں قریب ہی کھڑا تھا۔ پیغام سننے کے لیے ریسیور اٹھایا۔ دوسری طرف سے ایک فوجی کپتان بولا: "مجھے اقبال ہال اور جگن ناتھ ہال میں سخت مزاحمت کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔۔۔ یہ سننے ہی پاس کھڑے ایک اعلیٰ سرنے ریسیور میرے ہاتھ سے چھینا اور آواز گھنٹوں میں چلا کر کہا: "کیا مزاحمت مزاحمت لگا رہی ہے۔۔۔ کتنی دیر میں ٹارگٹ پر قبضہ کر لو گے؟۔۔۔ چار گھنٹے؟ بکو اس، لغو! تمہارے پاس کونسے ہتھیار ہیں؟ لاکٹ لانا پھر ریگائل لیس رائفل مارو؟۔۔۔ تو یہ کس کام کے لیے ہیں؟ انہیں استعمال کرو اور دو گھنٹے کے اندر اندر ٹارگٹ پر قبضے کی اطلاع دو۔"

حسب الحکم صبح چار بجے تک یونیورسٹی کی عمارت کو اقبال ہال اور جگن ناتھ ہال سمیت مسخر کیا جا چکا تھا۔ لیکن وہاں سے نھونٹنے والا بنگالی قومیت کا نظریہ کافی عرصے تک ناقابل تسخیر رہا۔۔۔ شاید نظریوں کو مسخر کرنا تو پوں اور ٹینکوں کے بس کی بات نہیں۔

صبح ہونے سے پہلے پہلے فوج کے مختلف دستوں نے شہر کے دوسرے حصوں میں بھی اپنا کام مکمل کر لیا۔ راجہ باغ میں پولیس کو اور فیل خانے میں ای پی آر کو غیر مسلح کر دیا گیا تھا۔ گلی کوچوں میں دہشت پھیلانے کے لیے ہوا میں گولیاں چلائی گئیں۔ سپاہی صرف ان عمارتوں میں داخل ہوئے جہاں سے گولی چلانے میں پہل کی گئی؛ ورنہ وہ سڑکوں اور گلیوں میں پھر کر حکومت کا اقتدار بحال کرتے رہے۔

۲۶ مارچ کو پو پھٹتے ہی مختلف دستوں نے اپنا اپنا مشن مکمل کرنے کی رپورٹ دی جنرل ٹکا خاں جو ساری رات لان میں ہمارے ساتھ بیٹھے رہے تھے، علی الصبح اندر گئے۔ جب تھوڑی دیر بعد وہ رومال سے عینک کا شیشہ صاف کرتے ہوئے باہر نکلے تو برآمدے میں میں کھڑا تھا۔ انہوں نے ادھر ادھر نگاہ دوڑائی اور خود کلامی کے لہجے میں فرمایا: "آٹھا؛ کوئی بھی تو نہیں۔۔۔ میں نے باہر سڑک پر نظر ڈالی تو وہاں وہاں بی نوع انسان کا نام و نشان تک نہ تھا، صرف ایک آوارہ گنا تھا جو دم دبائے شہر کی طرف بھاگا جا رہا تھا۔

دن چڑھے جھٹکوں کو ہولناکی سے لے کر بغاوت اور لڑائی سہا گیا۔ وہاں انہوں نے وی آئی پی لاؤنج میں گزشتہ رات کی کارروائی پر تبصرہ کرتے ہوئے ریگڈ سیرا باب سے کہا: "خدا کا شکر ہے کہ پاکستان بچ گیا ہے۔" کراچی سپینے پر انہوں نے پھر سی جملہ دہرایا۔ جب مسٹر بیٹویہ پرائیڈ تبصرہ کر رہے تھے، میں اس وقت یونیورسٹی کمپس میں ان قبروں کا جائزہ لے رہا تھا جن میں کئی کئی مردے ٹھونس دیے گئے تھے۔ میں نے وہاں پانچ سے پندرہ میٹر قطر کے تین گڑھے دیکھے۔ ان گڑھوں میں پڑی ہوئی مٹی ان خاک کے پتلوں کی بے بسی کا پتہ دے رہی تھی جو بے کفن ان میں دفن تھے۔ میں نے وہاں موجود فوجی افسروں سے ہلاک ہونے والوں کی تعداد پوچھی لیکن کسی نے سیدھا جواب نہ دیا۔

میں یونیورسٹی کا چکر لگاتا ہوا جگن ناتھ ہال اور اقبال ہال گیا جن کے متعلق میں نے مارشل لا ہیڈ کوارٹر کے برآمدے میں کھڑے کھڑے اندازہ لگایا تھا کہ وہ زمین بوس ہو چکے ہوں گے۔ یہاں آکر دیکھا تو دونوں عمارتیں جنوں کی ٹوں کھڑی تھیں۔ اقبال ہال پر دو اور جگن ناتھ ہال پر تین راکٹوں کے نشان تھے۔ ان کے بعض کمرے مچلے ہوئے تھے کہیں کہیں کوارٹر جل کر گر چکے تھے۔ تین جگہوں پر آدھ جلی رائفلوں کے ڈھیر تھے اور ایک آدھ جگہ فالتو کاغذ جھلس رہے تھے۔ اگرچہ نقصان سنگین تھا؛ تاہم اتنا نہ تھا جتنا میں نے قیاس کیا تھا۔

غیر ملکی اخباروں نے قیاس آرائیوں سے کام لیتے ہوئے کہا کہ یونیورسٹی میں ہزاروں افراد موت کے گھاٹ اتارے گئے۔ فوجی افسروں نے ہلاک شدگان کی تعداد ایک سو کے لگ بھگ بتائی۔ سرکاری طور پر صرف چالیس اموات کی تصدیق کی گئی۔

یونیورسٹی سے نکل کر میں شہر کے مختلف حصوں میں گیا۔ راتے میں کبھی کسی فنٹ پاتھ پر اور کبھی کسی گلی کے موڑ پر مجھے اٹکاؤٹ کا لاش نظر آئی۔ لاشوں کے وہ انبار جن کے قہقہے میں نے بیرونی اخبارات میں پڑھے مجھے کبھی نظر نہ آئے؛ تاہم میں نے جو کچھ دیکھا، اس سے مجھے تلی کا کٹنے لگی اور میرا دل بیٹھنے لگا۔ میں اس تجربے کو زیادہ دیر جاری نہ رکھ سکا اور وہاں سے چل دیا۔

پرانے شہر کی بعض گلیوں میں اب بھی رُکاوٹیں موجود تھیں، مگر ان پر پہرہ دینے والے غائب ہو چکے تھے۔ رات کی فائرنگ سے خوف زدہ ہو کر ہر فرد اپنے گھر میں دبک کر بیٹھ گیا تھا۔ مجھے کوئی شخص کبھی نظر نہ آیا؛ البتہ ایک گلی کی ٹکڑ پر ایک سایہ سا دکھائی دیا جو کسی بچھڑی ہوئی رُوح کی طرح بے قرار تھا۔ وہ دیکھتے ہی دیکھتے ساتھ والی گلی میں غائب ہو گیا۔

شہر کا چکر لگانے کے بعد میں دھان منڈی گیا جہاں مجیب الزمکن کا گھر واقع تھا۔ مجیب کے گھر دیرانی ہی دیرانی تھی۔ اسے دیکھ کر دشت یاد آ رہا تھا۔ مختلف اشیاء اور ادھر بکھری پڑی تھیں جس سے اندازہ ہوتا تھا کہ گھر کی بھرپور تلاشی لی گئی ہے۔ اس کباڑ میں کوئی قابل فکر شے نظر نہ آئی، البتہ یہ کہ رابندر ناتھ ٹیگور کی قد آدم تصویر اوندھے منہ پڑی فرش چاٹ رہی تھی۔ میں نے اسے سیدھا کر کے دیکھا۔ شیشے کا ٹیم کئی جگہوں سے ٹوٹ چکا تھا، مگر اس کی شبیہ کو کوئی نقصان نہ پہنچا تھا۔

مکان کا بیرونی گیٹ بھی اپنی آرائش سے محروم ہو چکا تھا۔ مجیب الزمکن کے غیر قانونی دور حکومت کے دوران سیاہ رنگ کے گیٹ پر پیل کا بنا ہوا بنگلہ دیش کا نقشہ نصب کر دیا گیا تھا اور اس کے ارد گرد چھ ستارے بنا کر عوامی لیگ کے چھ نکات کی نمائندگی کی گئی تھی۔ اب گیٹ پر صرف وہ سوراخ نظر آ رہے تھے جہاں یہ آرائشی نقش نصب کیے گئے تھے۔ چند دن کی شان و شوکت آنا فنا غائب ہو چکی تھی۔

دوپہر کے کھانے کے وقت میں واپس چھاؤنی چلا آیا۔ یہاں کا ماحول کیسے مختلف تھا۔ فوجی کارروائی سے بہت سے فوجی افسروں کے دل ہلکے ہو گئے تھے۔ فضا کا بوجھل پن غائب ہو چکا تھا۔ آفیسر زمیں میں ہلکی چلکی گفتگو میں اطمینان اور سکون کی لہر بہ رہی تھی۔ کیپٹن جو دھری نے کینو پھیلے ہوئے کہا: "بنگالیوں کو نوب سبق سکھا دیا گیا ہے۔ کم از کم ایک نسل تک تو سرنہیں اٹھائیں گے۔" یہ بھڑک نے گرہ لگائی، جی ہاں، ان کی تاریخ شاید ہے کہ وہ صرف طاقت کی زبان سمجھتے ہیں۔

اپریشن مسیح لائٹ (۲)

ڈھاکہ تو ایک رات کی مارکٹائی سے سُن ہو گیا، لیکن صوبے کے باقی حصوں میں حکومت کی حاکمیت بحال کرنے میں خاصی دیر لگی۔ جن علاقوں میں خصوصی مزاحمت کا سامنا کرنا پڑا، ان میں چٹاگانگ، راجشاہی اور پینہ شامل تھے۔ چٹاگانگ میں مغربی پاکستان سے تعلق رکھنے والے فوجیوں کی تعداد چھ سو کے لگ بھگ تھی جو ۲۰ بلوچ سے تعلق رکھتے تھے۔ یہ پٹن مشرقی پاکستان میں عرصہ طاعت پر اکرانے کے بعد بحری راستے سے کراچی روانہ ہونے والی تھی۔ اس کا ہر اول دستہ پہلے ہی کوچ کر چکا تھا۔ باقی نفری باری کا انتظار کر رہی تھی۔ اس کی کمان لیفٹیننٹ کرنل فاطمی کے ہاتھ میں تھی جنہیں میجر جنرل خادم راجہ چند روز پہلے یہ ہدایات دے چکے تھے کہ وہ کومیلا سے مکہ پہنچنے تک چٹاگانگ کو ہاتھ سے نہ جانے دیں۔

چٹاگانگ میں بنگالی نفری پانچ ہزار کے قریب تھی جن میں سے آدھے افراد ایٹ بنگال سنٹر سے تعلق رکھتے تھے۔ وہ بریگیڈیئر مجھدار کے تربیت یافتہ تھے۔ فوجی اور سیاسی لحاظ سے۔ ان میں سے اکثر نے اپنی ٹریننگ چند مہینے پہلے مکمل کر لی تھی مگر بریگیڈیئر صاحب نے سیاسی فضا بدلتے دیکھ کر انہیں "جہاز کی نایابی" کے بہانے روک لیا تھا۔ ان کے علاوہ چٹاگانگ میں ایک نئی بنگالی پلٹن ۸ ایٹ بنگال کے نام سے کھڑی کی گئی تھی جس کے سیکنڈ ان کمانڈر (یا نائب سالار) میجر ضیاء الرحمن تھے۔ نیم فوجی تنظیم ایٹ پاکستان رائفلز کا سیکٹر ہیڈ کوارٹر اور ایک ونگ بھی یہیں مقیم تھا۔ بنگالی پولیس اور سابق فوجی اور عوامی لیگ کے رضا کار اس کے علاوہ تھے۔

فوجی طاقت کے لحاظ سے چٹاگانگ میں جوڑ برابر کا نہ تھا۔ بظاہر یہی دکھائی دیتا تھا کہ پانچ ہزار بنگالی چھ سو غیر بنگالیوں کو فوراً ٹرپ کر جائیں گے اور یہ اہم بندرگاہ اور شہر باغیوں کے قبضے میں چلے جائیں گے۔ شروع شروع میں جو خبریں ڈھاکہ پہنچیں وہ واقعی تشویشناک تھیں، مگر اتنا یقین تھا کہ ۲۰ بلوچ کی نفری ابھی تک ڈٹی ہوئی ہے، مگر کب تک؟ کیا یہ چند سو سپاہی کومیلا سے مکہ پہنچنے تک حالات کا مقابلہ کر سکیں گے؟

اُدھر کومیلا سے آنے والی مکہ کا یہ حال تھا کہ جو نئی فوجی دستے کومیلا سے چند میل جنوب میں فینی کے قریب صوبہ پور کے مقام پر پہنچے، باغیوں نے لکڑی کا پل اڑا کر ان کی پیش قدمی روک دی۔ اس طرح چٹاگانگ میں میجر ضیاء الرحمن اور ان کے ساتھیوں کو اتنا وقت

۱۰۔ یہ وہی میجر ضیاء الرحمن ہیں جنہوں نے چند روز بعد پاکستانی فوج کے خلاف غم بغاوت بلند کیا اور چٹاگانگ، راجشاہی اور پینہ میں ڈیڑھ ماہ تک حکومت کی حاکمیت بحال کرنے میں خاصی دیر لگی۔ جن علاقوں میں خصوصی مزاحمت کا سامنا کرنا پڑا، ان میں چٹاگانگ، راجشاہی اور پینہ شامل تھے۔ چٹاگانگ میں مغربی پاکستان سے تعلق رکھنے والے فوجیوں کی تعداد چھ سو کے لگ بھگ تھی جو ۲۰ بلوچ سے تعلق رکھتے تھے۔ یہ پٹن مشرقی پاکستان میں عرصہ طاعت پر اکرانے کے بعد بحری راستے سے کراچی روانہ ہونے والی تھی۔ اس کا ہر اول دستہ پہلے ہی کوچ کر چکا تھا۔ باقی نفری باری کا انتظار کر رہی تھی۔ اس کی کمان لیفٹیننٹ کرنل فاطمی کے ہاتھ میں تھی جنہیں میجر جنرل خادم راجہ چند روز پہلے یہ ہدایات دے چکے تھے کہ وہ کومیلا سے مکہ پہنچنے تک چٹاگانگ کو ہاتھ سے نہ جانے دیں۔



مل گیا کہ وہ عدوی برتری سے فائدہ اٹھا سکیں؛ چنانچہ انہوں نے شہر اور چھاؤنی کے کئی حصوں پر قبضہ جمایا۔ چٹاگانگ ریڈیو اسٹیشن تو بچ گیا، کیونکہ وہاں پاکستانی سپاہی متعین تھے، لیکن چٹاگانگ / کپتانی روڈ پر واقع ریڈیو ٹرانسمیٹرز جہاں ایسے حفاظتی انتظامات نہ تھے، ہینرل کے زیر اثر چلے گئے۔ ان ٹرانسمیٹروں کے احاطے میں ایک چھوٹی سی کوٹھڑی تھی جس میں ایسے آلات نصب تھے جن کی مدد سے ایئر بی نشریات شروع کی جاسکتی تھیں۔ وہیں سے میجر ضیاء الرحمن نے بنگلہ دیش کی آزادی کا اعلان کیا۔

۲۵ اور ۲۶ مارچ کی درمیانی رات کو ڈھاکہ میں میجر جنرل خادم حسین راجہ کو اطلاع ملی کہ کومیلہ سے روانہ ہونے والے فوجی دستے پل ٹوٹنے کی وجہ سے فیٹی کے قریب رُک گئے ہیں۔ انہوں نے کومیلہ کے بریگیڈ کمانڈر بریگیڈیئر اقبال شفیع کو ٹیلیفون پر حکم دیا کہ وہ مذکورہ پل کو باغیوں کے قبضے میں رہنے دیں اور خود نالہ پار کر کے آگے بڑھ جائیں۔ بریگیڈیئر اقبال شفیع کے لیے مسئلہ یہ تھا کہ وہ پل سے ہٹ کر نالے کے پار کیسے جائیں؛ کیونکہ ایسی صورت حال سے نپٹنے کا پہلے سے کوئی بندوبست نہیں کیا گیا تھا؛ چنانچہ انہوں نے پل پر دوبارہ قبضہ کرنے پر اپنی توجہ مرکوز رکھی اور اگلی صبح دس بجے اپنے مقصد میں کامیاب ہو گئے۔

بریگیڈیئر اقبال شفیع فوجی دستوں کو لے کر چٹاگانگ کی طرف بڑھنے لگے جہاں ان کی اشد ضرورت تھی، مگر شہر سے بیس کلومیٹر دور کومیرا کے مقام پر باغیوں نے ان کا راستہ روک لیا۔ فوجی دستے کے ہر اول گروہ میں سے گیارہ افراد جن میں پلٹن کے کمانڈنگ افسر بھی شامل تھے، شہید ہو گئے۔ اس اچانک افتاد سے ایسی جگہ رچی کہ اس دستے کا کومیلہ اور ڈھاکہ سے رابطہ منقطع ہو گیا۔ جی۔ او۔ سی ڈھاکہ میں بیٹھے سوچ رہے تھے کہ اس دستے کا کیا بنا ہے؟ کیا وہ سارے کے سارے شہید ہو گئے ہیں؟ اگر کچھ بچے ہیں، تو وہ کہاں ہیں؟ اس ملک کی ناکامی سے چٹاگانگ کی صورت حال اور بھی بگڑنے کا امکان تھا؛ کیا پتہ کس وقت وہاں چند سو پاکستانی سپاہی باغیوں کے غیظ و غضب کا نشانہ بن جائیں؟

جنرل راجہ جب گندہ فوجی دستے سے براہ راست یا بالواسطہ طور پر مواصلاتی رابطہ قائم نہ کر سکے، تو ہیلی کاپٹر لے کر خود اسے تلاش کرنے نکلے۔ پہلے وہ چٹاگانگ گئے تاکہ کرنل فاطمی سے وہاں کی صورت حال معلوم کر سکیں۔ جونہی ان کا ہیلی کاپٹر ۲۰ بلوچ میں اترنے کے لیے نیچے آیا، چٹاگانگ کی پست قامت پہاڑیوں سے اچانک اس پر فائرنگ ہوئی۔ دو گولیاں ہیلی کاپٹر کو لگیں، مگر زیادہ نقصان نہ ہوا۔ جنرل راجہ بحفاظت ۲۰ بلوچ میں اتر گئے۔ وہاں کرنل فاطمی نے انہیں بتایا کہ ان کی پلٹن نے باغیوں کا ڈٹ کر مقابلہ کیا ہے؛ پچاس کو ہلاک اور کوئی پانچ سو افراد کو قیدی بنا لیا ہے جس سے ایسٹ بنگال سٹر محفوظ ہو گیا ہے؛ البتہ شہر اور چھاؤنی کے کئی حصوں پر باغی قابض ہیں۔

جنرل راجہ نے فیصلہ کیا کہ وہ چٹاگانگ سے کومیلہ کی طرف سڑک کے اوپر پرواز کریں گے تاکہ راستے میں جہاں کہیں فوجی دستے نظر آئے وہاں اتر جائیں۔ جب وہ چٹاگانگ سے چلنے لگے، تو ایک ستم رسیدہ خاتون جس کی گود میں بچہ تھا ان کے پاس آئی اور چٹاگانگ سے نکلنے کے لیے ان کی مدد مانگنے لگی۔ یہ خاتون مغربی پاکستان سے تعلق رکھنے والے ایک افسر کی بیوی تھی اور ہنگاموں میں کارواں سے جدا ہو گئی تھی جنرل صاحب نے اسے ہیلی کاپٹر میں بٹھالیا۔

ہیلی کاپٹر بھر لیاقت بخاری اڑا رہے تھے جو اپنی بہادری اور پیشہ ورانہ مہارت کی وجہ سے تمام حلقوں میں احترام کی نظروں سے دیکھے جاتے تھے۔ ان کے ساتھ دوسرے پائلٹ میجر پیڑتے جو اپنے کام میں بہت طاق تھے۔ یہ دونوں ہوا باز، جنرل خادم راجہ بے بس خاتون اور اس کے بچے کو لے کر بخیریت چٹاگانگ سے نکل آئے۔ ہیلی کاپٹر کومیلہ کی طرف سڑک کے ساتھ ساتھ پرواز کرنے لگا



اور جنرل راجہ ایک چھوٹا سا فوجی نقشہ اپنے گھٹنوں پر پھیلائے اندازہ لگاتے رہے کہ گمشدہ فوجی دستہ اس وقت کہاں ہوگا۔ انہوں نے متوقع جگہ کے قریب پہنچ کر باہر جھانکا، مگر نچلے بادلوں کی وجہ سے کچھ نظر نہ آیا، تو مہاجر لیا قریب بجاری سے کہا کہ وہ بادلوں کے نیچے جائیں تاکہ سڑک نظر آسکے بجاری نے فوراً تعمیل کی، مگر وہ جوں ہی نیچے گئے، گولیوں کی ایک بوچھاڑ ہوئی۔ پائلٹ نے جہتی تحریک پر فوراً ہیملی کاپٹر اوپر اٹھایا۔ ایک گولی ہیملی کاپٹر کے پچھلے حصے میں لگی اور دوسری ایندھن کی ٹینکی سے چند انچ دور لوہے کی چادر کو چیرتی ہوئی نکل گئی۔ اس کے پاس ہی وہ عورت اپنے بچے سمیت بیٹھی تھی، مگر اللہ تعالیٰ کے فضل سے بچ گئی۔ مہاجر بجاری نے جنرل راجہ سے پوچھا: سر، کیا ایک اور کوشش کروں؟ انہوں نے فرمایا: نہیں، اب سیدھے ڈھا کہ چلو۔

اسی اثنا میں مہاجر جنرل بیٹھنے جو اسپیشل سروس گروپ (کمانڈوز) کے ماہر استعمال کی شہرت رکھتے تھے، ڈھا کہ سے ۳ کمانڈو ٹیمیں کا ایک دستہ فضائی راستے سے چٹاگانگ بھیجا تاکہ وہ زمینی راستے سے بریگیڈیئر اقبال شفیع کے ساتھ رابطہ قائم کر سکے۔ یہ دستہ بخیریت چٹاگانگ پہنچ گیا، لیکن اسے کچھ علم نہ تھا کہ بریگیڈیئر اقبال شفیع کہاں ہیں اور ان تک پہنچنے کے لیے کونسا راستہ مناسب ہے؟ اتنے میں پتہ نہیں کہاں سے ایک بنگالی افسر آگے بڑھا۔ اس نے پاکستانی دستے کے کمانڈنگ آفیسر سے کہا: میں کیپٹن حمید ہوں، سری میں ہوتا ہوں۔ چٹاگانگ میں اپنے والدین کی خبر لینے آیا ہوں۔ اگر آپ اجازت دیں، تو میں آپ کی رہنمائی کے لیے تیار ہوں۔ اس کی پیشکش کو فوراً قبول کر لیا گیا اور یہ فوجی دستہ کیپٹن حمید کے بتائے ہوئے راستے پر چلتے ہوئے چٹاگانگ کو میلارڈ کی طرف روانہ ہو گیا۔ شہر سے باہر سڑک کے دونوں جانب چھوٹی چھوٹی پہاڑیاں ہیں۔ جب وہ ان پہاڑیوں کے درمیان پہنچے، تو اچانک دونوں جانب سے ان پر گولیاں برسنے لگیں۔ چھاپہ مار دستے نے پہنچنے کی بہت کوشش کی، لیکن بھاری نقصان اٹھانا پڑا۔ تیرہ افراد ہلاک ہو گئے جن میں ایک کمانڈنگ آفیسر، دو نوجوان افسر، ایک جے سی او اور نو سپاہی شامل تھے۔

اس دستے کے علاوہ ۲۰ بلوچ کا ایک گروہ بھی اسی مشن پر روانہ کیا گیا، مگر یہ بھی آگے نہ بڑھ سکا۔ جب کرنل فاطمی سے اس ناکامی کی وجہ پوچھی گئی، تو انہوں نے کہہ دیا کہ راستے میں باغیوں کی طرف سے شدید مدافعت تھی۔ گویا یہ دونوں کوششیں ناکام ہو گئیں۔

ادھر بریگیڈیئر اقبال شفیع پیش قدمی کرنے کی سرٹوز کوشش کر رہے تھے۔ انہوں نے کوئٹہ کے مقام پر تعطل کے دوران کوئٹہ سے چھوٹی توپوں کی ایک بیٹری منگوائی۔ یہ توپیں ان کے پاس ۲۷ مارچ کی شام کو پہنچیں اور اگلی صبح باغیوں پر حملہ کر کے مدافعت توڑ دی گئی۔ چٹاگانگ شہر کی طرف پیش قدمی کے لیے راستہ کھول لیا گیا۔

راستے میں اس تاخیر کے دوران چٹاگانگ شہر میں حاجی کیمپ کے قریب اصفہانی جوٹ ملز کی کالونی پر قیامت گزر گئی۔ وہاں باغیوں نے بے یار و مددگار مردوں، عورتوں اور بچوں کو کلب کی عمارت میں جمع کر کے انہیں ٹکڑے ٹکڑے کر دیا۔ اس سفاکانہ قتل کے چند روز بعد میں اس عمارت میں گیا۔ اس کے فرش اور دیواروں کے نچلے حصے پر خون ہی خون تھا۔ عورتوں کے لباس اور بچوں کے کھلونے خون سے تر تھے۔ ساتھ والی رہائشی عمارت میں بستر کی چادریں اور گدے خون خشک ہونے کی وجہ سے اکڑ گئے تھے۔

۲۹ مارچ کو بریگیڈیئر اقبال شفیع اور چٹاگانگ کے دستوں میں ملاپ کی خبر ملی۔ ڈھا کہ کے آپریشن روم میں تشکر فوجی افسروں کی جان میں جان آئی، مگر اتنے میں اصفہانی کالونی کے بے گناہ باسی اپنی جان پر کھیل چکے تھے۔

اب تک چٹاگانگ میں قابل ذکر کامیابی صرف ایک بحری جہاز سے سامان اتروانے تک محدود تھی۔ یہ جہاز وسط مارچ میں



مغربی پاکستان سے دفاعی سامان لے کر پہنچا تھا۔ لیکن عوامی لیگ کے کارکنوں نے اس سے سامان اتارنے کی اجازت نہ دی تھی کیونکہ۔ بقول ان کے۔ اس کی مدد سے ۲۷ کروڑ بنگالیوں کی آواز کو دہانا مقصود تھا۔ مجیب الرحمن کے پچیس روزہ دور اقتدار میں فوجی انتظامیہ نے زبردستی سامان اتارنے کی کوشش نہ کی، البتہ جب پالیسی بدلی، تو لاگ ایریا کمانڈر بریگیڈیئر ایم۔ ایچ۔ انصاری کو فضائی راستے، ڈھاکہ سے چٹاگانگ پہنچایا گیا۔ انہوں نے چٹاگانگ میں موجود وسائل جن میں سیاہ فوج کی ایک پلٹن، چند ہکی۔ توپیں اور دو ٹینک شامل تھے، جمع کر کے ایک ٹاسک فورس (TASK FORCE) ترتیب دی۔ بحریہ نے ایک تباہ کن جہاز (DESTROYER) اور چند گن بوٹ (GUN BOATS) مہیا کیں۔ ان کی مدد سے بریگیڈیئر انصاری نے نازک مسئلے کو حل کر دیا بعد ازاں ایک اور پلٹن ڈھاکہ سے چٹاگانگ پہنچ گئی اور بریگیڈیئر انصاری کے وسائل بہتر ہو گئے۔

اگرچہ وسائل کے اعتبار سے حالت پہلے سے بہتر ہو گئی تھی، مگر چٹاگانگ کو باغیوں سے پاک کرنے کا مرحلہ ابھی باقی تھا۔ باغیوں کا زیادہ تر اجتماع ایسٹ پاکستان رائفلز کے سیکٹر ہیڈ کوارٹر، ضلع کچھری میں ریزرو پولیس لائنز اور کپتانی روڈ پر ٹرانسمیٹر بلڈنگ میں تھا۔ سب سے پہلے سچر جنرل منٹھ نے ٹرانسمیٹر کی عمارت سے باغیوں کو نکالنے کے لیے ایس ایس جی (کمانڈوز) کا ایک دستہ روانہ کیا۔ اس دستے نے اپنے حریف تک پہنچنے کے لیے دریائی راستہ اختیار کیا تاکہ ایک پہلو سے اچانک حملہ کیا جائے، لیکن ابھی وہ کشتیوں ہی میں تھے کہ ان پر فائر کھل گیا۔ وہ نہ بھاگ سکتے تھے اور نہ ڈٹ کر مقابلہ کر سکتے تھے۔ سولہ افراد موقع ہی پر ہلاک ہو گئے۔

ادھر ۲۰ بلوچ کا ایک اور دستہ لیفٹیننٹ کرنل فاطمی کی قیادت میں ٹرانسمیٹر بلڈنگ کی طرف روانہ کیا گیا، لیکن یہ اپنے ٹارگٹ تک نہ پہنچ سکا کیونکہ جب معمول کرنل فاطمی راستے ہی میں باغی افراد سے الجھنے میں کامیاب ہو گئے تھے۔ آخر کار پاکستان ایئر فورس کے دو سیبر طیاروں (ایف۔ ۸۶) نے کام چکایا۔ انہوں نے بھرپور فضائی حملہ کر کے باغیوں کو وہاں سے بھگا دیا۔ چند روز بعد وہاں گیا، ٹرانسمیٹر بلڈنگ کے ارد گرد مضبوط دفاعی لائن میں جا بجا خندقیں کھدی تھیں۔ ان خندقوں کو گہری نالیوں کے ذریعے ایک دوسرے سے ملا دیا گیا تھا۔ سارا دفاعی انتظام نہایت پیشہ ورانہ مہارت سے مکمل کیا گیا تھا۔ ہوائی حملے سے ٹرانسمیٹر تباہ ہوئے تھے نہ عمارت منہدم ہوئی تھی، البتہ گولیوں کے چند نشان ابھی تک گواہی دے رہے تھے کہ یہ عمارت تازہ تازہ کسی امتحان سے گزری ہے۔

دوسرا اہم ٹارگٹ ایسٹ پاکستان رائفلز کا سیکٹر ہیڈ کوارٹر تھا جہاں ایک ہزار مسلح باغیوں نے حصار بنا رکھا تھا۔ ان کے مورچے جو بلند جگہ پر واقع تھے، پشتوں کے ساتھ ساتھ بنائے گئے تھے۔ ہلکے ہتھیاروں سے فائر کرنے کے لیے ان پشتوں میں ضروری سوناخ اور درزیں بھی رکھی گئی تھیں۔ پاکستانی سپاہیوں کو ان دفاعی انتظامات کا پہلے سے علم تھا، چنانچہ انہوں نے ایک پوری پلٹن (تقریباً چھ سو افراد) دو ٹینکوں اور ایک توپ سے ان پر حملہ کیا۔ ساحل کے پاس سے نیوی کے ایک جہاز (DESTROYER) اور دو مسلح کشتیوں (GUN BOATS) نے ان کی مدد کی۔ لڑائی کوئی تین گھنٹے جاری رہی۔ بالآخر سرکش بنگالی مورچے چھوڑ کر بھاگ نکلے۔ ان میں سے کئی ہلاک ہو گئے۔ یہ فتح آپریشن سرچ لاسٹ کے چھٹے دن یعنی ۳۱ مارچ کو نصیب ہوئی۔

اس کے بعد ریزرو پولیس لائن کی باری تھی۔ اطلاعات کے مطابق یہاں پولیس، سابق فوجی، عوامی لیگ کے رضا کار اور دیگر سرکش عناصر جمع تھے جن کے پاس ایک اندازے کے مطابق بیس ہزار انٹیلیجینس تھیں۔ یہاں بھی پاکستان آرمی کی ایک پلٹن نے حملہ کیا، مگر مدافعت کمزور نکلی اور وہ ابتدائی کارروائی ہی میں مورچے چھوڑ کر بھاگ گئے۔

ان مقامات پر مزاحمت کو فرو کرنے میں ریگڈیٹرز انصاری نے اہم کردار ادا کیا۔ ان کی خدمات کے اعتراف میں انہیں کچھ عرصے بعد بلال جرأت کا اعزاز اور مسیح حزنل کا عمدہ عطا کیا گیا۔ (قبل ازیں وہ اس ترقی سے محروم رہ گئے تھے)۔

مارچ کے آخر تک چٹاگانگ میں اہم فوجی کارروائیاں ختم ہو گئیں، مگر اکاؤنٹا جھڑپیں جاری رہیں۔ چٹاگانگ شہر اور چھاؤنی پر مکمل قبضہ ۶ اپریل کے لگ بھگ بحال ہوا۔

دیگر دو قصبے جہاں باغیوں کو ابتدائی دور میں برتری حاصل تھی، کشتیا اور پنبہ تھے۔ آئیے ذرا ان مقامات کا حال بھی دیکھتے چلیں:

کشتیا، جیسور سے شمال مغرب میں نوے کلومیٹر کے فاصلے پر واقع ہے جو کئی ٹرکوں اور ریلوے لائن کا سنگم ہے۔ یہاں عام حالات میں پاکستانی فوج مقیم نہ تھی، مگر فوجی کارروائی کے پیش نظر جیسور سے ایک کمپنی (تقریباً ڈیڑھ سو سپاہی) کشتیا بھیجی گئی تاکہ وہاں اپنی موجودگی کا تاثر قائم کر سکے۔ یہ کمپنی اپنے ساتھ صرف چھوٹے ہتھیار اور محدود مقدار میں ایمونیشن لے گئی، کیونکہ اس کا خیال تھا کہ وہاں اندرونی امن و امان بحال رکھنے کے لیے بھاری ہتھیاروں اور وافر ایمونیشن کی ضرورت نہیں۔ اس تاثر کی بڑی وجہ یہ تھی کہ اسے مکمل معلومات فراہم کیے بغیر فوراً جیسور سے روانہ کر دیا گیا تھا۔

کمپنی کمانڈر نے اپنی کمپنی کو مختلف گروہوں میں تقسیم کر کے اسے سٹیلیفون ایسیجینج، وی۔ایچ۔ایف سٹیشن اور دیگر اہم مقامات پر لگا دیا۔ چند چھوٹی چھوٹی ٹولپوں کو عوامی لیگ کے مقامی قائدین کو گرفتار کرنے کے لیے بھیج دیا۔ قائدین تو ہاتھ نہ آئے، البتہ پہلے روز ہی ایک جھڑپ میں پانچ باغیوں کو ٹھکانے لگا کر اپنی موجودگی کا سکہ جما دیا۔ اس کے بعد صرف کر فیو نافذ کرنا تھا جس میں کوئی دشواری پیش نہ آئی۔ اگلے دو روز بھی امن و امان سے گزر گئے۔

۲۸ مارچ کو ساڑھے نو بجے رات مقامی سپرنٹنڈنٹ پولیس، کمپنی کمانڈر شعیب کے پاس آیا۔ خوف کے مارے اس کا رنگ زرد تھا۔ اس نے ہانپتے ہوئے بتایا کہ کشتیا سے کوئی سولہ کلومیٹر دور چوآڈنگا کے سرحدی قصبے میں بہت سے باغی جمع ہیں اور دھمکی دے رہے ہیں کہ جس کسی نے پاکستانی فوج سے تعاون کیا، اسے قتل کر دیا جائے گا۔ ایس پی نے یہ اطلاع بھی دی کہ وہ کسی وقت رات کو کشتیا پر بلبول دیں گے۔ میجر شعیب نے اپنی تمام پلانٹوں کو چوکس رہنے کی ہدایت بھیج دی، مگر سپاہیوں نے کسی غیر معمولی حفاظتی اقدام کی ضرورت محسوس نہ کی۔ آخر بنگالی ہی تو ہیں شالے نیسٹ میں گئے ان سے۔

رات کے پچھلے پہر کوئی لینے چار بجے، کشتیا پر گولے برسے لگے۔ یہ فوسٹ ایسٹیشن ہے۔ وہاں ۵۰ فوجی تھے۔ انہوں نے اپنے تمام ہتھیاروں سے تیار رہ کر چھاؤنی سے ٹریننگ کے ہارنے باہر بھیجا گیا تھا تاکہ چھاؤنی میں مزاحمت کا باعث نہ بنے۔ ای ای بی کے ساتھ بھارتی سیکورٹی فورسز ڈبی۔ایس۔ایف کے سپاہی بھی مل گئے۔ (بعد میں پاکستانی فوج نے بی ایس ایف کے چار سپاہی جیسور کے باہر گرفتار کر لیے تھے)۔ حملے کا ہدف وہ اسلحہ خانہ تھا جسے تین روز پہلے پاکستانی سپاہیوں نے پولیس سے چھین کر اس پر قبضہ کیا تھا۔ اس اسلحہ خانے سے ملحق ایک جج کا سہ منزلہ مکان تھا۔ باغی اس مکان کی چھت پر چڑھ گئے اور وہاں سے اسلحہ خانے میں گولیاں برسائی شروع کر دیں۔ ہمارے سپاہی اسی عمارت میں پڑے رہے، کیونکہ باہر نکلنے سے زیادہ نقصان اٹھانے کا خطرہ تھا۔ جب سورج طلوع ہوا

۱۔ VERY HIGH FREQUENCY ڈائریسٹیشن جو زیادہ فاصلے تک مواصلاتی رابطے کا کام دیتا ہے۔

۲۔ یہ ہماری بارڈر پولیس یا ریجنل کی طرح نیم فوجی تنظیم ہے، مگر فوجی فرائض نبھانے کے بھی اہل بھی جاتی ہے۔



تو ہمارے پانچ سپاہی صحن میں شہید پڑے تھے۔ نو بجے تک شہیدوں کی تعداد گیارہ ہو گئی۔ آئندہ نصف گھنٹے میں مزید نو افراد کام آئے۔ چاروں میں سے صرف چند سپاہی جان بچا کر کمپنی ہیڈ کوارٹر پہنچ سکے۔ اس تباہی کی دو بڑی وجوہ تھیں۔ ایک ایمنیشن کی کمی اور دوسرے حفاظتی اقدامات سے لاپرواہی۔

ہماری دوسری دو چوکیاں سلیفون اسپینج اور وی۔ ایچ۔ ایف اسٹیشن میں واقع تھیں۔ ان پر بھی بیک وقت آناشدید حملہ ہوا کہ جغرافیائی قرب کے باوجود ایک چوکی دوسری چوکی کی مدد کو نہ پہنچ سکی۔ خود کمپنی ہیڈ کوارٹر مردہ خانے میں تبدیل ہو چکا تھا۔ وہاں گیارہ فوجی ایک جگہ ہلاک پڑے تھے اور چودہ دوسری جگہ۔ وہاں ساٹھ افراد میں سے پچیس شہید ہو چکے تھے۔

اس تباہی کے پیش نظر جیسور بریگیڈ ہیڈ کوارٹر میں فوری مدد کے لیے پیغام بھیجا گیا اور بلا تاخیر فضائیہ کی امداد پر زور دیا گیا۔ بار بار پیغامات کے جواب میں یہ مایوس کن جواب موصول ہوا: "فوجی ملک خارج از امکان ہے، کیونکہ ساری نفری پہلے ہی کسی نہ کسی کارروائی میں مصروف ہے اور فضائی مدد موسم کی خرابی کی وجہ سے ممکن نہیں۔ . . . خدا حافظ!"

میجر شعیب نے اپنی کمپنی کے تشریحی سپاہیوں کو جمع کیا۔ پتہ چلا کہ ڈیڑھ سو افراد میں سے صرف ۶۵ زندہ بچے ہیں۔ انہوں نے فوراً کشتیاں چھوڑ کر جیسور جانے کا فیصلہ کیا۔ اس سفر کے لیے ایک بڑا ٹرک ایک ڈانچ اور چھ جیپیں اکٹھی کیں۔ روانگی رات کی تاریکی میں ہوئی۔ سب سے اگلی جیپ میں میجر شعیب خود سوار تھے۔ کشتیاں سے چوبیس پچیس کلومیٹر دور اچانک میجر شعیب کی جیپ کی ٹرک پر چلتی چلتی ایک کھائی میں جنس گئی جہاں باغیوں نے ٹرک کاٹ کر اوپر سے دھانپ دی تھی۔ جونہی قافلہ رکا، ٹرک کے دونوں جانب سے گولیاں برسنے لگیں۔ پاکستانی سپاہی گولیوں کی بوچھاڑ میں ٹرکوں سے کود کر اڑنے کے لیے بھاگے، مگر میجر شعیب سمیت ان میں سے اکثر وہیں شہید ہو گئے۔ صرف نو افراد رینگ رینگ کر زندہ نکلنے میں کامیاب ہوئے۔ ان میں سے بھی بعض راستے میں پکڑے گئے اور باغیوں اور دیہاتیوں نے مل کر انہیں ذلیل و خوار کیا۔ ننگا بازاروں میں چلویا اور طرح طرح کی اذیتیں دے کر ہلاک کر دیا۔

اب مختصر پینہ کا حال بھی سن لیں۔ پینہ کے قریب راجشاہی میں ہماری ۲۵ پنجاب متعین تھی۔ اس کی ایک کمپنی کوئی سو سو اترلی "اپنی موجودگی کا احساس دلانے کے لیے" پینہ روانہ کی گئی۔ یہ کمپنی بھی کشتیاں والی کمپنی کی طرح صرف امن و امان برقرار رکھنے کے لیے آئی اور اپنے ساتھ چھوٹے ہتھیار، تھوڑا سا ایمنیشن اور تین دن کا راشن لائی۔ یہاں بھی کمپنی کمانڈر نے زیرِ کمان سپاہیوں کو چھوٹی چھوٹی ٹکڑیوں میں بانٹ کر اہم تنصیبات مثلاً بجلی گھر اور سلیفون اسپینج وغیرہ پر متعین کر دیا۔ چند سپاہیوں کو سیاسی لیڈروں کے گھر بھیجا گیا، مگر وہ پہلے ہی وہاں سے فرار ہو چکے تھے۔ پہلے دن پاکستانی سپاہیوں نے کسی مزاحمت کے بغیر پینہ میں ڈیرہ ڈال لیا۔ آئندہ ۳۶ گھنٹے بھی بخیر و عافیت گزر گئے، مگر ۲۷ مارچ کو سورج ڈوبتے ہی نالے کے پار سے گولیاں چلنے لگیں۔ یہ فائر کرنے والے ایسٹ پاکستان رائلٹز کے نوسو باقی تھے جن کے ساتھ چالیس چالیس آدمی پولیس اور عوامی لیگ کے تھے۔ انہیں ہماری کل تعداد کا علم نہ تھا، چنانچہ وہ دور دور سے فائر کرتے رہے۔ ہمارے فوجی بھی وقتاً فوقتاً جوابی فائر کرتے، مگر ذرا کج حوس سے، کیونکہ انہیں ایمنیشن کی کمی کا احساس تھا۔ اس ابتدائی جھڑپ میں ہمارا ایک نان کیشنڈ آفیسر (N.C.O) اور دو سپاہی زخمی ہو گئے۔

باغیوں کی ایک بگٹی مشین گن (ایل ایم جی) مسلسل فائر کر رہی تھی۔ لیپٹننٹ اصغر نے سوچا کہ جب تک اسے خاموش نہ کیا گیا، اسکھ کا سانس لینا مشکل ہوگا، چنانچہ چند جاں نثار ساتھ لیے اور آہستہ آہستہ اس ایل ایم جی پوزیشن کی طرف پیش قدمی شروع کر دی جب



وہ اپنے ٹارگٹ کے قریب پہنچا تو اس نے ایک دستی بم پھینکا جو ٹھیک نشانے پر لگا۔ علی مشین گن تباہ ہو گئی، مگر قبل اس کے کہ کیپٹن اصغر اگلی کارروائی کرتا، دشمن کی ایک اور مشین گن نے اس پر گولیوں کی بوچھاڑ کر دی۔ وہ سخت زخمی ہوا، مگر اڑ لیتا ہوا دشمن سے اوچھل جانے میں کامیاب ہو گیا۔ اوٹ میں جاتے ہی وہ بے ہوش ہو کر گر پڑا۔

کیپٹن اصغر کے بعد لیفٹیننٹ رشید نے چند ساتھیوں سمیت اسی دشمن پر حملہ کر دیا اور نہایت شجاعت سے اپنی جان بچا کر آفریں کے حوالے کر دی۔

اس اثناء میں علی گھر اور ٹیلیفون ایجنسی سے بھی سپاہی واپس بلا لیے گئے تاکہ انہیں بچا کر کے مقابلے کے لیے از سر نو منظم کیا جائے۔ ادھر باغیوں نے بھی اس وقفے کے دوران اپنے آپ کو منظم کر کے ایک بھر پور حملہ کر دیا۔ ہمارے سپاہیوں اور افسروں کو اس احساس ہوا کہ صرف چھوٹے ہتھیار اور محدود ایمونیشن لانے کا نقصان کیا ہے، انہیں اس کو تباہی کا خمیازہ بھگتنا پڑا۔ اس جھڑپ میں ہمارے دو افسر تین جوئیئر کمیٹیڈ افسر اور اتنی سپاہی شہید ہو گئے۔ اس کے علاوہ ایک افسر اور تیس سپاہی زخمی ہوئے۔

مدد کے لیے بار بار راجشاہی پیغام بھیجا گیا۔ بالآخر زخمیوں کو اٹھانے کے لیے ایک ہیلی کاپٹر آیا، مگر اترنے کے لیے محفوظ جگہ نہ پا کر واپس چلا گیا؛ البتہ راجشاہی سے میجر اسلم اٹھارہ سپاہیوں کی کمک لے کر پہنچ گئے۔ وہ اپنے ساتھ ایک ریکائل لیس ریفیل ایک مشین گن اور کچھ ایمونیشن لائے، کچھ سپاہیوں کو باغیوں کے زخموں سے نکالا۔ زخمیوں کو وادج میں ڈال کر کچھ راستے سے راجشاہی دہانہ کیا تاکہ زیادہ مزاحمت کا سامنا نہ کرنا پڑے، اور خود وہاں پہنچنے کے لیے سڑک کا راستہ منتخب کیا تاکہ راستے میں باغیوں کا سامنا ہو، تو ان سے بچا جاسکے۔

پہنہ / راجشاہی روڈ پر میجر اسلم کو شدید مدافعت کا سامنا کرنا پڑا۔ انہوں نے اسے فرو کر کے آگے بڑھنے کی کوشش کی، مگر کامیابی نہ ہوئی، چنانچہ اپنے ساتھیوں سمیت سڑک چھوڑ کر دیہاتی راستوں سے راجشاہی کی طرف پیدل چلنا شروع کیا۔ جس گاؤں میں باغیوں کا سامنا کرنا پڑتا، وہاں سے دوسرے راستے پر ہولیتے۔ بالآخر جب وہ بھوکے پیاسے، خاک چھلتے اور باغیوں سے نپٹتے حکیم اپریل کو راجشاہی پہنچے، تو ان میں سے صرف ۱۸ آدمی زندہ تھے، میجر اسلم سمیت باقی سارے راستے میں شہید ہو چکے تھے۔

یہ تھی چٹاگانگ، کشتیا اور پہنہ کی مختصر روداد جہاں ہمیں شدید مزاحمت اور بجاری نقصان سے دوچار ہونا پڑا۔ ان شہروں پر بالترتیب چھ اپریل، سولہ اپریل اور دس اپریل کو حکومت پاکستان کا اقتدار بحال کیا گیا۔ اس کے علاوہ بعض دوسرے مقامات پر بھی مزاحمت ہوئی، مگر اسے زیادہ جانی نقصان کے بغیر فرو کر لیا گیا۔

اس سلسلے کے لیے کالناک ترین پہلو یہ ہے کہ باغیوں نے نہ صرف پاکستانی فوجیوں کو بے دردی سے قتل کیا، بلکہ ان کے بال بچوں کو بھی سفاکانہ سلوک کا نشانہ بنایا۔ اس کتاب میں ان کی بربریت کے سارے قصے رقم کرنا ممکن نہیں، صرف ایک واقعہ نمونے کے طور پر درج کرتا ہوں:

۲ ایسٹ بنگال، دھاکہ کے شمال میں جو دیپ پور کے مقام پر تھی۔ اس میں ساری نفری بنگالی تھی؛ البتہ چند افسر جسے سی او اور

۱۷۔ یہ وہی پٹن سے جس کی تقریب پر جم کشتی فروری ۱۹۷۰ء میں منعقد ہوئی تھی اور لیفٹیننٹ جنرل وصی الدین نے بنگالی سپاہیوں کو وقت ضرورت کرنل

دریادار ڈرام۔ اے۔ جی عثمانی کی قیادت پر بھروسہ کرنے کی قطعیں کی تھی۔



این سی اور جن کا تعلق ٹیکنیکل شعبوں سے تھا، مغربی پاکستان سے تعلق رکھتے تھے، مگر ان کی تعداد آٹھ میں نمک کے برابر تھی ان میں سے اکثر نے اپنی ملازمت کا بیشتر حصہ اسی پلٹن میں گزارا تھا اور وہ اپنے آپ کو اسی کنبے کے افراد سمجھتے تھے۔ ۲۵ مارچ کی کارروائی کے پیش نظر جس طرح فرسٹ ایسٹ بنگال کوڑھنگ کے بہانے سیور چھاؤنی سے باہر بھیج دیا گیا تھا، اسی طرح سیکنڈ ایسٹ بنگال کو بھی جو دیپ پور سے شمال کی طرف روانہ کر دیا گیا تاکہ وہ ڈھاکہ سے دور رہے۔ اس پلٹن کی ایک ایک کمپنی غازی پور، ٹنگیل اور میننگھ میں تھی؛ البتہ چوتھی کمپنی پیچھے ایک پُرانے محل میں واقع ہیڈ کوارٹر میں رہی۔

اس پلٹن نے دوسری بنگالی پلٹنوں سے مواصلاتی رابطہ قائم کرنے کے بعد ۲۷ مارچ کو بغاوت کر دی۔ بغاوت کے بعد پہلا کام یہ کیا کہ مغربی پاکستان سے تعلق رکھنے والے تمام افراد اور ان کے اہل خاندان کو قتل کر دیا؛ البتہ صوبیدار ایوب جو دیپ پور سے بچ نکلنے میں کامیاب ہو گیا، وہ بھاگا بھاگا ڈھاکہ پہنچا اور اس بربریت کی داستان سنائی۔ دہشت کے مارے اس کے ہونٹوں پر پیریاں جھی ہوئی تھیں اور ہونٹوں کے کناروں پر سفید جھاگ کے دھبے نظر آ رہے تھے۔ ہر کسی نے اسے تسلی دینے اور چائے پلانے کی کوشش کی، مگر اس نے کسی کی نہ سنی اور جلد از جلد مدد کی ضرورت پر زور دیا۔

ڈھاکہ چھاؤنی سے پنجاب رجمنٹ کی ایک کمپنی فوراً جو دیپ پور روانہ ہو گئی۔ ہیڈ کوارٹر کے چند نوجوان افسر رضا کارانہ طور پر ساتھ ہو لیے۔ جب یہ لوگ وہاں پہنچے تو ٹیالین کا سارا علاقہ مقتل میں بدل چکا تھا۔ گندگی کے ایک ڈھیر پر پانچ بچے ذبح ہوئے پڑے تھے۔ ان کے پیٹ سنگینوں سے چاک کیے گئے تھے۔ ان کی ماؤں کی سٹخ شدہ لاشیں ایک دوسرے ڈھیر پر اوندھی پڑی تھیں جو صوبیدار ایوب ان میں اپنے کنبے کے افراد کو پہچان کر چلا اٹھا اور انتہائی صدمے سے دماغی توازن کھو بیٹھا۔

محل کے صحن میں ایک فوجی جیب کھڑی تھی جس میں وائرلیس سیٹ نصب تھا۔ جیب کے ٹائروں سے ہوا نکل چکی تھی اور جیب کے اندر مغربی پاکستان کا ایک این سی اور (ٹیکنیکل) ڈھیر ہوا پڑا تھا۔ اس کے خون کے پھینٹے اس کے وائرلیس سیٹ پر بھی پڑے ہوئے تھے۔ عمارت کے اندر بھی منظر زیادہ مختلف نہ تھا۔ وہاں ایک غسل خانے میں چند خون آلود کپڑے طے جو رابعہ کی تفتیش کے مطابق گوجرانوالہ کے کمپن ریاض کے تھے۔ سپاہیوں کے رہائشی کوارٹروں میں ایک نوجوان عورت پٹے کپڑوں سمیت مردہ پڑی تھی اور اس کا شیرخوار بچہ اس کی چھاتیوں سے لپٹ کر ہلکا رہا تھا۔ ایک اور کوارٹر میں چار سالہ بچی گھڑی بنی بیٹھی تھی۔ وہ فوجیوں کو دیکھتے ہی چلا اٹھی؛ مجھے نہ مارو، مجھے نہ مارو۔ میرے ابو کو آئیے دو۔ اسے کیا معلوم تھا کہ اس کے ابواب بھی سبیں آئیں گے۔

چند ماہ بعد چیف آف آرمی سٹاف جنرل عبدالحمید نے مجھ سے ڈھاکہ ایئر لوپٹ کے وی آئی پی لاؤنج میں باتیں کرتے ہوئے اس تمام قتل و غارت کی ذمہ داری لیفٹیننٹ جنرل صاحبزادہ یعقوب پر عائد کی اور کہا: یعقوب نے مارچ کے آغاز میں مغربی پاکستان سے فوجیوں کی آمد کی مخالفت کی تھی۔ اگر انہوں نے ہمیں بروقت فوجی طاقت میں اضافہ کرنے دیا ہوتا، تو تمام بڑے شہروں اور قصبوں میں ہمارے جوان موجود ہوتے اور اس وحشیانہ قتل و غارت کی نوبت نہ آتی۔ میں یہ دلیل سن کر خاموش ہو رہا، کیونکہ مجھے معلوم تھا کہ جنرل یعقوب نے کلم مارچ کو فوجیوں کی آمد کس بنا پر روکی تھی۔

کیوں قتل و غارت کے بعد اور کہیں اس کے بغیر پاکستانی فوج نے چند بڑے بڑے شہروں کو باغیوں کے زور سے نکال لیا۔ اس کے بعد مضافات کی طرف توجہ دی گئی اور مختلف فوجی دستے مختلف اطراف میں روانہ کیے گئے۔ ایک دستے کے ساتھ



مجھے بھی جانے کا اتفاق ہوا جس کا آنکھوں دیکھا حال میں آپ کو سنا تا ہوں۔ اس سے آپ کو بخوبی اندازہ ہو جائے گا کہ ان دستوں نے اپنا کام کیسے انجام دیا۔ اس ایک واقعے کو تمام واقعات کا نمونہ تو قرار نہیں دیا جاسکتا، مگر اس سے طریق کار اور ذہنی رویے کی نشاندہی ضرور ہوتی ہے۔

یہ فوجی دستہ ایک پلٹن (چھ سو افراد کے قریب) پر مشتمل تھا جس کی دو کمپنیاں ٹرکوں پر سوار تھیں جن کے آگے اور اطراف پر ہلکی اور بھاری مشین گنیں نصب تھیں۔ باقی دو کمپنیاں ٹرک کے دونوں جانب کوئی پانچ سو میٹر تک پھیلی ہوئی تھیں۔ وہ تمام انسانی اور غیر انسانی مدافعت کا مقابلہ کرنے کے لیے پوری طرح لیس تھیں۔ پیدل فوج کے پیچھے پیچھے توپ خانہ تھا جس کی دو بڑی توپیں دھنوں کے بعد دو دو گولے سامنے کی طرف فائر کرتی تھیں تاکہ باغی توپوں کی گھن گرج سن کر سپاہی ہوتے جائیں۔ سپاہی اتنے حساس تھے کہ ذرا سے شہے پر گولی چلا دیتے تھے۔ چلتے چلتے اگر کسی مکان یا درختوں کے جھنڈے سے ذرا سی جنبش ہوتی، تو اس کا جواب ہلکی مشین گن کے ایک برسٹ (BURST) سے دیا جاتا۔ مجھے یاد ہے ایک موقع پر ایک جھنڈے میں سرسراہٹ ہوئی، ایک سپاہی نے فوراً گولی داغ دی۔ چند لمحے بعد آگ کی تپش سے بانس کی لکڑی تڑاخ سے پھٹ گئی، ہر ایک نے یہی قیاس کیا کہ کسی شہ پند نے جوابی فائر کیا ہے؛ چنانچہ سارا قافلہ دوک کر اس جھنڈے کی تلاشی لی گئی۔ چند سپاہی جھنڈے سے باہر نکلے تھے۔ اس میں پندرہ منٹ صنایع ہو گئے۔

ڈھاکہ سے تشکیل جاتے ہوئے راستے میں ایک چھوٹا سا قصبہ پڑتا ہے جس کا نام کرانیہ ہے جو گنجان درختوں میں گھرا ہے۔ اس کے ایک طرف نالہ ہے جو ہر وقت پانی سے بھرا ہوتا ہے۔ ٹرک کے کنارے ایک پٹرول پمپ اور ایک چھوٹا سا بازار تھا۔ تمام دکانیں بند تھیں۔ قصبہ بالکل اجازت پڑا تھا۔ حکم ملنے پر بازار میں پڑے ہوئے مٹی کے تیل کے ڈرم نذر آتش کر دیے گئے اور دکانوں کو آگ لگا دی گئی۔ دیکھتے ہی دیکھتے آگ دوسرے مکانوں تک بھی پھیل گئی اور دھواں سبز ٹہنیوں سے بلند ہونے لگا۔ فوجی دستہ اس کے آخری حشر کا انتظار کیے بغیر روانہ ہو گیا۔ جب ہم قصبے کے دوسری جانب پہنچے تو میری نظر ایک سیاہ میمنے پر پڑی جو کھونٹے سے بندھا آتش زدہ استھان سے بھاگنے کے لیے بے تاب تھا۔ جوں جوں وہ آواز ہونے کے لیے کھونٹے کے گرد چکر لگاتا، اس کے گلے کا رستا اتنا ہی تنگ ہو جاتا — حتیٰ کہ وہ چپڑ کھا کھا کر وہیں گر گیا — شعلے اس کے قریب پہنچ چکے تھے چند کلومیٹر آگے بڑھے تو ٹرک کے بائیں جانب انگریزی حرف وی (V) کی شکل کی دو خندقیں نظر آئیں۔ وہ بالکل تازہ دکھائی دیتی تھیں جیسے انہیں کوئی ابھی چھوڑ کر گیا ہو، غالباً کچھ دیر پہلے تک یہاں باغی تھے جو توپوں کی گھن گرج سن کر بھاگ گئے تھے، مگر کہہ رہے؟ اس کی اطلاع دینے کے لیے کوئی شخص موجود نہیں تھا۔

اس جگہ کو کھنگالے بغیر آگے بڑھنا خطرے سے خالی نہ تھا؛ چنانچہ سپاہیوں کو حکم ہوا کہ وہ ٹرک کے دونوں جانب سائے علاقے کی تلاشی لیں۔ میں نکمنا کھڑا رہ گیا۔ اس فراغت میں میں گارے کی بنی ہوئی کھلی جھونپڑی میں گھس گیا تاکہ طرز رہائش دیکھ سکوں۔ اس میں دو کمرے تھے، ایک بڑا اور ایک چھوٹا۔ چھوٹا کمرہ ہٹور کے طور پر استعمال ہوتا تھا اور بڑا رہنے کے لیے بڑے کمرے میں مٹی کا خوبصورت لیپ کیا گیا تھا اور سامنے کی دیوار پر دو بچوں کی فریم شدہ تصویر لٹک رہی تھی۔ یہ دونوں بھائی معلوم ہوتے تھے۔ کمرے کے درمیان ایک چارپائی اور ایک کھجور کی بنی ہوئی چٹائی بھی تھی۔ چٹائی کے اوپر ابلے ہوئے چادروں کا ایک پیالہ تھا جس میں ننھے ننھے ہاتھوں کی انگلیوں کے نشان صاف نظر آ رہے تھے۔ وہ نوالہ چھوڑ کر کیوں چلے گئے، کہاں



چلے گئے؟

ایک موٹی سی گالی نے مجھے میرے خیالات سے چونکا دیا۔ سپاہیوں نے ایک بڑھے کو تلاش کر کے اس سے پوچھ گچھ شروع کر دی تھی۔ مگر وہ باغیوں کے متعلق کچھ نہیں اگلتا تھا۔ سپاہی اسے عدم تعاون کی سزا کے طور پر جان سے مار دینے کی دھمکی دے رہے تھے۔ میں بھی اس کے پاس چلا گیا اور سپاہیوں کو چپ کرایا۔ بنگالی بابا بڈیوں کا ڈھانچہ تھا جس کے جسم پر واحد جینٹرا اس کا ستر ڈھانپے ہوئے تھا۔ اس کی سیاہ جلد سالہا سال کی دھوپ میں اور سیاہ ہو گئی تھی اور اس کی ڈاڑھی سیاہ سے سفید ہو چکی تھی۔ میں نے اوپر سے نیچے تک اس پر نگاہ ڈالی۔ میری نظریں اس کے گرد آلود ننگے پاؤں کی سوجھی ہوئی رگوں پر آکر رک گئیں۔ مجھے وہ کسی طور شرمندہ یا شرمندوں کا عامی نظر نہ آیا۔ میرے بعد روانہ رویتے سے ہمت پا کر وہ پھوٹ پھوٹ کر کہنے لگا:

”تسوڑی دیر پہلے وہ شرمندہ یہاں تھے۔ وہ کہتے تھے اگر تم نے ہمارے متعلق کسی کو بتایا، تو گولی مار دیں گے۔ اب یہ پاکستانی آنے ہیں۔ کہتے ہیں اگر ان کے متعلق نہ بتایا تو گولی مار دیں گے۔ میں کیا کروں؟ میں کدھر جاؤں؟“

ترس کھا کر بڑے میاں کو زندہ چھوڑ دیا گیا اور قافلہ آگے بڑھا اور چلتے چلتے شام تنگیل پہنچ گیا جہاں سرکٹ ہاؤس پر بنگلہ دیش کا پرچم لہرا رہا تھا۔

پاکستانی فوجیوں نے جا کر وہ پرچم اتار کر اس کی جگہ پاکستان کا بھندہ لہرا دیا۔ دونوں توپوں نے بریگیڈیئر صاحب کے حکم پر دو دو گولے مغربی جانب سنسٹوٹس (مولانا بھاشانی کی جائے رہائش) کی طرف فائر کیے تاکہ ان سب کو پتہ چل جائے کہ ہم پہنچ گئے ہیں۔ فوجی دستے نے دن بھر کی مسافت کے بعد رات تنگیل میں گزارنے کا فیصلہ کیا اور میں بریگیڈیئر صاحب کے ساتھ ہیلی کاپٹر میں واپس ڈھاکہ چلا آیا۔

ایسی کارروائیوں سے باغی بڑی سڑکوں سے ہٹ کر یا تو دیہی علاقوں میں چلے گئے یا پسا ہوتے ہوتے سرحد پار کر کے ہندوستان میں چلے گئے۔ ان کے تعاقب یا سرکوبی کا دار و مدار دستیاب وسائل یا فوجی نفری پر تھا۔ جب تک وسائل محدود تھے صرف شاہراہوں کو صاف کیا گیا۔ مگر جب ملک پہنچی تو کارروائی کا دائرہ کار بھی وسیع کر دیا گیا۔ جیسا کہ اوپر ذکر آیا ہے ۲۵ مارچ تک مشرقی پاکستان میں متعین فوج صرف ۱۴ ڈویژن پر مشتمل تھی، لیکن ۲۶ مارچ سے ۱۶ اپریل تک مزید نفری مغربی پاکستان سے پہنچی۔ اس میں دو ڈویژنل ہیڈ کوارٹرز (۹ ڈویژن اور ۱۶ ڈویژن)، پانچ بریگیڈ ہیڈ کوارٹرز، ایک کمانڈو ٹائلین اور بارہ انفنٹری ٹائلین (سیدیل پٹنیں) شامل تھیں۔ یہ سب اپنے بھاری ہتھیار (توپیں وغیرہ) مغربی پاکستان ہی میں چھوڑ آئے تھے، کیونکہ انہیں چند شرمندہ کی سرکوبی کرنا تھی کوئی باقاعدہ جنگ توڑا ہی لڑنا تھی!

اس کے علاوہ تین سیاہ پٹنیں اور دو مارٹر بیٹریاں (دھکی توپیں) بالترتیب ۲۴ اپریل اور ۲۶ مئی کو مشرقی پاکستان پہنچیں۔ نیم فوجی لشکر جو ایسٹ پاکستان رائفلز کی جگہ لینے کے لیے کیم اور ۲۱ اپریل کے درمیان پہنچا، اس میں ایسٹ پاکستان سولی آرٹڈ فورسز (ای پی سی اے ایف) مغربی پاکستان ریجنرز ڈیپو آرا، اور شمال مغربی سرحدی صوبے کے ہکاؤٹس شامل تھے۔

جتنی نفری آتی گئی اسے آپریشن سرچ لائن کی تکمیل پر لگا دیا گیا۔ یہ آپریشن جو ۲۵ مارچ کی رات کو شروع ہوا، اس کے باضابطہ اختتام کا بھی اعلان نہیں کیا گیا، مگر وسط مئی میں بڑے شہروں اور قصبوں کو عملاً زیر اثر لینے کے بعد یہی بھا گیا کہ اس کے مقاصد حاصل

ہو گئے ہیں۔

مذکورہ بالا واقعات کے دوران کل کتنے آدمی مارے گئے؟ ان میں سے کتنے بنگالی اور کتنے غیر بنگالی تھے؟ مجھے افسوس ہے کہ میں یہ اعداد و شمار کتنے نہیں کر سکا۔ میرا ذاتی خیال یہ ہے کہ ہلاک ہونے والے بنگالیوں کی تعداد زیادہ سے زیادہ چار ہندسوں میں ہوگی۔ اگر غیر ملکی ذرائع ابلاغ عاقر نے یہ اعداد و شمار بڑھا چڑھا کر بیان کیے ہیں، تو اس کی ایک وجہ یہ ہے کہ انہیں راولپنڈی میں بیٹھے ہوئے رہاؤ عتقل و دانش نے ۲۶ مارچ کو مشرقی پاکستان سے نکال دینے کا حکم دیا تھا۔ ان میں سے اکثر صحافی کلکتہ جا کر بیٹھ گئے جہاں وہ تیاتوں کی غیر مصدقہ خبروں اور بھارتی حلقوں کے تخمینوں پر انحصار کرنے لگے۔ مجھے یقین ہے اگر ان صحافیوں کو مشرقی پاکستان میں رہنے دیا جاتا، تو حالات انہیں اتنے گھمبیر نظر نہ آتے جتنے انہوں نے دور بیٹھ کر رنگ آمیزی کر کے دنیا کے سامنے پیش کیے۔

۱۰ بڑے بڑے شہروں اور قصبوں کو حسب ذیل تاریخوں پر باغیوں سے صاف کیا گیا:

پاکسی (۱۰ اپریل)، پینہ (۱۰ اپریل)، سلٹ (۱۰ اپریل)، اشٹوڈی (۱۱ اپریل)، چندر گھونا (۱۳ اپریل)، راجشاہی (۱۵ اپریل)، ٹھاکر گاؤں (۱۵ اپریل)، کشتیا (۱۶ اپریل)، کشم (۱۶ اپریل)، چوڈنگا (۱۶ اپریل)، برہمن باڑیہ (۱۶ اپریل)، درسنہ (۱۶ اپریل)، تہی (۲۱ اپریل)، سنگھیا (۲۱ اپریل)، گولنڈ (۲۱ اپریل)، دوہزاری (۲۲ اپریل)، گرا (۲۳ اپریل)، رتھپور (۲۶ اپریل)، لواکلی (۲۶ اپریل)، سنتار (۲۶ اپریل)، سراج گنج (۲۶ اپریل)، مولوی بانار (۲۸ اپریل)، کاکس بازار (۱۰ مئی)، ہاتیا (۱۱ مئی)۔





لیفٹیننٹ جنرل امیر عبداللہ خان نیازی
کمانڈر، ایسٹرن کمانڈ

جنرل نیازی کی آمد

۲۶ مارچ کو ڈھاکہ سے غیر ملکی نامہ نگاروں کو نکالنے کا فیصلہ پاکستان کو بہت مہنگا پڑا۔ انہوں نے باہر جا کر مشرقی پاکستان کے متعلق طرح طرح کی خبریں تخلیق کرنی شروع کر دیں جن میں سے بیشتر مبالغہ یا غیر مصدقہ اطلاعات پر مبنی ہوتی تھیں۔ ان سے یہ تاثر پیدا ہوتا تھا کہ پاکستانی فوج معصوم اور نیشے بنگالیوں کو ناحق موت کے گھاٹ اتار رہی ہے۔ اس پروپیگنڈے کا زہر کم کرنے کے لیے میں نے مارچ ۱۹۷۱ء کے آخر میں حکام بالا کو تجویز پیش کی کہ ہمیں برطانیہ سے اس بات کا اعتراف کر لینا چاہیے کہ مشرقی پاکستان میں متعین تمام بنگالی نوٹیس ایٹ پاکستان رٹائر اور پولیس بغاوت کر چکی ہے اور پاکستان آرمی کو ان مسلح اور منظم باغیوں کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے نہ کہ معصوم اور نیشے بنگالیوں کا میری اس تجویز کے عوض مجھے ایک جہاز وصول ہوئی جس کا متن یہ تھا: "تم دنیا کو یہ بتانا چاہتے ہو کہ پاکستان آرمی کا ڈسپلن ٹوٹ گیا ہے؟ کیا تم ایسی حرکت کر کے آرمی کے ظموس کو بڑھ لگانا چاہتے ہو؟"

تجویز تو میں نے واپس نہ لی، البتہ جہاز وصول کر کے خاموش ہو گیا۔ چند ہفتے بعد جب حالات نے حکام کو مجبور کیا، تو انہوں نے ایک برطانوی اخبار کے نمائندے کی خدمات حاصل کر کے اپنا نقطہ نظر دنیا کے سامنے پیش کیا۔ اس مضمون میں سارا زور یہاں اس بات پر صرف ہوا کہ بنگالی فوج کی بغاوت کی وجہ سے پاکستانی فوج کو سخت مدافعت کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے جس کے نتیجے میں جانی اور مالی نقصان ہو رہا ہے۔

معتول تجویز کے بروقت قبول نہ ہونے کا قلع صرف مجھے ہی نہیں تھا، ایک اور سلسلے میں سچر جنرل راولپنڈی نے بھی نشانہ بن چکے تھے۔ انہوں نے ڈھاکہ میں فوجی کارروائی کے چند روز بعد (اوائل اپریل میں) اعلیٰ قیادت کو مشورہ دیا کہ باغی عناصر کے لیے فوراً عام معافی کا اعلان کر دیا جائے تاکہ جو لوگ (ناکام مدافعت کے بعد) واپس آنا چاہیں آجائیں۔ انہوں نے اس پر فوری طور پر عمل کرنے کو کہا تاکہ باغی عناصر مستقلاً بھارت کی گرفت میں نہ چلے جائیں۔ اس پر ایک سینئر جنرل نے طنزاً کہا: "اوه، ہمیں آپ کی سیاسی چالوں کا پتہ ہے، مگر اب سیاست کا وقت گزر چکا ہے۔ اسی اعلیٰ قیادت کو پانچ ماہ بعد (۴ ستمبر) عام معافی کا اعلان کرنا پڑا، مگر درمیانی عرصے میں گمراہ بنگالی بھارت کی رہنمائی میں کئی باہمی (سپاہ آزادی) میں بدل چکے تھے۔ بعد میں دوران جنگ اس سپاہ نے بھارتی فوج کا کام بہت سہل کر دیا جس کی تفصیل آگے آئے گی۔"

پتہ نہیں وہ کون خوش قسمت تھا (یا تھی) جس کی تجویز کو راولپنڈی والوں نے بروقت قبول کرتے ہوئے ایک اور لفٹیننٹ

رہنما مہتمم میں کیے جس کے نام سے ایک مفضل مضمون کیمرہ ۱۹۷۱ء کو سنڈے انٹرنیشنل میں شائع ہوا۔

جنرل مشرقی پاکستان بھیج دیا تاکہ وہ لیفٹیننٹ جنرل نکا خاں کی بجاری ڈوٹرہ واروں میں ہاتھ بٹا سکے۔ اس وقت گورنر مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر اور کمانڈر ایئر کمان کے تینوں عہدے نکا خاں کے پاس تھے۔ منوخرالذکر ڈوٹرہ واری (سپاہ کی کمان) سنبھالنے کے لیے مغربی پاکستان سے لیفٹیننٹ جنرل امیر عبداللہ خاں نیازی بھیجے۔ وہ دوسری جنگ عظیم میں ملٹری کراس اور ۱۹۶۵ء کی جنگ میں بلل جبراً حاصل کیے تھے اور ٹائیکر کے نام سے مشہور تھے۔ غالباً ارباب اقتدار کا خیال تھا کہ بنگال کے ٹائیکر کو زیر کرنے کے لیے پنجاب کا ٹائیکر بھیجا ضروری ہے۔ ان کی وہ کمزوریاں جو دسمبر ۱۹۶۷ء کی شکست کے بعد منظر عام پر آئیں، اُس وقت زبان زد عام نہ تھیں شاید اس وقت تک ان کی قلمی نہیں کھلی تھی یا لوگ صاحب اقتدار شخصیت پر اٹھلی اٹھا کر مصیبت کو دعوت نہیں دینا چاہتے تھے۔

وہ ۱۰ اپریل کو ڈھاکہ پہنچے اور اٹلی صبح کمانڈر ایئر کمان کے عہدے کا چارج سنبھال لیا۔ اسی شام ان کے سرکاری مکان فلگ اسٹاف ہاؤس میں میری ان سے ملاقات ہوئی۔ وہ شام کو بھی دردی پہنے ہوئے تھے۔ انہیں اپنے کندھے پر لیفٹیننٹ جنرل کے تازہ رینک کا واضح احساس تھا۔ انہیں دردی رینک اور چھاتی پر تمنے سجانے کا بہت شوق تھا، وہ کہتے تھے کہ اس طرح ان کی شخصیت زیادہ باوقار لگتی ہے۔ یہ باتیں مجھے بعد میں معلوم ہوئیں جب انہوں نے مجھے تاکید کی کہ کسی اخباری نمائندے کو لانے سے پہلے میں دیکھ لیا کروں کہ وہ دردی میں ہیں۔ جنرل خادم راجہ نے مجھے بتایا کہ جب وہ فوج کی کمان ان کے سپرد کیے تو جنرل نیازی نے پوچھا: اپنی داشتتاؤں کا چارج کب دو گئے؟

چارج لینے کے بعد جنرل نیازی نے اپنے اسٹاف کو خطاب کیا جس میں انہوں نے ماضی کی فاختاؤں پر تنقید کی اور بنگالیوں بالخصوص بنگالی دانشوروں اور بنگالی ہندوؤں پر خوب برسے، کیونکہ ان کا خیال تھا کہ بنگالی قومیت کو پروان چڑھانے والے یہی لوگ ہیں۔

فوجی کارروائی کے بارے میں انہوں نے اپنے پیشرو سے مشورہ کیا اور جس طرح کام چل رہا تھا، اس میں ٹی تک چلنے دیا۔ یہ وہ تاریخ تھی جب مشرقی پاکستان کا آخری قصبہ دکاکس بازار دوبارہ ہمارے قبضے میں آیا۔

ماہ اپریل میں تین بھرتی جنرل جنرل نیازی کی اعانت کے لیے ڈھاکہ پہنچے۔ بھرتی جنرل رحیم جنرل خادم ماجہ والے ۱۴ ڈویژن کے جی اوسی مقرر ہوئے جبکہ بھرتی جنرل شوکت رضا اور بھرتی جنرل نذر حسین شاہ کو بالترتیب ۹ ڈویژن اور ۱۹ ڈویژن دیے گئے۔ یہ دونوں ڈویژن تازہ تازہ مغربی پاکستان سے آئے تھے۔ جنرل نیازی نے اپنے تازہ وسائل کے پیش نظر مشرقی پاکستان کو تین حصوں میں تقسیم کر دیا۔ مشرقی سرحد جنرل شوکت رضا کو، شمال مغربی علاقہ جنرل نذر حسین شاہ کو اور باقی علاقہ جنرل رحیم کو سونپ دیا۔

اس اضافی طاقت کے ذریعے سارے مشرقی پاکستان میں حکومت کا کنٹرول بحال کرنے میں زیادہ دیر نہ لگی۔ اپریل کے آخر تک بڑے بڑے شہروں سے باغیوں کو نکالا جا چکا تھا اور وسطی تک بہ قابل ذکر جگہ پر پاکستانی فوج پہنچ چکی تھی، لیکن یہ کنٹرول طاقت کے بل بوتے پر قائم تھا۔ اس کا دل پر حاکمیت سے کوئی تعلق نہ تھا، کیونکہ منوخرالذکر کام کے لیے جن سیاسی اور انسانی اقدامات کی ضرورت تھی، ان کی طرف کوئی توجہ نہ دی گئی، بلکہ عمل صفائی (SWEEP OPERATION) کے نام پر شکوک گھروں

لے فوج میں فاختہ (DOVE) اور باز (HAWK) کی اصطلاحیں عام ہیں۔ اول الذکر سے مراد ایسے لوگ لیے جاتے ہیں جو صلح خواہ اور نرم صلح ہیں اور

منوخرالذکر کا اشارہ ان لوگوں کی طرف ہوتا ہے جو اپنے آپ کو جنگ خواہ اور سخت گیر سمجھتے ہیں۔



پر چھاپے مار مار کر زخموں پر نمک چھڑکنے کا تاثر دیا گیا۔

یہ عمل صفائی بھی اپنے مقصد میں پوری طرح کامیاب نہ ہو سکا، کیونکہ یہ کام جن لوگوں کے سپرد تھا، وہ بنگال اور بنگلہ زبان سے ناواقف تھے۔ وہ گلی نمبر پڑھ سکتے تھے نہ مشتبہ بنگالیوں کو پہچان سکتے تھے۔ انہیں ہر کام کے لیے مقامی لوگوں پر انحصار کرنا پڑتا تھا جن میں سے اکثر کے دلوں میں اب بھی عجیب الزحمن بتا تھا۔ وہ اب بھی یہ اُمید سینے سے لگائے بیٹھے تھے کہ کبھی نہ کبھی ان کا بنگلہ بندھو رہا ہو کر ضرور آئے گا۔ چنانچہ ان کے رویے میں اگر کھلم کھلا مخالفت نہیں، تو واضح بے اعتنائی ضرور جھلکتی تھی۔

فوج کے ساتھ جن لوگوں نے اس آڑے وقت میں تعاون کیا، ان کا تعلق عموماً دائیں بازو کی جماعتوں سے تھا، مثلاً کونسل مسلم لیگ کے خواجہ خیر الدین، کونشن مسلم لیگ کے فضل القادر جو دہری، قوم مسلم لیگ کے خان اے۔ صبور، جماعت اسلامی کے پروفیسر غلام اعظم اور نظام اسلام پارٹی کے مولوی فرید احمد۔ یہ سب لوگ ۱۹۷۰ کے عام انتخابات میں عوامی لیگ سے شکست کھا چکے تھے جب انہوں نے فوج پر اور فوج نے ان پر انحصار کرنا شروع کیا، تو اکثر لوگ یہ سمجھنے لگے کہ پٹے ہوئے ٹرے فوج کی سرپرستی میں بازار میدان میں آگئے ہیں۔ میں نے ایک سرکاری اجلاس میں ان کے مفید تعاون کو سراہنے کے بعد عرض کیا کہ ان سٹی بھر پٹے ٹرے کے بیانات بار بار نشر کرنے کے بجائے اگر ایسے لوگوں کا تعاون حاصل کیا جائے جو سیاسی شخصیت بے شک نہ ہوں، مگر اپنے اپنے حلقے میں قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہوں، تو بہتر ہوگا۔ یہ تجویز فوراً منظور کر لی گئی اور وہیں بیٹھے بیٹھے مجھے حکم سنا دیا گیا کہ تم سرکردہ شخصیتوں سے بیان حاصل کرو۔

میں جب اپنی ہی تجویز کے پھندے میں پھنس گیا، تو پتہ چلا کہ یہ کتنا مشکل کام ہے، کیونکہ جو لوگ بلاجھک تعاون کرنے کو تیار تھے وہ سرکردہ تھے نہ باوقار تھے اور جو سرکردہ اور باوقار تھے وہ آسانی سے تعاون پر تیار نہیں ہوتے تھے۔ اس سلسلے میں ایک واقعہ نئیے جو مجھے مشرقی پاکستان کی عدالت عالیہ کے سابق چیف جسٹس مسٹر جسٹس مرشد سے ملاقات کے دوران پیش آیا۔ میں ان کا تعاون حاصل کرنے کے لشن کالونی میں ان کے دولت کدے پر حاضر ہوا۔ وہ مجھے نہایت شفقت سے اپنے دارالمطلعے میں لے گئے جہاں دنیا بھر کی چیدہ چیدہ کتابیں اور نادر مسوومے محفوظ تھے۔ انہوں نے ان نوادرات سے میری تواضع کی۔ ساتھ ساتھ اپنی عالمانہ گفتگو سے بھی نوازا اور رہی سہی کسر رومی، سعدی اور اقبال کے اشعار سے پوری کی۔ اس فضا میں میں نے ان سے تعاون کی درخواست کی، تو وہ مجھے پوچھ گچھ کے خارزار میں لے گئے۔ رشتہ گفتگو کرنے والا ملائم شخص یا ایک باعثِ وقت گننے لگا۔ انہیں گفتگو کے ایک طویل موڑ سے واپس بلاتے ہوئے جب میں نے اپنی درخواست دہرائی، تو انہوں نے فرمایا: مجھے سوچنے دیجیے میں خاموش ہو گیا تاکہ وہ سوچ لیں۔ تھوڑی دیر بعد پھر عرض کیا، تو فرمانے لگے: جی ہاں، میں نے کہا مجھے سوچنے دیجیے۔ میں نے کہا: اچھا، کل حاضر ہو جاؤں گا۔ فرمانے لگے: نہیں، کل نہیں۔ مجھے سوچنے کے لیے کم از کم تین ماہ چاہئیں تاکہ میں اندازہ کر سکوں کہ آپ لوگوں نے واقعی اپنا اقتدار بحال کر لیا ہے یا نہیں۔ ہاں، یہ تو بتائیے آج کل فارلینڈ کہاں ہے؟

آئندہ سرکاری اجلاس میں جب میں نے اپنی تجویز پر عمل درآمد کے سلسلے میں مذکورہ بالا واقعہ بیان کیا، تو شعبہ سر آفرسانی سے متعلق ایک صاحب بلے: یہ بھی کوئی مشکل کام ہے، ہم آج رات ہی مرشد کو اٹھالیں گے اور اس سے حسبِ فضا بیان لے لیں گے۔ صدر مجلس کی مداخلت پر جسٹس مرشد کو اس عزت سے محروم رکھا گیا۔

۱۰ امریکی سینیٹر پاکستان



جنس مرشد واحد و انشور نہ تھے جو مختلف خطوط پر سوچتے تھے، خود حکومت کے زیر اقتدار ریڈیو اور ٹیلی ویژن میں ایسے بے شمار افراد تھے جن کے دل کے تار کہیں اور جڑے ہوئے تھے۔ دونوں شعبوں کا ایک ایک واقعہ سنی لیجیے۔ آپ کو ان کی ذہنی افتاد کا اندازہ ہو جائے گا۔

ڈھاکہ میں ۲۵ مارچ کی رات کو فوجی کارروائی کے بعد مجھے حکم ملا کہ ریڈیو کو دوبارہ چلایا جائے تاکہ اس کے ذریعے مارشل لا احکام عوام تک پہنچائے جاسکیں۔ میں نے ریڈیو کے عملے سے کہا کہ وہ سازوں پر دھنیں نشر کرتے رہیں تاکہ سامعین کو اندازہ رہے کہ ریڈیو اسٹیشن چل رہا ہے اور جوں جوں مارشل لا کی طرف سے ہدایات آتی جائیں گی، موسیقی بند کر کے نشر کی جائیں گی اور پھر موسیقی کا سہارا لیا جائے گا۔ انہوں نے ان ہدایات کو سنا اور صدقِ دل سے ان ہدایات پر عمل کرنے کا وعدہ کیا، لیکن جب میں چلا آیا تو انہوں نے مامی دھنیں بجانا شروع کر دیں۔ واپس آ کر انہیں ٹوکا اور کہا کہ آئندہ سے صرف حمد، نعت اور منقبت وغیرہ نشر کیے جائیں۔ انہوں نے اس حکم پر بھی سر تسلیم خم کیا اور یہ نغمہ بار بار نشر کرنے لگے۔

اے مولا علی! اے شیر خدا میری کشتی پار لگا دینا
یاد رہے کشتی عوامی لیک کا استخباری نشان تھا۔

اسی طرح میں نے ٹیلی ویژن کو ہدایت کی کہ وہ قیام پاکستان کا پس منظر اجاگر کرنے کے لیے تحریک پاکستان پر مبنی ڈرامے نشر کرے۔ انہوں نے پہلا ڈرامہ محمد علی جوہر پر ٹیلی کاسٹ کیا۔ ڈرامے کے شروع میں مولانا جوہر کی تصویر دکھائی گئی، لیکن باقی سارے کاسٹ اور ڈرامہ تحریک آزادی کے فروغ کی نذر ہو گیا۔ داربار بار اس طرح کے مکالمے بولتے تھے: "آزادی کے جذبے کو کبھی دبایا نہیں جاسکتا"۔ "آزادی قربانیاں مانگتی ہے"۔ "آزادی کے لیے ماؤں کو اپنے بچے اور بہنوں کو اپنے بھائی قربان کرنے سے دریغ نہیں کرنا چاہیے"۔

آزادی کے ان جراثیم کو ختم کرنے کے بجائے حکام نے "بنگالیوں کو دبائے رکھنے" کی پالیسی کو ترجیح دی۔ انہوں نے "عمل صفائی" کو وسیع پیمانے پر جاری رکھا جس کے لیے معلومات کا واحد ذریعہ محبت وطن بنگالی یا بہاری تھے۔ ان میں سے اکثر نے صدقِ دل سے فوج کے ساتھ تعاون کیا، مگر چند ایک نے ذاتی رنجش یا حماقت کی وجہ سے کئی بے گناہ آدمیوں کو بھی مروا دیا۔ ایک مثال ملاحظہ ہو:

ایک روز صبح صبح وائیں بازو سے تعلق رکھنے والے ایک سیاسی رہنما ایک نو عمر لڑکے کو ساتھ لے کر مارشل لا ہیڈ کوارٹر کے افتتاحی برآمدے میں سامنے سے نہیں آتا ہوا دکھائی دیا۔ مجھے روک کر سرگوشی کے انداز میں کہنے لگے: "یہ لڑکا میرا بھتیجا ہے جو باغیوں کے کیمپ سے بھاگ کر آیا ہے۔ میں اعلیٰ حکام کو بعض اہم معلومات دینا چاہتا ہوں۔" میں انہیں ایک اعلیٰ حاکم کے پاس لے گیا۔ انہوں نے انکشاف کیا کہ باغی ڈھاکہ شہر کے پاس سے سننے والے دریا "بوڑھی گنگا" کے پار کرانی گنج کے مقام پر جمع ہیں، لوگوں سے زبردستی روٹی اور پیسے بھرتے ہیں اور آج رات ڈھاکہ شہر پر حملہ کرنے کی تیاریاں کر رہے ہیں۔

میں واپس چلا آیا اور اس معتبر محبت وطن شہری کی اطلاع پر مزید تصدیق کیے بغیر فوراً فوجی کارروائی کی تیاری کا حکم دیا گیا۔ کارروائی کے انچارج افسر سے کہا گیا کہ وہ فوراً میدانی توپیں، چھوٹی توپیں، ٹینک ٹرینک توپیں اور مطلوبہ فوجی دستے تیار کر کے راتوں رات بوڑھی گنگا کے کنارے پہنچ جائے اور طلوع آفتاب سے ذرا پہلے حملہ کر کے باغیوں کا صفحہ کیا کر دے۔



جب یہ کارروائی شروع ہوئی، میں آپریشن روم (OPERATION ROOM) میں تھا جہاں کارروائی کی لمحہ بہ لمحہ اطلاعات آرہی تھیں۔ وہیں بیٹھے بیٹھے میں نے مختلف توپوں کی گھن گرج اور بعد میں خود کار ہتھیاروں کے فائر کی آواز سنی۔ اس کمرے میں موجود کئی افسروں کا خیال تھا کہ ایک بٹالین اور چند توپوں سے شاید یہ معرکہ سرنہ ہو سکے۔ طلوع آفتاب تک غیر یقینی کا تاثر غالب رہا۔ تھوڑی دیر بعد یہ مشرورہ سنایا گیا کہ ہماری بہادر فوج نے کسی جانی نقصان کے بغیر باغیوں کے کیمپ پر قبضہ کر لیا ہے۔

شام کو میری ملاقات اس کارروائی کے انچارج افسر سے ہوئی۔ اس نے جو انکشاف کیا اس سے میرا خون میری رگوں میں منجمد ہو کر رہ گیا۔ اس نے بتایا کہ کرانی گنج ایک غریب اور معصوم بستی تھی جس میں زیادہ تر بوڑھے، بچے اور عورتیں تھے، انہیں خواہ مخواہ غیر منصفہ اطلاع پر بھون کر رکھ دیا گیا۔ اس سانحے کا بوجھ میں عمر بھر اپنے ضمیر پر لیے پھروں گا۔

ادھر فوجی کارروائی زوروں پر تھی اور ادھر ریڈیو، ٹیلی وژن اور اخبارات ایک زبان تھے کہ صوبے میں حالات تیزی سے معمول پر آ رہے ہیں۔ کئی بار ایسا بھی ہوا کہ جب ایک گھر عمل صفائی کی زد میں تھا، تو گھر کا ریڈیو کہہ رہا تھا کہ سب اچھا ہے! اس سے یقیناً سرکاری ذرائع نشر و اشاعت پر سے بنگالیوں کا اعتماد اٹھ گیا۔ وہ آل انڈیا ریڈیو اور دیگر غیر ملکی نشراتی اداروں کی طرف رجوع کرنے لگے۔ آل انڈیا ریڈیو — خواہ وہ نئی دہلی سے بول رہا ہو یا کلکتہ سے — بنگالیوں کے ذہن میں زہر گھولنے میں پیش پیش تھا۔ یہ ریڈیو بنگالیوں کے دلوں میں نفرت کے جذبات بھڑکانے اور انہیں اپنی جان، مال اور عزت کے تحفظ کی خاطر اپنا گھر بار چھوڑنے کی ترغیب دے رہا تھا۔ بہت سے بنگالی جو ہندوستان میں پناہ گزین ہوئے، کچھ فوجی کارروائی کے ستائے ہوئے تھے اور کچھ آکاش وانی کے پڑھائے ہوئے —

جن لوگوں نے ان حالات میں بھی اپنے گھروں میں ڈٹے رہنے کا فیصلہ کیا، انہوں نے اس بات میں مصلحت سمجھی کہ وہ کسی فوجی افسر یا باوردی فرد سے راہ و رسم پیدا کر لیں، کیونکہ خاکی وردی اور شہوت پانچابی بولی ذاتی حفاظت اور بقا کی ضمانت سمجھی جاتی تھی۔ ایسے واقعات بھی ہوئے کہ کئی کئی حضرات کسی نہ کسی بنگالی کنبے کی سرپرستی میں لگ گئے جس کنبے کو قدرت نے حسن کی دولت سے نوازا تھا، اسے بیک وقت کئی کئی فوجی افسروں کی سرپرستی حاصل ہو گئی۔

میں بھی ایک متمول بنگالی گھرانے میں زوشناس کرایا گیا۔ اس گھر کا مالک ایک مقامی اخبار کا ایڈیٹر تھا، لیکن اتنا مغرور کہ گزشتہ سوا سال کے دوران میں اس نے کبھی سیدھے منہ مجھ سے بات نہ کی تھی۔ اب وہ سراپا لطف و کرم بن کر میرے پاس آیا اور کہنے لگا کہ میں اس کے ساتھ چلوں تاکہ اس کے اہل خانہ کو تحفظ کا احساس ہو، کیونکہ پڑوس میں عمل صفائی سے ان کے دل دہل گئے ہیں۔ میں اس کے ساتھ ہولیا۔ اس کی والدہ، شادی شدہ بہن اور دیگر اہل خانہ سے تعارف کرانے کے بعد مجھے ڈرائنگ روم میں بٹھا دیا گیا۔ میرا میزبان اور اس کی نوبہا بہتا بیوی ساتھ والے صوفے پر براجمان ہوئے۔ میزبان چند لمحوں کی مہلت مانگ کر ہوٹل انٹرکانٹی نینٹل سے کسی مہمان کو لانے کے بہانے چلا گیا اور میں حسین کمرے میں حسین تر حسینہ کے ساتھ اکیلا رہ گیا۔ میں نے سوچا ان لمحوں کو خاموشی کی نذر کر دینا کفرانِ نعمت ہو گا کیوں نہ چند ٹیٹی میٹی بائیں ہو جائیں۔ میں نے گفتگو کا آغاز معذرت سے کرتے ہوئے کہا: "مجھے افسوس ہے کل رات آپ کے پڑوس میں . . . اس نے چھری کی طرح میری بات کاٹتے ہوئے کہا: "لا تعداد عورتوں پر مجرمانہ حملے کرنے اور ذاتی املاک کو بے تحاشا تباہ کرنے کے بعد اب تمہارا احساسِ مذہب جاگا ہے . . . میں نے کچھ کہنے کی کوشش کی، مگر وہ طوفانی انداز میں کہتی پئی گئی: "تمہیں شرم آنی چاہیے اپنے کرتوتوں پر"



مجھے خاکی وردی کے ایک ایک تار سے نفرت ہے، وحشیانہ ہرجوجی کے منہ پر رقم ہے پتہ نہیں میرا خاوند تمہیں یہاں کیوں لے آیا۔ تم یقیناً ان درندوں کے قہیلے سے ہو جنہوں نے گزشتہ شب میری بہن کے گھر گھس کر ہر چیز تس تس کر دی تھی“

میں نیم سکتے کے عالم میں اٹھا اور بوجھل قدموں کے ساتھ باہر نکل آیا۔

نفرت کے اس زہر کو ختم یا کم کرنے کی طرف کوئی خاص توجہ نہ دی گئی۔ مریض کے نفسیاتی علاج کو سراسر نظر انداز کر دیا گیا۔ ۲۵ مارچ کے بعد اگر کوئی تعمیری یا ثابت کام ہوا، تو وہ ریلوے لائنوں کی مرمت، کشتیوں کی آمد و رفت، اشیائے ضرورت کی نقل و حرکت، امن و امان کی بحالی وغیرہ تک محدود رہا۔ درحقیقت یہ کام بھی تسلی بخش طور پر پورا نہ ہو سکا، کیونکہ مسائل دیومیت تھے اور ان سے نپٹنے والے بالشتیے، اوہ بنیادی طور پر مسائل کی وسعت اور گہرائی کے ادراک سے محروم رہے۔ ان کی مثال اس چوہے کی سی تھی جو چلتے ہاتھی پر سواری یہ سمجھنے لگے کہ جس حصے پر اس کا قبضہ ہے، وہی ساری کائنات ہے اور وہی اس کا مالک ہے۔

ہاتھی کو اپنی گرفت میں لینے کے لیے راولپنڈی سے پانچ ہزار افراد پر مشتمل پولیس اور کوئی دو درجن سی۔ ایس۔ پی افسر بھیجے گئے۔ یہ لک بھبھے بے اثر ثابت ہوئی، کیونکہ ان کی تربیت ایک باقاعدہ انتظامی شعبے کو چلانے تک محدود تھی جبکہ ضرورت لخت لخت جسم کو بچا کر کے اس میں نئی روح پھونکنے کی تھی۔ بے شک نوکر شاہی سے سیمائی کی توقع عبث تھی، یہ کامیاب تلو اور مدبروں کا تھا۔ مگر افسوس کہ مارشل لا کے خارزار میں ایسے پھول نہیں کھلا کرتے۔



مکتی باہنی

۱۹۷۱ء کی جس شورش نے ماہ دسمبر میں پاکستان اور بھارت کے درمیان باقاعدہ جنگ کی صورت اختیار کی اس کی ابتدا مارچ ہی میں ہو چکی تھی۔ اس کی پشت پناہی بھارت کر رہا تھا جس کے آثار شروع ہی سے نظر آ رہے تھے۔ فوجی کارروائی کے فوراً بعد بھارت نے عملی حمایت و پروردہ اور اخلاقی حمایت سرعام شروع کر دی تھی۔

وزیر اعظم اندر گاندھی نے ۲۷ مارچ کو لوک سبھا میں تقریر کرتے ہوئے کہا: "میں ان معزز ارکان کو جنہوں نے دریافت کیا ہے کہ آیا مشرقی پاکستان کے بھران کے متعلق بروقت فیصلے کیے جائیں گے، یقین دلانا چاہتی ہوں کہ ہمارے نزدیک بروقت فیصلوں کی بہت اہمیت ہے، کیونکہ وقت گزر جانے کے بعد فیصلے کرنے کا کوئی فائدہ نہیں۔" چار روز بعد اسی ایوان نے حسب ذیل قرارداد منظور کی:

"یہ ایوان اُن (باغیوں) کو یقین دلانا چاہتا ہے کہ ان کی جدوجہد اور قربانیوں کو بھارت کی بھرپور ہمدردی اور حمایت حاصل رہے گی۔"

اسی روز بھارت کے ایک اہم ادارے کے سربراہ سٹراے۔ کے۔ سبرمنیم نے عالمی امور کی بھارتی کونسل کے زیر اہتمام مذاکرے میں یہ اعلان کیا:

"بھارت کو اب اس حقیقت کا اعتراف کر لینا چاہیے کہ اس کا مفاد پاکستان کی شکست و ریخت میں ہے اس طرح کا موقع ہمیں پھر کبھی نہیں ملے گا۔"

اس تقریر کے دوران انہوں نے پاکستان کو بھارت کا دشمن نمبر ایک قرار دیا اور موجودہ بھران کو صدیوں میں ایک سنہری موقع ٹھہرایا۔

عملی حمایت جو درپردہ جاری تھی اس کا ایک ثبوت بھارتی بارڈر سیورٹی فورس کے وہ سپاہی ہیں جو سرحد سے کئی میل اندر سلمٹ اور جیسور کے علاقوں میں پکڑے گئے۔ بعد میں اسی سرحدی فوج کے انسپکٹر جنرل نے اپنے سپاہیوں کو باغیوں کے اولین سرکاری میزبان قرار دیا۔ اس کے علاوہ بھارت کی باقاعدہ فوج کے کئی افسر سادہ کپڑوں میں مشرقی پاکستان میں گھس آئے تھے



اور پاک فوج کے خلاف مزاحمت میں مدد سے رہے تھے۔ ان میں سے دو افسروں نے بعد میں (میری اسیری کے دوران) بڑے فخر سے اپنے ان کارناموں کا اعتراف کیا۔

اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب بھارت، پاکستان کے اندرونی معاملات میں اس حد تک مداخلت کرتا تھا تو اس نے مارچ کے آخر یا اپریل کے شروع میں — جب پاکستان اندرونی خلفشار کا شکار تھا — مشرقی پاکستان پر حملہ کر کے اسے ہڑپ کیوں نہ کر لیا؟ اس کا جواب ہمیں بھارتی مصنف میجر جنرل (ریٹائرڈ) ڈی۔ کے پیٹ سے ملتا ہے۔ وہ اس کی وجہ بتاتے ہیں کہ بھارتی فوج کے سربراہ نے اس کی ذمہ داری قبول کرنے سے انکار کر دیا تھا، کیونکہ ان دنوں بھارتی فوج تنظیم نو کے مراحل سے گزر رہی تھی۔ ان کا کہنا ہے کہ پچاس ارب روپے کی لاگت سے پانچ سالہ دفاعی منصوبہ زیر تکمیل تھا اور بھارت کی جنگی مشین کو صیقل کرنے کے لیے ابھی اہم اقدامات کرنا باقی تھے۔ اس منصوبے کی تفصیل بتاتے ہوئے وہ لکھتے ہیں:

"فوج کی افرادی قوت (منصوبے کے مطابق) ابھی مکمل نہیں ہوئی تھی، کئی یونٹوں کی نفری کم تھی۔ رسالے کے بعض دستوں کا قیام بھی تشنہ تکمیل تھا۔ انتظامی امور اور نقل و حرکت کے وسائل کو بھی آخری شکل دینا باقی تھا۔ فضائی شعبے میں بگ ۲۱ لڑاکا طیاروں کی ساخت کا پروگرام عروج پر نہیں پہنچا تھا۔ علاوہ ازیں فاضل پوزوں کی کمی کے باعث بعض لڑاکا سکوارڈوں کی جنگی صلاحیتیں بھی کمزور پڑ گئی تھیں۔ بحریہ میں بھی ساز و سامان کی ترتیب جدید زیر عمل تھی۔ درحقیقت مسلح افواج کو بحر پور جنگ کی تیاری کے لیے چند ماہ کی مدت درکار تھی — اس کے علاوہ یہ امر بھی قابل توجہ تھا کہ خود بھارت کے اندر اس کے کئی ڈویژن (حالیہ انتخابات وغیرہ کی وجہ سے) ان امان بحال رکھنے پر مامور تھے۔ اس کی دو ڈویژن فوج مغربی بنگال آچکی تھی، مگر اس کے بھاری ہتھیار ابھی تک کشمیر میں پڑے تھے۔ اس کے علاوہ ایک ایک ڈویژن ناگالینڈ اور میزولینڈ (MIZO LAND) میں متعین تھا۔ فضائیہ کو مشرقی پاکستان پر بحر پور حملہ کرنے کے لیے اضافی ہوائی اڈے درکار تھے۔ سلچر میں واقع کڑی گرام کے ہوائی اڈے کو بھی توسیع دے کر جنگ کے لیے تیار کرنا باقی تھا۔"

بھارت سے شائع ہونے والی ایک اور کتاب سے پتہ چلتا ہے کہ بھارت کو مشرقی پاکستان پر چڑھائی کرنے کے لیے نومبر کا عرصہ درکار تھا۔ کتاب کے دو مصنفین کا کہنا ہے:

"اس کے لیے ہمیں نو مہینوں کی مہلت درکار تھی تاکہ ہم ہر طرح سے تیاری مکمل کر لیں، عالمی رائے عامہ کو ہموار کر لیں اور چین کی ممکنہ امداد کے خلاف روس کی یقین دہانی حاصل کر لیں۔ ان اقدامات کے بغیر حملے کا آغاز ممکن نہ تھا۔"

جب ہم خانہ جنگی میں مصروف تھے تو بھارت مذکورہ بالا تینوں محاذوں پر بحر پور کام کر رہا تھا۔ اس کی مسلح افواج کے سربراہ جلد از جلد اپنی جنگی مشینری کو صیقل کرنے میں لگ گئے۔ وزارت خارجہ سفارتی محاذ پر سرگرم ہوئی۔ اس نے روس سے دوستی کے معاملے



کی تجویز کو پرانی قانونوں سے مٹا لیا اور ہنگامہ کو روس سے باقاعدہ معاہدہ کر لیا۔ عالمی رائے عامہ کو ہموار کرنے کے لیے پندرہ گزینوں کے مسئلے کو بڑھا چڑھا کر دنیا کے سامنے پیش کیا؛ حالانکہ ان میں سے اکثر خود بھارت کی شہر پر اپنے گھروں کو چھوڑ کر بھاگ گئے تھے۔ ان تیاریوں کے ساتھ ساتھ بھارت نے پاک فوج کی جنگی صلاحیتوں کو گند کرنے کے لیے مکتی باہنی کو منظم کیا۔ مکتی باہنی میں ریڑھ کی ہڈی سابق ایسٹ بنگال رجمنٹ اور ایسٹ پاکستان رائفلز کے باغی افسر اور سپاہی تھے۔ ہندوستان میں ان کی صفوں میں عوامی لیگ کے رضا کار، یونیورسٹی کے طلبہ اور تنومند پناہ گزین بھی شامل کیے گئے۔ ان کی قیادت کرنل ریٹائرڈ ایم۔ اے جی عثمانی کے سپرد تھی جو اس کے باقاعدہ کمانڈر انچیف مقرر کیے گئے تھے۔

باغی فوج کو سیاسی چھاتہ مہیا کرنے کے لیے عوامی لیگ کی مفرد قیادت کو استعمال کیا گیا جو اب کلکتہ پنچ جکی تھی ان قائدین کو جلاوطن حکومت کی شکل دی گئی جس میں تاج الدین، قمر الزماں، منصور علی اور مشاق احمد خوند کر شامل تھے۔ اس حکومت کا مشن یہ تھا کہ مکتی باہنی کی مسلح جدوجہد اور بھارت کی سرپرستی سے بنگلہ دیش کو آزاد کرایا جائے۔

بھارت کے جنگی آقاؤں نے مکتی باہنی کے لیے حسب ذیل تین مقاصد مرتب کیے:

سب سے پہلے

وہ سارے مشرقی پاکستان میں پھیل کر پاک فوج کے ساتھ جھڑپوں کا آغاز کرے تاکہ مؤخر الذکر کی نقل و حرکت معطل ہو کر رہ جائے اور وہ حفاظتی اقدامات کے لیے متعلقہ علاقوں میں مقید ہو کر رہ جائے۔

اس کے بعد

گوریلا کارروائیوں کو رفتہ رفتہ تیز کر کے پاکستانی افواج کے مورال کو کمزور کیا جائے

تاکہ اگر پاکستان اس چھیر مچاڑ سے تنگ آکر کھلی جنگ پر مجبور ہو جائے تو یہی مکتی باہنی بھارت کی باقاعدہ فوج کے لیے مشرقی فیڈ فورس کا کام دے سکے۔

آخر کار

ان مقاصد کو سامنے رکھ کر ایک بھارتی جرنیل کی نگرانی میں مکتی باہنی کو تربیت دی گئی۔ شروع شروع میں تربیت صرف چار ہفتوں تک محدود تھی جس میں تخریبی کارروائیاں کرنے، کمین گاہوں پر گولیاں برسانے، دستی بم پھینکنے اور انفل چلانے کی مشق کرائی گئی۔ بعد میں تربیت کی مدت بڑھا کر آٹھ ہفتے کر دی گئی اور مذکورہ کاموں کے علاوہ تمام ہلکے ہتھیاروں کی تربیت دی گئی۔ اس طرح تیس ہزار افراد کو تربیت دے کر ایک منظم اور مسلح فوج تیار کی گئی اور اسے بھارت کی باقاعدہ فوج کے ساتھ شانہ بشانہ لڑانے کے استطاعت کیے گئے۔ ان کے علاوہ ستر ہزار مزید افراد کو گوریلا جنگ کی تربیت دے کر مشرقی پاکستان میں بھیجا گیا۔

مارچ کی فوجی کارروائی اور دسمبر کی باقاعدہ جنگ کے دوران ہونے والی گوریلا جنگ اور تخریب کاری کو تین ادوار میں تقسیم کیا جا سکتا ہے:



(جون اور جولائی) اس عرصے میں کئی باہنی نے اپنی کارروائیوں کو سرحدی علاقوں تک محدود رکھا جہاں اسے سرحد پار سے بھارتی فوج کی اخلاقی اور مادی امداد ملتی رہی۔ اس دور میں باغیوں میں زیادہ جرأت نہ تھی۔ وہ عموماً چھوٹی موٹی حرکتیں کر کے سرحد پار بھاگ جاتے اور جہاں کہیں خطرے کی بو آتی فوراً غائب ہو جاتے۔ ان کی زیادہ تر توجہ چھوٹی چھوٹی پٹلیاں اڑانے، متروکہ ریلوے لائن پر ٹرنگیں بچھانے اور ایک آدھوٹی بم پھینکنے پر مرکوز رہی۔

اگست۔ ستمبر اب ان کی تربیت اور طریق کار خاصا بہتر ہو گیا۔ ان کی ذاتی جرأت اور قائدانہ صلاحیتوں میں بھی نمایاں فرق نظر آنے لگا۔ اب وہ فوجی قافلوں اور کمپن گاہوں پر حملے کرنے، بھری جہازوں کو ڈوبنے اور اہم سیاسی شخصیتوں کو قتل کرنے لگے۔ ان کارروائیوں میں ڈھاکہ کو خصوصی اہمیت حاصل رہی۔

(اکتوبر۔ نومبر) اب وہ سرحدی علاقوں اور صوبے کے اندر بھی بہت مستعد ہو گئے۔ سرحدی چوکیوں پر بھارتی توپ خانے کی مدد سے باقاعدہ حملے کرتے اور اہم شہروں میں موٹر تخریبی کارروائیاں کرنے لگے۔ اس عرصے میں انہوں نے بعض سرحدی علاقوں میں گھس کر مورچے کھود لیے جہاں سے انہیں نہ ہٹایا گیا۔ بعد ازاں باقاعدہ جنگ کے دوران یہ مورچے بھارتی فوج کے لیے بہت مفید ثابت ہوئے۔

مذکورہ تین ادوار میں نہ صرف کئی باہنی کی تخریبی کارروائیوں میں شدت بڑھتی گئی، بلکہ اس کا دائرہ کار بھی وسیع ہوتا گیا اس سے پوری طرح عمدہ براہونے کے لیے کئی باہنی کے تربیتی کمپوں میں بھی بتدریج اضافہ کیا گیا۔ شروع میں ان کی تعداد تیس تھی جو اگست میں چالیس ہو گئی اور ستمبر میں چوراسی تک پہنچ گئی۔ ہر کمپ میں ایک تربیتی مدت کے دوران پانچ سو سے دو ہزار افراد کو تربیت دینے کی گنجائش تھی۔ تمام کمپوں سے تربیت پانے والوں کی کل تعداد ایک لاکھ تھی۔

ان شہریندوں اور باغیوں کے لیے ہتھیار اور دوسرا جنگی سامان حاصل کرنے میں بھارت کو شروع شروع میں وقت کا سامنا کرنا پڑا، مگر روس سے "معاہدہ دوستی" کے بعد یہ مشکل حل ہو گئی۔ فوجی حربے سے متعلق ایک مطالعاتی اور تجزیاتی ادارے کی ایک رپورٹ کے مطابق روسی حکومت نے بھارت کو یقین دلایا کہ کئی باہنی کو دیے گئے ہتھیاروں کی جگہ مزید ہتھیار دیے جائیں گے، تو بھارت نے باغیوں کو اسلحے کی سپلائی میں اضافہ کر دیا۔ اس کے علاوہ ایک برطانوی خاتون صحافی نے جو تازہ تازہ مشرقی یورپ سے آئی تھیں، مجھے بتایا کہ مشرقی یورپ میں دوسری جنگ عظیم کے متروکہ روسی اسلحے کے ڈھیر لگے ہیں اور وہ اب بھارت کو منتقل کیے جا رہے ہیں۔ ہتھیار حاصل کرنے کا ایک اور ذریعہ براہ راست خرید تھا جو بنگلہ دیش کی جلاوطن حکومت نے بھارت اور روس کی مدد سے غیر ملکی منڈیوں سے خریدتی تھی۔ اس کے لیے بنگلہ دیش کے غیر سرکاری سفیر انگلستان اور امریکہ میں فنڈ اکٹھے کرتے تھے۔

یہ تو تھا سرحد کے اس پار جنگی تیاریوں کا حال! ایسے دیکھیں کہ اس چیلنج سے نپٹنے کے لیے پاکستان کے وسائل کیا تھے؟

مشرقی بازو میں پاکستان کے ۱۲۶۰ افراد اور ۲۱۰۶ سپاہی متعین تھے جن کے ذمے ۵۵۱۲۶ مربع میل علاقے کا دفاع تھا۔ دوسری جنگ عظیم کے مشہور گوریل لیڈر ٹی۔ ای۔ لارنس نے اپنی کتاب میں لکھا ہے کہ ہر چار مربع میل قطعہ اراضی کی حفاظت کے لیے بیس سپاہی درکار ہوتے ہیں۔ لارنس نے یہ تناسب صحرائی جنگ کے تناظر میں مقرر کیا تھا جہاں حدنگاہ کافی دور تک جاتی ہے مگر مشرقی پاکستان میں وافر درختوں اور بننے کی وجہ سے حد نظر خاصی محدود تھی جس کا مطلب یہ تھا کہ یہاں تھوڑے علاقے کے لیے زیادہ نفری درکار تھی۔ لیکن اگر ٹی۔ ای۔ لارنس کے فارمولے سے بھی اندازہ لگایا جائے تو مشرقی پاکستان کی حفاظت کے لیے ۳۷۵۶۴ افراد درکار تھے، یعنی دستیاب وسائل سے تقریباً سات گنا زیادہ! ایک غیر ملکی صحافی ڈیوڈ لوشک نے مطلوبہ تعداد کا کم از کم اندازہ دو لاکھ پچاس ہزار لگایا تھا۔

ان نامساعد اور صبر آزما حالات کے باوجود فوج نے باغیوں کاوٹ کر مقابلہ کیا اور پورے آٹھ مہینے اپنے پاؤں میں تعزیش نہ آنے دی۔ اس نے اہم ضلعی ہیڈ کوارٹرز اور سب ڈویژنل ہیڈ کوارٹرز سمیت تمام بڑے بڑے شہروں اور قصبوں کو مکئی باہنی سے محفوظ رکھا۔ تین سو شتر سردی جو کیوں میں سے دو سو ساٹھ جو کیوں کو اپنے قبضے میں رکھا۔

فوج نے اپنی کارروائی کے لیے بڑے بڑے شہروں میں اپنا اڈہ یا ہیڈ کوارٹرز بنا رکھا تھا جہاں سے فوجی دستے گرد و نواح کے علاقوں میں باغیوں کی سرکوبی اور تخریبی کارروائیوں کی روک تھام کے لیے جایا کرتے تھے۔ شروع شروع میں یہ فوجی بڑی پھرتی اور مستعدی سے نقل و حرکت کرتے اور باہنی ان کا مقابلہ کیے بغیر جھاگ جاتے۔ بعد میں تھکاوٹ کے آثار ابھرنے لگے اور

ہمارے فوجی صرف اسی وقت کارروائی کرتے جب یہ ناکزیر ہو جاتی، خواہ مخواہ اصلی یا نقلی تخریب کاروں کا پھیلنا کرتے۔ تیسرے مرحلے (اکتوبر۔ نومبر) میں وہ عموماً اپنے ہیڈ کوارٹرز سے چپک کر رہ گئے اور باہر نکل کر خطرہ مول لینے سے گریز کرنے لگے۔ شورش کے ان آٹھ مہینوں کے مختلف ادوار کا کرافٹ بنایا جانے، توپہ چلانا ہے کہ جوں جوں مکتی باہنی کی کارروائیاں ٹرحتی گئیں، ہماری دفاعی کارروائیاں کم ہوتی گئیں۔ بلکہ ان کے زیادہ مناسب ہو گا کہ جوں جوں ہماری کارروائیاں کھٹنے لگیں، مکتی باہنی کی حرکتیں تیز اور زور پورے ہو گئیں۔

ان کارروائیوں کے مذہبزر کے ساتھ ساتھ بنگالی عوام کا رویہ بھی بدلتا رہا۔ وہ عموماً جیتنے والی ٹیم کا ساتھ دیتے تھے۔ جب ہمارے فوجی باغیوں کو مار بھگاتے تو مقامی لوگ ان کا دم بھرنے لگتے۔ لیکن جونہی وہ واپس ہیڈ کوارٹرز جاتے اور باغی متعلقہ علاقوں میں گھس آتے تو بنگالی اپنے نئے آقاؤں کو خوش آمدید کہتے۔ بعض افراد اتنے ہوشیار تھے کہ انہوں نے بنگلہ دیش اور پاکستان دونوں ممالک کے قومی پرچم بنوار کھے تھے اور حسب ضرورت ایک جھنڈا اپنے مکان پر لہرا دیتے تھے۔ صحیح وقت پر چھیننے کا صحیح مقام پر ہونا عموماً واقع بلا سمجھا جاتا تھا۔

لیکن سبھی بنگالی اتنے خوش قسمت یا ہوشیار نہ تھے کہ وہ مرغ باد تباہ کر اپنی جان بچا لیتے۔ ان میں سے کئی پاک فوج اور مکتی باہنی کی آویزش میں اپنا سب کچھ کھو بیٹھے۔ نمونے کے طور پر ایک واقعہ بیان کرتا ہوں:

ماہ اگست میں ضلع لواکھلی کے ایک علاقے سے اطلاع ملی کہ وہاں مکتی باہنی نے مصیبت ڈھا رکھی ہے۔ ایک نوجوان



افسر کو سات سپاہیوں سمیت ان کی سرکوبی کے لیے روانہ کیا گیا اور چلتے وقت اسے ہدایت کی گئی کہ وہ طاقت کے بجائے سلیقے اور لچک سے کام لے کر اس علاقے کو تخریب کاروں سے پاک کر دے۔ سلیقے اور لچک کی پالیسی پر عمل کرتے ہوئے وہ سات میں سے پانچ سپاہیوں سے ہاتھ دھو بیٹھا۔ اطلاع ملنے پر ایک اور کپتان کو کمک دے کر روانہ کیا گیا۔ اس نے اندازہ لگایا کہ باغی اور اسلحے ایونٹین کے ساتھ مورچہ بند ہیں اور باقاعدہ معرکہ آرائی پر تلے ہوئے ہیں۔ وقت یہ تھی کہ ان کے مورچے ایک گاؤں میں واقع تھے جہاں سویلین لوگ بھی بستے تھے۔ نوجوان کپتان نے دور سے کئی بار احتیاط کیا، مگر کوئی اثر نہ ہوا۔ پچھلے اس نے سارے گاؤں کو گھیرے میں لے کر چاروں طرف سے اس پر گولہ باری شروع کر دی۔ دھوئیں کے بادلوں کے ساتھ چیخیں بھی بلند ہونے لگیں۔ تھوڑی دیر بعد ایک لوزھا آدمی سفر جھنڈا اٹھائے باہر نکلا اور امن کی بھیک مانگنے لگا۔ اس کی درخواست فوراً قبول کر لی گئی، لیکن اتنے میں کئی بے گناہ جانیں ضائع ہو گئیں۔

یہ تو تھا باغیوں کو پناہ دینے والوں کا حشر! جو بنگالی پاک فوج سے تعاون کے ترکب پائے جاتے، ان کا حشر کہیں زیادہ عبرتناک ہوتا۔ انہیں نہ صرف ہلاک کر دیا جاتا، بلکہ بعض اوقات ان کی لاشیں درختوں سے ٹانگ دی جاتیں۔ ان حالات میں اہم مسئلہ یہ تھا کہ باغیوں کو معصوم شہریوں سے کس طرح الگ کیا جائے۔ ایک موقع پر جنرل ٹکا خاں کے سامنے یہ تجویز پیش کی گئی کہ سرحد سے ملحق دو میل کی پٹی کو آبادی سے خالی کر لیا جائے تاکہ جو مشتبہ شخص نظر آئے اسے گولی سے آڑا دیا جائے۔ ٹکا خاں نے یہ تجویز رد کر دی اور وجہ یہ بتائی کہ اس سے آباد کاری کا مسئلہ کھڑا ہو جائے گا۔ ان کا خیال تھا ہر ستمبر کے عام معافی کے اعلان کے بعد بھارت سے پناہ گزین بھی لوٹنا شروع ہو جائیں گے جن کی آباد کاری بذات خود بہت بڑا مسئلہ ہو گا۔ سرحدی علاقہ خالی کر کے اضافی سرحدی کیوں مول لی جائے؟

چنانچہ بنگالی عوام اور باغیوں کا باہمی ربط قائم رہا۔ وہ ایک جیسے کپڑے پہنتے اور ایک جیسے خدو خال رکھتے تھے، اس لیے یہ شناخت کرنا مشکل تھا کہ کون معصوم ہے اور کون شہر پسند! واحد علامت ہتھیار تھا جو باآسانی چھپایا یا اٹھایا جاسکتا تھا، کیونکہ وہاں اونچی اونچی گھاس، موسمی فصل یا جنگلی سبزہ بہت تھا اس سلسلے میں ایک واقعہ سنئے:

خبر ملی کہ شہر پسند راجشاہی کے علاقے روحانپور میں داخل ہو کر لوگوں کو روٹی، رہائش اور نقد رقم دینے پر مجبور کر رہے ہیں۔ فوجیوں کی ایک ٹولی اس گاؤں کی چھان بین کے لیے روانہ کی گئی۔ تلاش کے باوجود کسی شہر پسند کا سراغ نہ ملا، البتہ ایک کھیت میں کام کرتے ہوئے تین کسان نظر آئے، لیکن بے ضرر کسانوں کو چھپنا مناسب نہ تھا؛ لہذا وہ مایوس ہو کر لوٹنے لگے، تاہم پانچوں شخص سے ان کی اچانک ملاقات ہو گئی۔ انہوں نے اسے پکڑ کر پوچھنے شروع کی، مگر اس نے کوئی مدد نہ کی۔ اسے سنگین دکھا کر دھمکی دی گئی کہ اگر اس نے شہر پسندوں کا اتہ پتہ نہ بتایا، تو اسے ہلاک کر دیا جائے گا۔ اس نے تینوں کسانوں کی طرف اشارہ کیا۔ انہیں فوراً حراست میں لے لیا گیا اور ان کی نشاندہی پر اسی کھیت میں سے متعدد گریفینڈ، دھماکا خیز بم اور بنگلہ دیش کے پرچار کے لیے مطبوعہ اشتہار حاصل کیے گئے۔ یہ تینوں کتنی باہمی کے سرگرم رکن نکلے۔

پاک فوج کو دھوکہ دینے کے لیے باغیوں نے اور بھی کئی ہتھکنڈے اختیار کیے مثلاً جیسور سکیٹر میں مینا پول اور راکونا تھ کے درمیان دو پاکستانی سپاہی گشت کر رہے تھے۔ سامنے سے ایک مفلوک الحال شخص آتا دکھائی دیا جس کے ہاتھ میں سبزی کا تھیلا تھا۔ تھیلے سے باہر سبزی ڈور سے دکھائی دے رہی تھی۔ انہوں نے یونہی بھیک ماری اور چلا کر پوچھا: کون ہو تم؟ تو وہ تھر تھر کانپنے لگا۔



اس کے تھیلے کی تلاشی لی گئی، تو اس میں سے تخریبی کارروائی کے لیے ٹائم فیوز اور دیگر سامان نکلا۔ اسی طرح ایک بار لیفٹیننٹ فرسخ نے ورینے برہم پترا کے پاٹ سے ایک کشتی پکڑی جس پر بظاہر موسمی پمپ لگے ہوئے تھے، لیکن اندر بارودی سرنگیں اور گریڈ بھرے تھے۔

علاوہ ازیں مدافعت سے بچنے کے لیے باغی عموماً کچے راستوں سے آتے جاتے تھے جبکہ فوجی اکثر کچی سڑکیں استعمال کرتے تھے۔ رنگپور سے ایک باغی نے سرحد پار اپنے ایک رفیق کار کو خط لکھا: "پاک فوج ہمیں کبھی نہیں پکڑ سکتی، کیونکہ وہ عام شاہراہوں کشتیوں کے اڈوں اور بڑے بڑے گھاٹوں کی رکھوالی میں مصروف رہتی ہے جبکہ ہم متروک راستے استعمال کرتے ہیں۔ اس پر طرہ یہ کہ وہ کشتی کی تلاشی لیتے وقت یہ نہیں دیکھتے کہ اس کی نچلی سطح میں کیا رکھا ہے۔ اس کے علاوہ یہ عموماً امام مسجدوں اور امن کیٹی کے ارکان کے گھروں پر نظر نہیں رکھتے جبکہ یہی ہماری پناہ گاہیں ہیں۔ ہمارا طریقہ کار مکارانہ، مگر ہمارا مقصد عظیم ہے یقیناً فتح ہماری ہوگی۔"

وقت گزرنے کے ساتھ تخریب کاری کی تکنیک میں بھی نفاست آتی گئی مثلاً شروع میں وہ بوجی ٹریپ اور سیٹھی والو استعمال کرتے تھے۔ جب انہیں پتہ چلا کہ ہم ان سے بچنے کی تدبیر پاگئے ہیں تو ہم عموماً فوجی قافلے کے آگے خالی چھکڑا یا ریل گاڑی کا خالی ڈبہ چلا دیتے تھے، تو تخریب کاروں نے دُور سے کنٹرول کیے جانے والے (REMOTE CONTROL) اور بجلی سے چلنے والے دھماکہ خیز بم استعمال کرنے شروع کر دیے جن کی مدد سے وہ چلتی گاڑی کو حسبِ فضا اڑا سکتے تھے۔ اسی طرح وہ پہلے دھماکے ساتھ لاتے تھے مگر بعد ازاں ڈرائی بیٹری سیل استعمال کرنے لگے کیونکہ انہیں ٹارچ وغیرہ میں آسانی لایا جاسکتا تھا۔

بحری علاقوں میں انہوں نے اپنے طریقہ کار کو بہتر بنایا۔ پہلے وہ بارودی سرنگ وغیرہ کسی ساکن جہاز یا کشتی سے باندھ جاتے تھے، مگر بعد میں لمپٹ ماکن استعمال کرنے لگے جس کے منہ پر مقناطیس لگا ہوتا جو نارگٹ کے قریب آکر خود بخود اس سے چپک جاتا اور مطلوبہ وقت پر پھٹ جاتا تھا۔ جب یہ کام بھی ناکافی لگا تو انہوں نے بھارت کے تربیت یافتہ غوطہ خور بھجئے شروع کیے جو زیرِ آب تیرتے ہوئے جہاز وغیرہ کے پاس آتے اور اس سے تباہ کن سرنگ چپکا کر خاموشی سے واپس چلے جاتے۔ بھارت نے ایسے من سو غوطہ خور تیار کیے تھے۔ زیادہ عرصہ زیرِ آب رہنے کے لیے وہ عموماً بانس بانز کی تلی نالی سطح آب پر رکھتے جس سے سانس لینے میں سولت رہتی۔ بعض اوقات وہ پانی کے بہاؤ کے ساتھ بانس یا کیلے کے تنے سے بارودی سرنگ بند دیتے، جو اپنی مقناطیسی قوت کی وجہ سے نارگٹ سے خود بخود لگ جاتی۔

تخریب کاروں کی کارکردگی کی فہرست خاصی طویل ہے، مگر ان کے ہاتھوں مکمل یا جزوی طور پر تباہ ہونے والے چیزوں میں چند جہاز ۳۳ پمپ، ریل کی ۱۲۲ پٹریاں اور بجلی کی ۱۰ تنصیبات شامل ہیں۔

آٹنا زیادہ نقصان پہنچانے کے لیے جس جذبے کی ضرورت تھی اس کا اندازہ اس واقعے سے لگایا جاسکتا ہے جو راجستھان کے علاقے روہانپور میں ماہ جون میں پیش آیا۔ تخریب کاری کے شبہ میں ایک نوجوان بنگالی کو پکڑ کر کپٹی ہینڈ کوارٹر میں لایا گیا، اس سے

۱۔ BOOBY TRAP: کسی چیز سے دھماکہ یا تباہ کن مواد اس طن باندھ دیا جانے کے لیے ہلاتے ہی چپکے

۲۔ SAFETY VALVE: تخریب کاری کی ایسی ترکیب جس میں تخریب کار دُور ہی سے تباہ کن دھماکہ کر سکتا ہے۔



پوچھ گچھ کی گئی مگر اس نے زبان کھولنے سے انکار کر دیا۔ جب سب ہتھکنڈے بے اثر ثابت ہوئے تو میجر نے اپنی شہین گن اس کے سینے پر رکھ کر کہا: بتاؤ: ورنہ گولیاں تمہارے سینے سے پار ہو جائیں گی۔ وہ نیچے جھکا، زمین کو بوسہ دیا اور آسمان کی طرف منہ کر کے کہنے لگا: اب میں موت کی آغوش میں جانے کو تیار ہوں، میرا خون اس مقدس سرزمین کو یقیناً آزادی سے بھنکار دے گا۔

پاک فوج کو نہ صرف ایسے جذبے کا سامنا تھا بلکہ اس کی مشکلوں میں بنگالی موسم کا بھی بہت دخل تھا۔ خاص طور پر موسم برسات بہت کڑا تھا، کیونکہ ہمارے سپاہی عموماً پنجاب یا صوبہ سرحد سے تعلق رکھتے تھے اور سپاہی یا کشتی رانی سے نااہل تھے۔ اگرچہ ان میں سے بعض کو آبی جنگ کی تربیت دی گئی تھی، مگر وہ ذہنی طور پر اپنے آپ کو پانی کے خوف سے آزاد نہ کر سکے۔ اس کے برعکس تخریب کار مچھلی کی طرح پانی سے مانوس تھے اور وہ کبھی تیر کر اور کبھی کشتی میں بیٹھ کر اپنا کام کر جاتے تھے کئی دفعہ ان کے تعاقب میں ہمارے سپاہیوں کی کشتی یا ٹوٹو خود بخود الٹ گئی یا تخریب کاری کا نشانہ بن گئی۔ بعض جگہوں پر وہ شہریندوں کے تعاقب میں پیدل پانی یا دلدل میں گھس جاتے جہاں سمندری گھاس یا جوئیں ان کی ٹانگوں سے پیٹ جاتیں۔ یہ لیفٹیننٹ شاہد کو دیکھا جس کی ٹانگوں پر جوئوں کے ان گنت زخم تھے۔ یہ زخم جنگ کے بعد بھی ایک عرصے تک مندمل نہ ہوئے۔

خوجی کارروائیوں کے دوران بعض فوجی لوٹ مار، قتل و غارت اور آبروریزی کے بھی مرتکب ہوئے۔ ان معدودے چند اشخاص کی حرکتوں سے پوری فوج کی رسوائی ہوئی۔ آبروریزی کی کل نو وارداتوں کی اطلاع ملی اور نوکے تو جرموں کو عبرتناک سزا میں دی گئیں، مگر ان سزاؤں سے رسوائی کا داغ نہ دھویا جاسکا۔ مجھے ایسے واقعات کی مجموعی تعداد کا اندازہ نہیں لیکن میں سمجھتا ہوں کہ ایسا ایک واقعہ ہی ساری فوج کو رسوا کرنے کے لئے کافی تھا۔

ان غیر ذمہ دارانہ حرکات نے بنگالی عوام کو بدظن کرنے میں اہم کردار ادا کیا۔ اگرچہ ہم پہلے بھی ان کے چہیتے نہ تھے، لیکن ان واقعات سے وہ ہم سے سخت نفرت کرنے لگے۔ اس نفرت کو کم کرنے کے لیے کوئی مثبت کوشش نہ کی گئی؛ لہذا مشرقی پاکستان کی اکثر آبادی ہم سے کٹی رہی۔ صرف اسلام پسند عناصر نے اپنی جان پھینکی پر رکھ کر ہم سے تعاون کیا۔ ان اسلام پسند اور محبت وطن عناصر کو دو گروہوں میں منظم کیا گیا۔ عمر رسیدہ افراد پر مشتمل امن کمیٹیاں قائم کی گئیں اور صحت مند نوجوانوں کو رضا کار بھرتی کر لیا گیا۔ یہ کمیٹیاں ڈھاکہ کے علاوہ دیہی علاقوں میں بھی قائم کی گئیں اور ہر جگہ فوج اور مقامی لوگوں کے درمیان رابطے کا مفید ذریعہ ثابت ہوئیں۔ ان کمیٹیوں کے چیئرمین اور ارکان شہریندوں کے غصے کا کئی بار ہدف بنے اور ان میں سے ۲۵۰ افراد شہید زخمی یا اغوا ہوئے۔

رضا کاروں کی تنظیم کے دو مقاصد تھے۔ ایک یہ کہ ان سے پاک فوج کی افرادی قوت میں اضافہ ہوگا اور دوسرے مقامی لوگوں میں دفاع وطن میں شرکت کا احساس پیدا ہوگا۔ اس تنظیم کی مطلوبہ نفری ایک لاکھ تھی، مگر ان میں سے مشکل بحال ہزار افراد کو فوجی تربیت دی جاسکی۔ ستمبر کے مہینے میں پی پی پی کا ایک وفد ڈھاکہ گیا اور اس نے جنرل نیازی سے شکایت کی کہ انہوں نے جماعت اسلامی کے کارکنوں پر مشتمل نئی فوج کھڑی کر لی ہے جنرل نیازی نے مجھے بلا کر کہا کہ آئندہ سے رضا کاروں کو "شمس" اور "البدز" کے نام سے پکارا کرو تا کہ پتہ چلے ان کا تعلق صرف ایک پارٹی سے نہیں۔ میں نے تعمیل ارشاد کی۔

"البدز اور شمس" رضا کاروں نے پاکستان کی سلامتی کے لیے اپنی زندگیاں وقف کر رکھی تھیں۔ وہ ہر وقت پاک فوج کے ہر حکم پر لبیک کہتے تھے۔ انہیں جو کام سونپا جاتا، وہ پوری ایمانداری اور بعض اوقات جانی قربانی سے ادا



کرتے۔ اسی تعاون کی یادداشت میں تقریباً پانچ ہزار رضا کاروں یا ان کے زیر کفالت افراد نے شہرپندوں کے ہاتھوں نقصان اٹھایا۔ ان کی بعض قربانیاں روح کو گرا دیتی ہیں، مثلاً نواب گنج مٹانے میں واقع ایک گاؤں کا لپور میں شہرپندوں کی سرکوبی کے لیے ایک فوجی دستہ بھیجا گیا جس کی رہنمائی کے لیے ایک رضا کاران کے ساتھ گیا۔ مشن کامیاب رہا اور باغیوں کو ٹھکانے لگا دیا گیا لیکن جب وہ واپس اپنے گاؤں پہنچا، تو پتہ چلا کہ شہرپندوں نے اس کے تین بیٹوں کو شہید اور اس کی اکلوتی بیٹی کو اغوا کر لیا ہے۔ اسی طرح گما سپور (راجشاہی) میں ایک پل کی حفاظت کے لیے ایک رضا کار تعینات تھا۔ اسے باغیوں نے ادبوجا اور سنگین مار مار کر مجبور کرنے لگے کہ "جئے سنگھ" کا نعرہ لگاؤ، مگر وہ آخری دم تک "پاکستان زندہ باد" کہتا رہا۔

رضاکار اسلحے اور تربیت کے لحاظ سے کتنی باہمی سے کمزور تھے۔ ان کو مشکل دو سے چار ہفتوں کی ٹریننگ دی گئی تھی جبکہ کتنی باہمی آٹھ ہفتوں کی بحرور تربیت حاصل کر چکی تھی۔ اول الذکر کے پاس ۳۰۳ کی ویٹاوسی رائفلیں تھیں جبکہ مؤخر الذکر نسبتاً جدید سازو سامان سے لیس تھے۔ اس تفاوت کی وجہ سے رضا کار شاذ و نادر ہی شہرپندوں کا مقابلہ کرتے، چنانچہ انہیں عموماً پاک فوج کے ساتھ ہی کسی مشن پر روانہ کیا جاتا اور اپنے طور پر کوئی مہم ان کے سپرد نہ کی جاتی۔

اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ کتنی باہمی کا مقابلہ پاک فوج کو کرنا پڑا جس نے نامساعد حالات میں بڑی تندہی سے اپنے فرائض کو پورا کیا۔ ان حالات میں جس چیز کا سب سے بڑا اثر مورال پر پڑا وہ شہیدوں اور زخمیوں کی دیکھ بھال تھی۔ جو لوگ سرحدی علاقوں میں زخمی ہو جاتے تھے انہیں پیچھے ہسپتالوں میں منتقل کرنے میں یہ وقت تھی کہ چوکیوں کو جانے والے تمام راستوں میں شہرپندوں نے یا تو بارودی سرنگیں بچھا رکھی تھیں یا گھات سے ان پر چلنے والے ٹریفک پر ناز کرتے تھے، اس لیے زخمیوں کو نکالنے کا واحد ذریعہ ہیلی کاپٹر تھا جس کے استعمال پر یہ شرط عائد تھی کہ پہلے متعلقہ رجمنٹ کا ڈاکٹر یہ تصدیق کرے کہ واقعی زخمی کی حالت اتنی خراب ہے کہ ہیلی کاپٹر کے ذریعے اسے نکالنا ضروری ہے۔ یہ ڈاکٹر عموماً سرحدی چوکی سے میلوں پیچھے بنالین ہسپتال کو آ رہے ہیں۔

بیشا ہوتا اور اس کے لیے سرحدی چوکی تک پہنچنا بھی اتنا ہی مشکل ہوتا جتنا زخمی کو وہاں سے واپس لانا۔ جو خوش قسمت کسی نہ کسی طور سی ایم ایچ میں پہنچ جاتے، ان کی حالت دیکھی نہ جاتی۔ کسی کے اعضا سرے سے غائب ہوتے اور کسی کا چہرہ بڑی طرح سخ ہوتا۔ کوئی کانوں سے معذور ہو چکا ہوتا اور کوئی آنکھوں سے محروم! ان میں سے اکثر ایسے تھے جو بیچ تو گئے تھے، مگر ہمیشہ کے لیے اپاہج ہو کر رہ گئے۔

جہاں تک شہداء کا تعلق ہے، شروع میں ہم انہیں فضائی راستے سے مغربی پاکستان بھیجتے رہے، لیکن جولائی، اگست میں جب ان کی تعداد میں اضافہ ہو گیا، تو یہ سلسلہ بند کر دیا گیا، کیونکہ اس سے مغربی پاکستان میں غیر ضروری خوف و ہراس پھیلنے کا اندیشہ تھا۔ انہی دنوں چیف آف جنرل اسٹاف ڈاکٹر تشریف لائے۔ تازہ پالیسی سے مورال متاثر ہونے کی طرف ان کی توجہ مبذول کرانی گئی۔ انہوں نے فرمایا: "مردہ بے گارہ ہے، خواہ وہ مشرقی پاکستان میں ہو یا مغربی پاکستان میں۔"

شہداء کے وارث بہر طور چاہتے تھے کہ ان کے عزیزوں کی لاشیں انہیں پہنچائی جائیں۔ مجھے وہ خط یاد ہے جو ایک شہید کی بہن نے ۳۱ ایف ایف کے کمانڈنگ آفیسر کو بھیجا تھا۔ اس نے لکھا تھا: "آپ جب کراچی سے روانہ ہوئے، تو میں نے اپنا کبھر و بجائی آپ کے ساتھ بھیجا تھا۔ اگر آپ اسے صحیح سالم واپس نہیں لاسکتے، تو اس کی لاش بھجوانا نہ بھجویے گا۔ یہ بہن پھر کبھی اپنے بجائی کو نہ دیکھ سکی۔ زندہ یا زندہ جاوید!"



ٹنگا خاں کی واپسی

مشرقی پاکستان میں شورش پیارہی اور یچی خاں راولپنڈی میں بیٹھے تماشا دیکھتے رہے۔ یوں معلوم ہوتا تھا وہ ۲۵ مارچ کی فوجی کارروائی کا حکم دے کر طویل ذہنی رخصت پر چلے گئے ہیں۔ انہیں اس بات کی کوئی فکر نہ تھی کہ افواج پاکستان نے خون پسینے سے جو اہلیت حاصل کی ہے اس سے فائدہ اٹھا کر حالات کو سدھارنے کے لیے کوئی قدم اٹھائیں۔ کیا وہ مشرقی پاکستان کے انجام سے مایوس ہو چکے تھے؟

یچی خاں کی بے عملی کی کئی توضیحات کی گئی ہیں، ان میں سے بعض سیاسی تجزیے پر مبنی ہیں اور بعض محض قیاس آرائیاں! ایک توضیح یچی خاں کے وزیر پروفیسر جی۔ ڈبلیو چودھری نے مہیا کی ہے۔ وہ فرماتے ہیں: ان مہینوں میں یچی خاں ذہنی طور پر ماؤف نظر آتا تھا اور مجھ سے بات کرنے سے بھی کتراتا تھا۔ چودھری صاحب نے یہ تاثر دینے کی کوشش کی ہے کہ یچی خاں اتنے حساس طبع تھے کہ انہیں فوج کی بربریت سے گہرا صدمہ پہنچا تھا اور وہ حیران تھے کہ وہ اس کی تلافی کس طرح کریں۔

اس کے برعکس یچی خاں کے عملے کے ایک مہجر جنرل نے مجھے بتایا کہ جون میں یچی خاں نے ڈھاکہ جانے کا پروگرام بنایا اور وہ راولپنڈی سے روانہ بھی ہوئے، مگر کراچی میں اس کتیا کے چنگل میں ایسے پھنسے کہ ڈھاکہ جانا بھول گئے (غالباً ان کا اشارہ اس خاتون کی طرف تھا جس کی قربت سے صدر مملکت راحت پاتے تھے)۔

یچی خاں کے ٹولے کے ایک سینئر رکن نے بالواسطہ طور پر یچی خاں کے ڈھاکہ نہ آنے کی وجہ یہ بتائی: جب تک ان ہنگالیوں کے ہوش ٹھکانے نہیں لگ جاتے، ہم ان سے بات نہیں کریں گے؛ آخری وضاحت خود یچی خاں سے ملتی ہے جو انہوں نے ایک صحافی کو دی تھی۔ انہوں نے فرمایا تھا: جب بھی میں ڈھاکہ جانے کا ارادہ کرتا ہوں میرا شائف اس کے خلاف مشورہ دیتا ہے اور کہتا ہے کہ میرے وہاں جانے سے سود مند نتائج برآمد نہیں ہوں گے۔

یچی خاں اگر چاہتے تو ڈھاکہ گئے بغیر بھی ضروری اقدامات کر سکتے تھے، مگر انہوں نے کوئی ایسا قدم نہ اٹھایا جس سے صورت حال پر خوشگوار اثر پڑتا۔ مارچ والی فوجی کارروائی اور دسمبر کی جنگ کے درمیانی عرصے میں یچی خاں نے صرف دو فیصلے کیے۔ ایک جنرل ٹنگا خاں کی تبدیلی اور دوسرے باغیوں کے لیے عام معافی کا اعلان۔ کہا جاتا ہے پہلا اقدام انہوں نے بعض ملکی اور غیر ملکی ہی خواہوں کے اصرار پر اٹھایا تھا، کیونکہ ان کے خیال میں جب تک مشرقی پاکستان کی باگ ڈور ٹنگا خاں کے ہاتھ میں ہے وہاں حالات سدھ نہیں سکتے۔

یچی خاں نے اس تجویز کو تسلیم کرنے کے بعد سب سے پہلے جناب نور الامین کو صوبائی گورنر کا عہدہ پیش کیا، مگر انہوں نے خرابی صحت

لے مقدمہ پاکستان کے آخری ایام۔ از پروفیسر جی۔ ڈبلیو چودھری۔ صفحہ ۱۹۱۔



کی بنا پر یہ ذمہ داری قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ پھر نگاہ انتخاب ڈاکٹر اے ایم مالک پر پڑی جو تعلیم کے لحاظ سے دندان ساز پیشے کے لحاظ سے سیاست دان اور عملی طور پر مزدور رہنما تھے۔ انہوں نے کبھی خاں کی پیش کش قبول کر لی۔

یہی خاں کو یہ مشورہ بھی دیا گیا کہ ٹنگا خاں کو گورنری سے ہٹا کر جنرل نیازی کی جگہ کمانڈر ایسٹرن کمانڈ بنا دیا جائے یا نیازی کی موجودگی میں مارشل لا اینڈ منسٹر ٹیڑھ مقرر کیا جائے تاکہ صوبے میں تین بڑی شخصیتیں ہو جائیں۔ ڈاکٹر مالک گورنری کی کرسی پر۔ جنرل ٹنگا خاں مارشل لا اینڈ منسٹر ٹیڑھ کی گدی پر اور جنرل نیازی سپہ سالار کی مندر پر۔ لیکن جنرل یہی خاں نے یہ تجویز مسترد کر دی اور مشرقی پاکستان ڈاکٹر مالک اور جنرل نیازی کے سپرد کر دیا۔

جنرل ٹنگا خاں اپنی اچانک علیحدگی پر خوش نہ تھے، اس کا اظہار ان کے رویے سے بار بار ہوتا تھا۔ انہیں یکم ستمبر کی شام کو آفس میں میں الوداعی پارٹی دی گئی جس میں چھاؤنی کے سینئر افسروں نے شرکت کی۔ کھانا ختم ہونے کے بعد جنرل نیازی نے ٹنگا خاں کو خراج پیش کرنا شروع کیا۔ ٹنگا خاں گم سم کرسی میں دھنسنے لگے رہے۔ جب وہ جوابی تقریر کرنے کے لیے اٹھے تو انہوں نے فرمایا: مجھے ۳۴ مارچ کو اچانک راولپنڈی میں بلا کر نئی ذمے داریاں سنبھالنے کا حکم دیا گیا۔ اب دفعہ مجھے یہ ذمہ داریاں ڈاکٹر مالک کے ہالے کرنے کو کہا گیا ہے۔ میری سمجھ میں نہیں آتا، ایسا کیوں ہوا ہے، مگر صدر کے فیصلے پر تبصرہ کرنا میرے لیے مناسب نہیں، وہی مکمل صورت حال سے واقفیت رکھتے ہیں۔ جہاں تک میرا تعلق ہے مجھے افسوس ہے کہ میں آپ کو مجتہد میں چھوڑ کر جا رہا ہوں۔ میری آہش تھی جو کام میرے سپرد کیا گیا ہے اسے پائیہ تکمیل تک پہنچا کر جاؤں، مگر بڑوں کی مرضی! بہر حال آپ حوصلہ رکھیں آپ کے کمانڈر (جنرل نیازی) بڑے تجربہ کار ہیں وہ آپ کی مناسب رہنمائی فرمائیں گے؛ البتہ ایک بات یاد رکھیے کہ حالات پر اپنی گرفت دھیلی نہ ہونے دینا، ورنہ یہاں آپ کی زندگی اجیرن ہو جائے گی۔

اگلی صبح انہیں الوداع کہنے کے لیے ہم ایئر پورٹ پہنچے۔ صرف سرکاری افسر موجود تھے۔ مجھے ان کی روانگی کا منظر دیکھ کر ان کی آمد کا سماں یاد آ گیا جب، مارچ کی زو پہلی سے پہر کو وہ ہشاش بشاش، تازہ دم اور پُر اعتماد مسکراہٹ کے ساتھ جہاز سے اترے تھے۔ آج ان کا چہرہ اُترا ہوا تھا۔

ٹنگا خاں کی روانگی کے اگلے روز (۳۱ ستمبر) سے پہر کو نئے گورنر نے اپنے عہدے کا حلف اٹھایا۔ اس تقریب میں معززین شہر، اعلیٰ سرکاری افسروں اور سفارتی سربراہوں نے شرکت کی۔ اسی موقع پر جس سیاست دان مثلاً خان اے صبر خاں، فضل القادر چودھری اور سابق گورنر عبدالستار خاں بھی نظر آئے۔ تقریب کے دوران میری نگاہ ڈاکٹر اے ایم مالک کے نحیف بدن ڈھلکے ہوئے چہرے اور دھڑائی ہوئی آنکھوں پر مرکوز رہی اور میں سوچتا رہا کہ اس مرد پیر کا حوصلہ کتنا جوان ہے کہ اس نے اپنے ذمے وہ کام لے لیا ہے جو ٹنگا خاں سے نہیں ہو سکا (اور انہیں تبدیل کرنا پڑا)۔

ڈاکٹر مالک کے گورنر بننے سے ڈھاکہ میں کشیدگی اور تناؤ کی فضا خاصی حد تک کم ہو گئی یوں محسوس ہوتا تھا کسی غیر کی جگہ کا ایک فرد آ گیا ہے۔ اگرچہ بنگالی عوام ڈاکٹر مالک سے ایسی عقیدت نہ رکھتے تھے جو انہیں حسین حمید سہروردی، مولانا فضل الحق یا خواجہ ناظم الدین سے تھی، مگر وہ ٹنگا خاں کی نسبت انہیں یقیناً زیادہ قابل قبول تھے۔ انہوں نے اپنی تقریب کے بعد شہر کی سب سے بڑی مسجد بیت الحکوم میں نماز جمعہ ادا کی جہاں جنرل ٹنگا خاں نے کبھی قدم نہ فرمایا تھا۔

غیر بنگالی بالخصوص بہاری آبادی میں جنرل ٹنگا خاں کے جانے سے دم تحفظ کا احساس پیدا ہوا ان کا خیال ٹنگا خاں کے جانے

سے شریند اور تیز ہو جائیں گے اور غیر بنگالی آبادی کی جان مال اور عزت خطرے میں پڑ جائے گی۔ مجھے یاد ہے کہ تمہارے ہمارے ہمارے اخبار نویس نے کسی ذاتی کام کے سلسلے میں مجھے ٹیلیفون کیا، تو میں نے اسے کہا کہ اب تو بنگالی گورنر آگیا ہے تمہیں سول انتظامیہ کی طرف رجوع کرنا چاہیے۔ اس نے جواب دیا: کون سی سول انتظامیہ سالک صاحب! ہمارا گورنر تو مغربی پاکستان چلا گیا ہے۔

دوسرے اہم سیاسی فیصلے یعنی عام معافی کا اعلان تمہارے ہوا۔ اس اعلان کے مطابق تمام زیر حراست شریندوں کو رہا کر دیا گیا سوائے ان لوگوں کے جن پر فروری جرم عائد کی جا چکی تھی۔ اگرچہ یہ بنیادی طور پر اچھا فیصلہ تھا، لیکن اتنی دیر سے کیا گیا کہ اس کی افادیت محدود ہو کر رہ گئی، کیونکہ تمہارے تمام باغی بھارتی تسلط میں جا چکے تھے اور ان میں سے اکثر ان کے ہاتھوں تربیت لے کر مکتی باہنی میں شامل ہو چکے تھے، اب ان سے پیچھے مڑنے کی توقع رکھنا عبث تھا؛ البتہ اگر یہ فیصلہ اپریل کے آغاز میں ہوتا، تو اس کے مفید نتائج نکل سکتے تھے، کیونکہ ان دنوں عوامی لیگ کے تقریباً توڑے رہنا ابھی تک صوبے کے اندر تھے اور ذاتی تحفظ کی ضمانت پر سامنے آنے اور حکومت سے تعاون کرنے کے لیے تیار تھے، لیکن اب کلکتہ منتقل ہو کر جلا وطن حکومت سے عہد ایفا کر چکے تھے۔ اس کے علاوہ گوریلا جنگ اور تخریبی کارروائیوں سے بہت سے مغرور بنگالیوں کو اُمید ہو چلی تھی کہ حالات کا پلڑا ان کی طرف جھک رہا ہے اور وہ جلد یا بدیر مجیب الرحمن کی رہائی اور وطن کی آزادی جیسی نعمتوں سے بہرہ ور ہوں گے۔

عام معافی کے حکم کے تحت ۲۰۰ افراد کو رہا کر دیا گیا۔ ان میں سے ۱۱۹ قیدیوں کو میرے سامنے جو دیپ پور (جہاں ۲ ای بی نے پاکستانی فوجیوں اور ان کے بال بچوں کو ہلاک کیا تھا) کی کوشٹریوں سے نکالا گیا۔ یہ وہ شریند تھے جنہیں جانچ پڑتال کے بعد سفید بے ضرر قرار دیا جا چکا تھا۔ مزید ۸ قیدی دوسرے مقامات پر چھوڑے گئے جو اینٹی جنس کی اصطلاح میں سیاہی مائل سفید (یعنی مشتبہ مگر بے ضرر) سمجھے جاتے تھے۔ کچھ قیدی ڈھاکہ میں بھی رہا کیے گئے۔

جہاں تک مجھے معلوم ہے مکتی باہنی کے کسی رکن یا مغرور سیاسی رہنما نے معافی کے اعلان سے فائدہ نہ اٹھایا سوائے ان منوں میں کہ بعض شریند وطن چلنے والے پناہ گزینوں کا لبادہ اوڑھ کر آزادانہ مشرقی پاکستان میں داخل ہونے لگے۔ وہ یا تو اسلحہ، بارود گرنیڈ اور بارودی سرنگیں اپنے ساتھ لاتے تھے یا اندر داخل ہو کر مقررہ جگہ سے یہ چیزیں حاصل کر لیتے تھے۔

حکومت نے وطن واپس آنے والوں کے لیے سرحدوں کے ساتھ ساتھ استقبالیہ کمیٹی قائم کیے جہاں راشن، نقدی اور طبی امداد کا اہتمام تھا، مگر ان کمیٹیوں میں بہت کم لوگ آئے۔ بڑی وجہ یہ تھی کہ ان کا اعتماد بحال نہیں ہوا تھا۔ وہ ہماری ان خبروں کو محض پراپیگنڈہ سمجھتے تھے کہ حالات معمول پر آگئے ہیں اور بھارت کے اس پراپیگنڈے کو حقیقت گردانتے تھے کہ واپس جانے سے ان کی جان و مال لود عزت خطرے میں پڑ جائے گی۔

بعض بنگالی یہ اس لگائے بیٹھے تھے کہ اعلان معافی کا اطلاق مجیب الرحمن پر بھی ہوگا۔ اس اُمید کو تقویت ان افواہوں سے ملی کہ غیر ملکی طاقتیں مجیب کی رہائی کے لیے بھئی خاں پر دباؤ ڈال رہی ہیں۔ ان قیاس آرائیوں کو مزید ہوا جنرل یحییٰ کے ایک با اعتماد جنرل نے ڈھاکہ میں ایسے سوال پوچھ کر دی کہ اگر مجیب الرحمن کو جہانی طور پر ٹھکانے لگانے کے بجائے سیاسی طور پر ختم کر دیا جائے تو کیا بہتر نہ ہوگا؟ انہوں نے یہ انکشاف کرتے ہوئے کہ مجیب الرحمن مشدہ پاکستان سے دفاداری کے عہد پر دستخط کرنے کو تیار ہے مزید سوال کیا کہ آیا اس سے نام نہاد تحریک آزادی کی ہوا نہیں نکل جائے گی؟ میں نے عرض کیا کہ اول تو مجیب کے انجام کے بارے میں جنرل یحییٰ خاں پہلے ہی اعلان کر چکے ہیں اب وہ اس سے کیسے پھر سکتے ہیں۔ دوسری بات یہ ہے کہ اس بات کی کیا گارنٹی ہے کہ

مجیب رہائی کے بعد پھر قلابازی نہیں کھائے گا، مزید بحث سے جان چھڑاتے ہوئے جنرل صاحب نے فرمایا: اے مجیب! میں تو یونہی بحث برائے بحث کے طور پر آپ سے بات کر رہا تھا تم اسے سچ سمجھ بیٹھے۔

درحقیقت یہ محض بحث برائے بحث نہ تھی، اس کے پیچھے ضرور کوئی ہاتھ کار فرماتا تھا، کیونکہ میں نے ایک معتبر شخص سے سنا کہ ایک دست ملک نے پاکستان اور بنگلہ دیش کے نمائندوں کی بیرون ملک ملاقات کروائی ہے اور یحییٰ خاں نے یقین دلایا ہے کہ وہ مجیب الرحمن کی جاں بخشی کر دیں گے مگر وقت کا تعین ان پر چھوڑ دیا جائے۔

انہی دنوں ایک جرمن صحافی بھٹو سے ملاقات کے بعد ڈھاکہ پہنچا۔ اس نے مجھے بتایا کہ مغربی پاکستان میں ایک نیا سیاسی تصفیہ زیر غور ہے اور بھٹو نے مجھے یہ تاثر دیا ہے کہ اگر وہ اقتدار میں آگئے، تو مجیب الرحمن کو رہا کر دیں گے، کیونکہ مجیب کو سزا دینے کا وعدہ یحییٰ خاں نے کر رکھا ہے بھٹو نے نہیں؛

نئے سیاسی بھوتے کا ایک منطقی نتیجہ یہ نکلا کہ مشرقی پاکستان میں قومی اسمبلی کی ان ۸ نشستوں کے لیے ضمنی انتخابات کرانے کا فیصلہ کیا گیا جو عوامی لیگ کے مفروضہ ہونے سے خالی ہوتی تھیں۔ ضمنی انتخابات کرانے کی ذمہ داری میجر جنرل راؤ فرمان علی کو سونپی گئی۔ انہوں نے اسے دائیں بازو کی ان سیاسی جماعتوں کو نوازنے کا ذریعہ سمجھا جو گزشتہ چند مہینوں سے فوج سے تعاون کر رہی تھیں؛ چنانچہ انہوں نے ان جماعتوں کو اپنے زیر نگرین کی فہرستیں پیش کرنے کو کہا۔ انہوں نے درج ذیل بولی دی،

پاکستان جمہوری پارٹی	۴۶
جماعت اسلامی	۴۴
کونسل مسلم لیگ	۲۶
کنونشن مسلم لیگ	۲۱
نظام اسلام پارٹی	۱۶

میزان ----- ۱۵۴

مختلف جماعتوں کی طرف سے ۱۵۴ سیٹوں کا مطالبہ کیا گیا جب کہ خالی نشستیں ۸ تھیں۔ سب کو مطمئن کرنا مشکل تھا۔ اس کے علاوہ یحییٰ خاں کا حکم تھا کہ نورالامین (پاکستان جمہوری پارٹی) کو زیادہ سیٹیں دی جائیں تاکہ وہ مرکز میں مخلوط حکومت بنا سکیں۔

جنرل فرمان علی ابھی مانگ اور رسد میں تناسب کا حساب لگا رہے تھے کہ جنرل پیرزادہ کا حکم ملا، قیوم لیگ کو کم از کم اکتیس اور پاکستان پیپلز پارٹی کو اٹھارہ نشستیں دی جائیں۔ اس پر جنرل فرمان علی نے کہا: اس طرح میرے پاس دائیں بازو کی مقامی جماعتوں کو مطمئن کرنے کے لیے گنجائش باقی نہیں رہے گی۔

”اچھا تو پی پی پی کے لیے اٹھارہ کے بجائے تیرہ سیٹیں کر دو۔“

بعد میں مجھے معلوم ہوا کہ یحییٰ خاں تین سیاست دانوں — یعنی نورالامین، بھٹو اور قیوم خاں — کو بیک وقت وزارت عظمیٰ کا ہتھانہ دے رہے تھے۔ پتہ نہیں اس ڈرامے کے مرکزی کردار مغربی پاکستان میں کیا کیل کیل ہے تھے، لیکن مشرقی پاکستان میں یہ تاثر عام تھا کہ ضمنی انتخابات سراسر ڈھونگ ہیں۔



ضمنی انتخابات میں اپنی جماعت کی کامیابی کے امکانات کا جائزہ لینے کے لیے ایک ریٹائرڈ ایئر مارشل ڈھاکہ تشریف لائے۔ یکم اکتوبر کو شام ساڑھے پانچ بجے ایک اخبار نویس کے ہمراہ میری ان سے ملاقات ہوئی جو خاصی دیر جاری رہی۔ انہوں نے ضمنی انتخابات کے مسئلے پر جب میری رائے پوچھی تو میں نے عرض کیا: انٹر کانسٹی ٹیبل کی سب سے بڑی بات یہ ہے کہ آپ باہر نکل کر عوام کی بے بسی کا ملاحظہ کریں۔ آپ کو پتہ چلے گا کہ ظلم و ستم میں پے ہوئے عوام کو ضمنی انتخابات سے کوئی دلچسپی نہیں۔ انہیں تو اپنی بقا کی فکر کھائے جا رہی ہے، کیونکہ وہ باری باری پاک فوج، مکتی باہنی اور رضا کاروں کے عتاب کا نشانہ بن رہے ہیں۔۔۔

اگر مسئلہ اتنا ہی گہیر ہے تو تمہارے خیال میں اس صورت حال سے کون نجات دلا سکتا ہے؟

میرے خیال میں یہ جرنیلوں، فیلڈ مارشلوں اور ایئر مارشلوں کے بس کی بات نہیں۔ اس وقت ملک کو ایک ایسے بلند قامت سیاسی مدبر کی ضرورت ہے جو پوری قوم کو یکجا کر سکے۔

میرے خیال میں تو اس کا حل مجیب الرحمن ہے جس کی رہائی بلا تاخیر عمل میں آنی چاہیے۔ وقت ہاتھ سے نکلا جا رہا ہے۔ مگر وہ تو غدار ہے، یہ سب اسی کا تو کیا دھرا ہے؟

اگر تمہاری افواج تمام قاتلوں کو (اعلان معافی کے ذریعے) بخش سکتی ہیں تو انہیں مجیب کی رہائی کا کروا گھونٹ بھی حلق سے تار لینا چاہیے، کیونکہ اس نے کسی ایک شخص کو بھی اپنے ہاتھوں سے قتل نہیں کیا۔ میں یقین دلاتا ہوں کہ مغربی پاکستان، مجیب الرحمن کی رہائی کی خبر سننے کے لیے تیار ہے۔

چند روز بعد وہ مجیب الرحمن کے بیوی بچوں کو دلاس دے کر واپس مغربی پاکستان چلے گئے۔

جب دوسرے سیاست دان ضمنی انتخابات کے لیے تیاریاں کر رہے تھے، بھٹو بار بار اصرار کر رہے تھے کہ اقتدار بلا تاخیر، ۱۹۷۰ء کے انتخابات کی بنا پر عوامی نمائندوں کے حوالے کیا جائے۔ ملک کو درپیش بحران کے پیش نظر کرسی کا یہ مطالبہ کئی لوگوں کو بے وقت کی راگنی لگانے بھٹو کے حامی کر رہے تھے کہ قیادت کے بحران کا واحد حل انتقال اقتدار ہے۔

جنرل یحییٰ نے غیر سرکاری طور پر بھٹو کو اقتدار میں یوں شامل کر لیا کہ انہیں آٹھ لاکھ روپیہ کا قاعدہ بنا کر عوامی جمہوریہ چین بھیج دیا۔ اس وفد کے دوسرے ارکان میں پاک فضائیہ کے سربراہ ایئر مارشل رحیم خاں اور فوج کے چیف آف جنرل اسٹاف ایفینڈنٹ جنرل گل حسن شامل تھے۔ یہ وفد نومبر کے شروع میں پکنگ پہنچا اور چینی قائدین سے بڑھتی تازہ صورت حال کے متعلق بات کی۔ وہاں سے روانگی سے قبل بھٹو نے ایک پریس کانفرنس میں اعلان کیا: "ان مذاکرات سے، پاکستان کے خلاف جارحیت کی روک تھام ہو گئی ہے۔" اس سے یحییٰ خاں کے چند روز پہلے کے اعلان کی تصدیق ہوتی تھی جس میں کہا گیا تھا: "پاکستان پر حملے کی صورت میں چین ہماری مدد کرے گا۔"

۱۶ نومبر ۱۹۷۱ء کو میں عید کے موقع پر چند روز کے لیے راولپنڈی آیا تو میری ملاقات وفد کے ایک قریبی ذریعے سے ہوئی جس نے چینی وفد کے بارے میں میرے سوال کے جواب میں کہا: "ہاں چینی ہمارے عظیم دوست ہیں۔ انہوں نے ہمیں مشورہ دیا ہے کہ ہم بنگالیوں کی حمایت حاصل کرنے کی کوشش کریں۔"

سنائے غیر ملکی حمایت کی تلاش میں جن دروازوں پر دستک دی گئی ان میں واشنگٹن بھی شامل تھا۔ وہاں بھی امریکہ کو وہ دو طرفہ معاہدہ یاد



دلایا گیا جو اس نے پہلے مارشل لا سے قبل (چھٹے عشرے میں) کیا تھا۔ وہاں سے جو جواب بلا وہ بھی چینی جواب سے زیادہ مختلف نہ تھا۔ ان دو عظیم طاقتوں کے بائے میں پروفیسر جی ڈبلیو چودھری لکھتے ہیں:

’یہی خال نے مجھے بکسن اور چینی قائدین سے اپنی خط کتابت دکھائی جس سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ بنگالیوں سے سیاسی تصفیے کے آرزو مند تھے بلکہ“

بھارت نے بھی انہی دنوں اپنی سفارتی سرگرمیاں تیز کر دی تھیں، اسے ہماری نسبت زیادہ کامیابی نصیب ہوئی۔ اس نے پہلے ہی روس سے معاہدہ دوستی کر لیا تھا جو درحقیقت ایک دفاعی معاہدہ تھا جس کی شق نمبر ۵ اور شق نمبر ۹ کے ذریعے بھارت کسی وقت بھی روس سے فوجی مدد طلب کر سکتا تھا۔ اس معاہدے کے دفاعی پہلوؤں کی تصدیق بھارتی جنرل ڈی کے۔ پلیٹ کے مضمون بطور ہندوستان نامہ مورخہ ۲۰ اکتوبر ۱۹۶۱ء سے بھی ہوتی ہے جس میں انہوں نے لکھا: اس معاہدے میں فوجی مقاصد بھی پہناے ہیں۔ ۹

جوں جوں افق پر جنگ کے بادل گہرے ہوتے گئے، اس معاہدے کے تحت بھارت اور روس کے درمیان باہمی تعاون کی رفتار بڑھتی گئی۔ پہلے روس کے نائب وزیر خارجہ نکولائی فرودین کی قیادت میں ایک پانچ رکنی وفد دہلی آیا، پھر روسی فضائیہ کے سربراہ کی سرکردگی میں ایک اور چھ رکنی وفد بھارت پہنچا اور آخر میں روسی وزیر دفاع مارشل گریچکو خود تشریف لائے اور جنگی تیاریوں کا بنفس نفیس جائزہ لیا۔ انہی دنوں یہ خبر بھی سننے میں آئی کہ دہلی میں ایک دفتر رابطہ قائم کیا گیا ہے جس میں روسی ماہرین اور ہوا باز مستقل طور پر مستقر کیے گئے ہیں۔

بھارت کا اصل گٹھ جوڑ تو روس سے تھا، مگر اس نے دیگر اہم ممالک کی حمایت کو بھی نظر انداز نہ کیا؛ چنانچہ وزیر اعظم اندرا گاندھی ۲۴ اکتوبر کو امریکہ، انگلستان اور مغربی جرمنی روانہ ہوئیں۔ ان کے پیش نظر یہ مقصد تھا کہ اگر وہ ان ممالک کو بھارت کی حمایت پر آمادہ نہیں کر سکتیں، تو کم از کم انہیں پاکستان کی مدد کرنے سے باز رکھ سکیں گی۔ وہ یقیناً اپنے مؤثر الذکر مقصد میں کامیاب ہوئیں۔

بھارت اور پاکستان کے درمیان مسلح تصادم کے روز افزوں امکانات کو ساری دنیا تشویش کی نظروں سے دیکھ رہی تھی، مگر تباہی کو روکنے کے لیے کوئی مثبت اقدامات نہیں کیے جاتے تھے۔ اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی کے چھبیسویں اجلاس میں اندرونی معاملات میں بھارتی مداخلت کے خلاف پاکستان کی شکایت پر غور کیا گیا اور فیصلہ کیا گیا کہ سرحدوں پر کشیدگی کم کرنے کے لیے وہاں اقوام متحدہ کے ممبرین مستقر کر دیے جائیں۔ پاکستان نے عالمی برادری کا یہ فیصلہ مان لیا، مگر بھارت نے اس سے صاف انکار کر دیا۔ فی الحقیقت بھارت کو ایسی کوئی تجویز نہ جاتی تھی جو حالات کو سدھانے کے لیے مفید ثابت ہو سکے، کیونکہ اگر حالات سدھ گئے، تو صدیوں کا سنہرا موقع ہاتھ سے نکل جائے گا!

لے مشدہ پاکستان کے آخری ایام۔ از جی ڈبلیو چودھری۔ صفحہ ۱۹۲

محران کی دہلیز پر

ملکی اور غیر ملکی سیاست سے بحرانی صورت ڈرانے سُدھری۔ حالات بد سے بدتر ہوتے گئے۔ یوں لگتا تھا ان کا رخ پہلے سے متعین ہو چکا ہے اور اب دھارا اسی رخ پر بہتا رہے گا۔ خود ڈھاکہ میں زندگی خاصی تلخ ہو گئی تھی۔ مشکل ہی سے کوئی دن ایسا گزرتا تھا جب لوٹ مار، آتش زنی، سیاسی قتل یا بم پھٹنے کی کوئی نہ کوئی واردات نہ ہوتی۔ مثلاً ۲۳ اکتوبر کو دن دہاڑے مشرقی پاکستان کے سابق گورنر منعم خاں کو ان کے گھر میں ہلاک کر دیا گیا۔ چند روز بعد ڈھاکہ یونیورسٹی کی حدود میں ایک صوبائی وزیر کی کار کو بم سے اڑا دیا گیا۔ پھر چوری کی ایک کار میں آتشیں مادہ لاد کر اسے موتی جیل کے کمرشل ایریا میں کھڑا کر دیا گیا اور وقت مقررہ پر یہ سارا مادہ پھٹ پڑا جس سے پانچ افراد ہلاک اور تیرہ زخمی ہو گئے۔ اگلے روز اسٹیٹ بینک کی پُرشکوہ عمارت میں بم پھٹا۔ اس سے اگلے روز گورنر ہاؤس کے ساتھ والی عمارت میں ٹیلی وژن اسٹیشن کی بالائی منزل کو آگ لگ گئی۔

یہ واقعات اپنی جگہ پر بہت اہم تھے، مگر جب روزمرہ کا معمول بن گئے، تو لوگوں نے ان میں دلچسپی لینا بند کر دی؛ چنانچہ تخریب کاروں نے مقامی اور غیر ملکی لوگوں کی توجہ مبذول کرانے کے لیے انٹرکانٹینینٹل کو منتخب کیا۔ وہاں غسل خانے میں معقول مقدار میں آتشیں مادہ رکھ کر اسے آگ لگا دی جس سے ہوٹل کا مقبول ترین حصہ دھڑام سے گر پڑا۔ کئی ہفتوں تک مرمت کا کام جاری رہا اور ہر آنے جانے والا پوچھتا، یہ کیا ہوا ہے؟ یوں بالواسطہ طور پر مکتی باہنی کی تشہیر ہوتی رہی۔

۱۱ اکتوبر کو تخریب کاروں نے اپنی کارروائیوں میں ایک نئے عنصر کا اضافہ کیا۔ وہ ڈھاکہ شہر میں چھوٹی توپیں (مارٹرز) لے آئے۔ اس کا اندازہ مجھے ۱۱ اکتوبر اور ۱۲ اکتوبر کی درمیانی رات کو شہر سے چھاؤنی کی طرف جلتے ہوئے ہوا۔ جب میں ہوائی اڈے کے پاس پی آئی اے کے نزدیک پہنچا، تو یکے بعد دیگرے دو بم فائر ہونے کی گونج سُنائی دی۔ میں نے گھڑی پر نگاہ ڈالی ایک بج کر چالیس منٹ ہوئے تھے۔ میں نے جیب دیوار کی آڑ میں گھڑی کر دی اور دھماکوں کی آواز سے اندازہ لگانے لگا کہ ان کا رخ کدھر ہے؟ "تفتیش" پر معلوم ہوا کہ شہر کے شمالی حصے سے مارٹر کے گولے ہوائی اڈے اور چھاؤنی کے طے حصے پر پھینکے گئے ہیں، لیکن مارٹر میں نشانہ بانٹنے کے لیے سائٹ (SIGHT) نہ ہونے کی وجہ سے ہم مارٹر گٹ سے دُور جا گئے ہیں۔ اس تجربے سے مقامی انتظامیہ کو یقیناً تشویش لاحق ہوئی، کیونکہ آئندہ سائٹ حاصل کر کے بم نشانے پر بھی پھینکے جاسکتے تھے۔

ڈھاکہ کے مضافات میں تخریب کاروں کے کئی گروہ تھے، کیونکہ عمل صفائی (SWEEP OPERATION) شہروں تک محدود ہونے کی وجہ سے یہ علاقے باغیوں کے لیے نسبتاً محفوظ تھے۔ مضافات کے حال کا اندازہ آپ اس واقعے سے لگا لیں:

ڈھاکہ سے باہر سدھیر گنج پاور ہاؤس تھا جہاں سے بجلی کے تار مختلف اطراف کو جاتے تھے۔ تخریب کاروں نے یہ تار کاٹ کر

جمعی کی پہلانی منقطع کر دی۔ مرمت کے کام کے لیے مغربی پاکستان سے واپڈا کا عملہ منگوا یا گیا جس میں دو اسٹنٹ انجینئرز، ایک لائٹ ٹینٹنٹ اور ایک فورمین اور ایک لائٹ مین شامل تھے۔ یہ جماعت ۳۰ اکتوبر کو کام میں مصروف تھی کہ کمتی باہمی نے ان پر دن دہائے حملہ کر کے پانچوں کے پانچوں افراد کو موقع ہی پر ہلاک کر دیا۔ ایک کی لاش (اسٹنٹ فورمین بدرالسلام) وہ ٹرائی کے طور پر ساتھ لے گئے، باقی چار لاشیں اگلے روز پانچ بجے شام مغربی پاکستان روانہ کر دی گئیں۔

ڈھاکہ اور اس کے مضافات سے صوبے کے باقی حصوں کی طرف جاتے ہوئے اکثر احساس رہتا کہ ہم دشمن کے علاقے (ENEMY TERRITORY) سے گزر رہے ہیں، لہذا ہر شخص عموماً اپنے ساتھ حفاظتی دستہ رکھتا۔ بعض اوقات اس حفاظتی دستے پر بھی راستے میں فائرنگ ہوتی مگر اکاؤنٹا باغی اسے دیکھ کر روپوش ہو جاتے۔ اگر کوئی افسر بخیر و عافیت اپنی منزل پر پہنچ جاتا، تو وہ سکون کا سانس لیتا اور عموماً اسے ایک نمایاں کامیابی کے طور پر اپنے دوستوں سے فخریہ بیان کرتا۔

اندرون صوبہ جن فوجی کمانڈروں کو نظم و نسق اور امن و امان بحال رکھنے کی ذمہ داری دی گئی تھی، ان کا کام بڑا پیچیدہ اور مشکل تھا۔ ان کے فرائض میں متعلقہ علاقوں میں صنعتی اداروں، بنکوں، تاجر گھروں اور دیگر اہم تنصیبات کی حفاظت کے علاوہ علاقے کو شہر پسندوں سے پاک رکھنا تھا، مگر ان کے وسائل صرف ایک ہٹلین (چھ سات سو افراد) یا ایک کمپنی (سو ڈیڑھ سو افراد) تک محدود تھے۔ وہ اس افرادی قوت کو چھوٹی چھوٹی ٹکڑیوں میں تقسیم کر کے مختلف مقامات پر بھیج دیتے تھے۔ ٹکڑی جتنی چھوٹی ہوتی، باغیوں کے لیے اتنا ہی تڑوا رہتی۔ اگر وہ انہیں ٹکڑیوں میں تقسیم کرنے کے بجائے ایک جگہ جمع رکھتے، تو زیادہ تر علاقہ شہر پسندوں کے رحم و کرم پر ہوتا۔

افزادی قوت کی اس کمی کو پورا کرنے کے لیے نیم فوجی تنظیموں سے کئی افراد لیے جاتے جن میں رضا کار (مغربی پاکستان) پولیس ریجنرز اور ایسٹ پاکستان پول آرٹ فورسز شامل تھے۔ بھانت بھانت کی یہ نفری کبھی بھی ذہنی اور جسمانی طور پر فوجی یونٹ کی طرح متحدہ فورس نہ بنتی۔ ان کا مورال بھی عموماً نیچے ہی ہوتا۔ انہیں عام طور پر فوجی پلاٹون کے ساتھ ملا دیا جاتا تاکہ نسبتاً زیادہ تعداد دیکھ کر باغی بھی جرأت نہ کریں اور خود ان میں بھی اعتماد پیدا ہو۔

اگرچہ اس حکمت عملی سے بعض چوکیوں پر تین نفری دس سے بڑھ کر تیس ہو گئی، مگر طاقت کا سرچشمہ وہی دس افراد رہے جو باقاعدہ فوج سے تعلق رکھتے تھے۔ نیم فوجی تنظیموں کے افراد کو جہاں بھی فوج سے علیحدہ کوئی ذمہ داری سونپی گئی وہ بالعموم قابل اعتماد ثابت نہ ہوئے۔ کبھی تو کمتی باہمی اور بھارتی فوج کی مشترکہ یلغار سے ان کے قدم اکھڑ جاتے اور کبھی وہ محض بزدلی۔ اور کہیں کہیں نمک حرامی۔ کی وجہ سے بھاگ کھڑے ہوتے۔ (نمک حرامی کی وجہ بعد میں معلوم ہوئی جب پتہ چلا کہ کمتی باہمی کے کئی افراد رضا کاروں میں بھرتی ہو گئے تھے)۔

اول لڈر کی ایک مثال ۲۹ اکتوبر کے ایک واقعے سے ملتی ہے جب نواب گنج تھانے پر باغیوں نے حملہ کر دیا۔ وہاں تین ۳۹ رضا کاروں میں سے ۳۲ بھاگ گئے اور سات پکڑے گئے۔ تھانے پر کمتی باہمی کا قبضہ ہو گیا۔ اسی طرح لہا گنج تھانے میں، ۵ بنگال پولیس مین تھے جنہیں تفتیشی کمیٹی (آئی ایس ایس سی) نے سفید (بے ضرر) قرار دیا تھا اور وہ ۴ ستمبر والے اعلان معافی کے بعد باہمی ملازمت پر بحال کر دیے گئے تھے۔ ان کے ساتھ مغربی پاکستان پولیس اور ایسٹ پاکستان ریجنرز کے تیس سپاہی تھے۔ ۲۸ اکتوبر کو اس تھانے کے بنگالی سپاہی اچانک بھاگ گئے۔ وہ آئندہ شب واپس آ گئے، مگر کمتی باہمی کی کمک کے ساتھ۔ انہوں نے آتے ہی شیخون مارا اور تیس کے تیس مغربی پاکستانی سپاہی شہید کر دیے۔ یوں یہ تھانہ بھی شہر پسندوں کے قبضے میں چلا گیا۔ اسی طرح کی وارداتیں لاٹھی فرید پور، تنگیل اور دیگر اضلاع میں بھی ہوئیں۔

سرحدوں کے قریب کتنی باہمی کام اور بھی آسان تھا، کیونکہ وہاں بھارتی آقاؤں کی توپیں سرحد سے ان کی بھرپور اعانت کرتی تھیں اور وقت ضرورت بھارتی فوج سرحدوں کے اندر بھی داخل ہو جاتی تھی۔ بھارتی توپوں کی گولہ باری کا سلسلہ جون میں شروع ہوا اور تخریب کاری کے ساتھ ساتھ بڑھتا گیا، حتیٰ کہ اکتوبر میں شاید ہی کوئی دن گزرتا جب سینکڑوں بھارتی گولے پاکستان کی سرزمین پر نہ پھٹتے۔ سرکاری اندازے کے مطابق ایک دن میں مختلف سائز کے پانچ سو سے دو ہزار گولے برستے۔ اس گولہ باری کے چار مقاصد تھے:

(الف) اس سے امن کی حالت کو بتدیج جنگ میں بدلنے کی بھارتی پالیسی میں مدد ملتی تھی جس کا پہلا مرحلہ سرحدوں کو گرم رکھنا تھا۔

(ب) سرحدی علاقوں میں تخریب کاریوں کی حوصلہ افزائی ہوتی تھی۔

(ج) سرحد کے ساتھ ایسی جگہوں پر قبضہ ہو جاتا تھا جو باقاعدہ جنگ کے دوران مفید ثابت ہو سکتی تھیں۔

(د) پاکستانی فوج سرحدوں کو نظر انداز کر کے اندرون صوبہ صفائی پر مکمل توجہ نہیں دے سکتی تھی۔

بھارت کو اس حکمت عملی سے روکنے کے لیے پاکستان نے ۳ دسمبر (باقاعدہ جنگ کا اعلان) سے پہلے کوئی مؤثر کارروائی نہ کی۔

صرف اخباری اور سفارتی ذرائع سے ہیچ پکار جاری رکھی مگر کسی نے اس پر کان نہ دھرا؛ چنانچہ بھارت نے سرحدی علاقے میں بہت سے موڑوں، ٹیلوں اور جنگی نقطہ نگاہ سے مفید مقامات پر قبضہ کر لیا، جن کا مجموعی رقبہ تقریباً تین ہزار مربع میل بنا تھا۔ اس کے باوجود صدر مملکت کو ۱۲ اکتوبر کی نشری تقریر میں اس بات پر اصرار تھا کہ آپ کی بہادر افواج وطن کی مقدس سرزمین کے ایک ایک انچ کے دفاع کیلئے پوری طرح مستعد اور تیار ہیں!

قوم کو دھوکا دینے والے سچی خاں واحد شخص نہ تھے، جنرل نیازی اس میدان میں ان سے بھی دو قدم آگے تھے۔ انہوں نے متعدد بار اعلان کیا: اگر جنگ چھڑ گئی، تو میدان کارزار بھارت کی سرزمین بنے گی۔ اسی جنونی کیفیت میں وہ کبھی آسام اور کبھی کلکتہ پر قبضہ کرنے کی دھمکی دیتے۔ میں نے رائے عامہ کے نقطہ نظر سے ان سے گزارش کی کہ آپ ایسی بے پرکی نہ اڑائیں، کیونکہ اس سے بیجا توقعات بڑھتی ہیں جنہیں آپ کبھی پورا نہیں کر سکیں گے۔ اس پر انہوں نے کسی کتاب سے ٹاٹا ہوا پرچہ دیا کہ دھوکہ دہی بھی جنگ جیتنے کا ایک گڑبے — خواہ شیطانی سہی!

اسی دنوں (۲۴ اکتوبر) انہوں نے مجھے صبح صبح اپنے دفتر میں طلب فرمایا اور پوچھا،

تمہارے دوست (غیر ملکی نامہ نگار) کیا کہتے ہیں؟

اُن کا خیال ہے کہ جنگ چھڑنے کو ہے!

میں بھی اس کے لیے تیار ہوں، میرے دفاعی انتظامات مکمل ہیں، ستر ہزار تربیت یافتہ افراد پوزیشن میں ہیں۔ میرے پاؤں بڑے مضبوط ہیں...

.... مگر فضائیہ اور بحریہ کی حمایت تو محدود ہے!

کوئی بات نہیں، میں نے فضائیہ اور بحریہ کی مدد کے بغیر جنگ لڑنے کا منصوبہ بنایا ہے!

.... پھر بھی میرا خیال ہے کہ اندر اور باہر دونوں طرف دشمن ہے اس سے نپٹنے کے لیے آپ کے پاس وسائل بہت محدود ہیں

مجھے ڈر ہے کہ....



کس چیز کا ڈر ہے؟ ...

مجھے ڈر ہے کہ جنگ کی صورت میں سرحدوں کے باہر اور سرحدوں کے اندر دشمن کو آپس میں بٹلنے کے لیے ہماری تیلی سی دفاعی لائن میں سوراخ ڈالنا ہوگا جو زیادہ مشکل نہیں کیونکہ اس کی حیثیت سینڈ پیچ میں پتلے سے پتلے جیسی ہے۔ اس سے بھی بڑھ کر خطرے کی بات یہ ہے کہ بھارت شکاف ڈالنے کے لیے سرحد کے جس نقطے کو منتخب کرنا چاہے کر سکتا ہے کیونکہ پہل اس کے ہاتھ میں ہے۔ ...

اوتے تمہارے خدشات سراسر بے بنیاد ہیں۔ تم افرادی قوت کا حساب لگا کر یہ سب کچھ کہہ رہے ہو تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ جنگیں جرنیلوں کے زور سے جیتی جاتی ہیں سپاہیوں کی تعداد سے نہیں۔ اور تمہیں معلوم ہے کہ جرنیلی کا زور کیا ہوتا ہے۔ صبح وقت پر، صبح مقام پر افواج کی صبح تعداد کو متعین کرنا۔ یہ جملہ سن کر مجھے لمحے بھر کو یہ احساس ہوا کہ شاید جنرل نیازی کی یہ شہرت کہ انہوں نے زندگی میں کبھی کتاب کو ہاتھ نہیں لگایا مبالغے پر مبنی ہے۔

بڑھانے کی جو طرح جنرل نیازی نے ڈالی وہ ان کے کئی ماتحتوں نے بھی اپنالی۔ میں مشرقی پاکستان کے اندر مختلف دوروں پر جنرل نیازی کے ساتھ گیا۔ ان موقعوں پر ہر جگہ متعلقہ میجر جنرل اور متعلقہ بریگیڈیئر ان کو صورت حال (بریٹنگ) سے آگاہ کرتے۔ بریٹنگ میں عموماً وسائل، مشن اور تقسیم وسائل کے ذکر کے بعد تان اس پر ٹوٹی کہ اگر وسائل محدود اور حالات نامساعد ہیں تو کوئی بات نہیں سہرا آپ میسجیکٹر کے متعلق کوئی فکر نہ کریں۔ جب تک میں یہاں ہوں دشمن کو ناکوں چنے چبواؤں گا۔ اس طرز گفتگو کو عموماً بہادری اور اس کے برعکس کلمات کو بزدلی تصور کیا جاتا۔ ہمارے ہاں اتنی اخلاقی جرأت ابھی پیدا نہیں ہوئی کہ بزدلی کا دلخ لے کر بھی کوئی حق گوئی سے کام لے۔

فوجی کمانڈر اپنے سینئر کمانڈرز کی نظروں میں نوکری بنانے کے لیے خواہ کچھ بھی کہتے حقیقت یہ ہے کہ گزشتہ آٹھ مہینوں کی مسلح شورش کی وجہ سے ہمارے سپاہیوں کی کارکردگی کافی حد تک متاثر ہو چکی تھی۔ اس عرصے میں نہ صرف انہیں (مارشل لا اور آئی۔ ایس ڈیٹی کی وجہ سے) پیشہ وراز تربیت جاری رکھنے کا موقع نہیں ملا تھا بلکہ ان کو ایک دن کا بھی آرام اور سکون نصیب نہیں ہوا تھا۔ ان میں سے کئی سپاہیوں کو محو تے، جرابیں اور چار پائیاں تک میسٹر نہ تھیں۔ نفسیاتی معاذ پر حالت اور بھی دیگر گوں تھی۔ ان میں سے جو سو بوجھ بوجھ لگتے تھے وہ یہ سمجھنے لگے تھے کہ اگر بنگالی ہمارے ساتھ رہنے پر رضامند نہیں تو ان کو طاقت کے زور سے اپنے ساتھ رکھنے کا کیا فائدہ؟ اور جو ان پڑھ سپاہی مغربی پاکستان سے یہ سن کر گئے تھے کہ حق اور باطل کی جنگ ہو رہی ہے اور کافر کو اس کی حرکتوں کا مزہ چکھانا ضروری ہے وہ یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ ان کا سامنا تو بنگالی مسلمانوں سے ہے، ہندو تو شاذ و نادر ہی دکھائی دیتا ہے۔ وہ حیران تھے کہ یہ کیسا حق و باطل کا معرکہ ہے جس میں مسلمان کو مسلمان کا سامنا ہے۔ ان مادی اور نفسیاتی عناصر نے اکثر سپاہیوں کو یہ سوچنے پر مجبور کر دیا تھا کہ آیا ان حالات میں جان کی قربانی دینا واقعی عظیم کارنامہ ہے جس کے عوض شہادت کا رتبہ حاصل ہوگا۔

فوجی مفکر کہ گئے ہیں کہ کسی بھی کمانڈر کی ۵ فیصد توجہ اس بات پر صرف ہونی چاہیے کہ اس کے زیر کمان افسروں اور سپاہیوں کی سچ کا انداز کیا ہے۔ مگر ہمارے ہاں اس نفسیاتی پہلو کو سراسر نظر انداز کیا جاتا رہا۔ صرف زیر کمان سپاہیوں کے سر اور رانگلوں کے بٹ گئے پر اکتفا کیا گیا۔ وہ جانتے تھے مسلح شورش کو کچلنے میں ہمارے ۲۳۷ افسر۔ ۱۳۶ جونیئر کمیشنڈ افسر اور ۲۵۵۹ سپاہی جان کی قربانی دے

INTERNAL SECURITY لے اندرونی گزبڑ کو روکنے کے لیے کارروائی



چکے ہیں مگر اس بات کا انہیں کوئی احساس نہ تھا کہ باقی بچنے والوں میں سے کتنے ذہنی طور پر جنگ سے الگ ہو چکے ہیں۔
 نفسیاتی اثر اور مورال میں کمی کا اثر سپاہیوں کی کارکردگی میں بھی نظر آنے لگا۔ شروع شروع میں وہ بڑی مستعدی اور جاشاری سے شریڈل
 کا کھوج لگانے اور ان کا قلع قمع کرنے کی کوشش کرتے، مگر بعد میں صرف بوقت ضرورت گشت پر نکلتے اور وہ بھی بے دل سے۔ پھر
 ایک وقت (اکتوبر / نومبر) ایسا بھی آیا کہ ہفتہ ہفتہ بھر کوئی فوجی دستہ متعلقہ علاقے میں نظر نہ آتا۔ نمونہ تین واقعات ماضی میں،
 نومبر کے شروع میں بھارتی فوج کی نمبر ایک ناگا بٹالین کے سپاہی جیسور سیکٹر کے علاقہ دھرمادہا میں گھس آئے۔ پہلی رات انہوں
 نے تشریش میں گزار دی۔ دوسری رات بھی جو کس رہے۔ مگر کئی دن اور کئی راتیں گزرنے کے بعد انہیں کسی نے نہ چھڑا، حالانکہ ان
 کے مورچے سرد سے ڈیڑھ میل اندر واقع تھے۔ ۱۲ نومبر کو ہمارا ایک فوجی دستہ اچانک ادھر جا نکلا، تو پتہ چلا کہ ہمارے علاقے
 میں دشمن مورچے کھوئے بیٹھے۔ اگلی رات ان پر حملہ کر کے انہیں وہاں سے بھگایا گیا اور چار سپاہیوں کو پکڑ لیا گیا جو جنگ کے
 آخر تک ہمارے پاس رہے۔

اسی طرح کا ایک واقعہ کومیلہ کے جنوب میں بلوچیا کے مقام پر پیش آیا جہاں ۱۰ نومبر کو اچانک پتہ چلا کہ اس خمدار سردی
 علاقے کا اڈھانم دشمن کے قبضے میں جا چکا ہے۔ آگے آگے مکتی باہتی والے مورچہ بند ہیں اور پیچھے ان کی پشت پناہی کے لیے بھارتی
 سپاہی بیٹھے ہیں۔ انہیں وہاں سے پھا کرنے کے لیے کئی دنوں تک وسائل اور خیالات اکٹھے کیے جاتے رہے۔ بالآخر انہیں
 وہاں سے مار بھگایا گیا۔

اسی نوعیت کا ایک اور واقعہ جیسور سیکٹر میں بوسہ کے مقام پر ہوا جہاں ۱۳ نومبر کو بھارتی سپاہی گھس آئے۔ انہیں وہاں ہمارا
 نام و نشان نہ ملا تو انہوں نے آہستہ آہستہ جموں و کشمیر بٹالین اور نمبر ۲ سکھ لائٹ بٹالین جمع کر لیں۔ ہمیں ان کی موجودگی کا علم ۱۹ نومبر
 کو ہوا، چنانچہ جیسور سیکٹر کے انچارج بریگیڈیئر محمد حیات کو یہ علاقہ دشمن سے خالی کرانے کا حکم دیا گیا، چنانچہ ۲۲ ایف ایف اور ۲۸ ایف ایف
 کی دو کمپنیوں نے دشمن پر حملہ کیا جو ناکام رہا۔ ہمیں بھاری نقصان اٹھانا پڑا۔ ۳۸ ایف ایف کو اپنا زیادہ تر جنگی ساز و سامان چھوڑ کر
 اپنی جان بچانا پڑی۔ اس حادثے سے ایک طرف یہ ثابت ہو گیا کہ ہمارے سپاہیوں کے پائے ثبات میں لغزش آگئی ہے اور دوسری
 طرف یہ واضح ہو گیا کہ دشمن نے شوقیہ مورچے نہیں کھوئے اس کا ارادہ وہیں جمے رہنے کا ہے، چنانچہ اسے پھا کرنے کے لیے
 ایک اور کوشش کی گئی جس کے لیے ڈویژن کے زیر کمان ۲۱ پنجاب (آر اینڈ ایس) اور ۶ پنجاب کو مستعد کیا گیا۔ انہیں دو جماعتوں
 'الف' اور 'ب' میں تقسیم کر کے بالترتیب لیفٹیننٹ کرنل امتیاز ڈرائیج اور لیفٹیننٹ کرنل شریف کے سپرد کیا گیا۔ اس کے علاوہ انہیں
 توپخانے کی ایک فیلڈ جرنٹ اور ٹینکوں کا ایک ہکو اڈرن بھی دیا گیا۔

مذکورہ بالا فوج کے ساتھ منصوبے کے مطابق ۲۱ نومبر کو صبح چھ بجے حملے کا آغاز ہوا۔ شروع میں پیش قدمی کی رفتار حوصلہ افزا
 رہی، لیکن جونہی ہمارے فوجی درختوں کے جھنڈ کے قریب پہنچے وہاں چھپے ہوئے دشمن کے ٹینک ان پر آگ برسانے لگے ساتھ ہی
 سرد پار سے دشمن کی توپوں کے منہ بھی کھل گئے۔ ہمیں اتنی مزاحمت کی توقع نہ تھی، کیونکہ ہمارے ماہرین کی نظر میں اس علاقے میں
 ٹینک نہیں آسکتے تھے۔ ہم بے خبری میں مارے گئے۔ اڑے وقت میں پاک فضائیہ سے مدد طلب کی گئی جو فوراً پہنچ گئی، مگر ادھر سے
 بھارتی طیارے بھی فضا میں آگئے۔ دشمن کا پلہ بھاری رہا۔ ہمارے دو طیارے اور چھ ٹینک تباہ ہو گئے۔ دشمن اپنی جگہ پڑوٹا رہا۔ حملہ ترک
 کر دیا گیا، البتہ دشمن کو مزید پھیلنے سے روکنے کے لیے اس کے سامنے فوجی دستے متعین کر لیے گئے۔ دشمن نے اپنی کسی عسکری یا مصلحت

کی وجہ سے ۲ دسمبر تک مزید پھیلنے کی کوئی قابل ذکر کوشش نہ کی جس سے ہمیں یہ دھند درا پھینے کا موقع مل گیا کہ ہم نے ۲ دسمبر تک دشمن کو وہیں روکے رکھا۔

دشمن کو وہیں بند رکھنے کے لیے اس کے تینوں جانب جو حصار باندھا گیا وہ خاص فوجی نقطہ نظر سے نامناسب تھا، کیونکہ اس حصار بندی میں جیسور سیکٹر میں تین ہجاری فوج کا بیشتر اور طاقت درختہ صرف ہو گیا تھا جس سے سرحد کے باقی حصوں کے دفاع کے لیے بہت کم فوجی رہ گئی تھی۔ اگر دشمن حصار پر مامور فوج کو مقامی چھٹر چھاڑ میں مصروف رکھ کر کسی اور حصے پر حملہ کر دیتا تو اس کا کام بہت آسان ہو جاتا، مگر دشمن نے ہجاری اس کمزوری سے فائدہ نہ اٹھایا، کیونکہ اس وقت تک بھارت کے مقاصد محدود تھے۔ وہ صرف مقرزہ وقت پر اور مناسب حالات میں بھر پور پیش قدمی کر کے مشرقی پاکستان کو نگلنا چاہتا تھا۔ وہ قبل از وقت اپنے ارادوں سے پر وہ سرکام نہیں چاہتا تھا۔

۲۱ نومبر کو بوسہ کے مقام پر ہمیں جو واقعہ پیش آیا اسے جنرل نیازی کے ہیڈ کوارٹر (ایسٹرن کمانڈ) نے بڑھا چڑھا کر پیش کیا۔ میں ان دنوں مغربی پاکستان آیا ہوا تھا۔ میں نے راولپنڈی میں یہ خبر سنی کہ دشمن نے جگ طیاروں بکتر بند گاڑیوں اور توپخانے کی مدد سے بوسہ (جیسور) پر حملہ کر دیا ہے، حالانکہ حقیقت حال یہ تھی کہ دشمن ایک ہفتہ پہلے سے وہاں موجود تھا اور ہم نے اسے پیا کرنے کی کوشش کی تھی جس میں ہم ناکام رہے تھے۔

اسی ہفتے (۲۰ نومبر تا ۲۵ نومبر) ایسٹرن کمانڈ نے واویلا کیا کہ بھارت نے چار اور مقامات یعنی ضلع سلٹ میں ذکی گنج اور انگرام ضلع دیناج پور میں ہلی اور ضلع زنگپور میں پانچاگرہ پر بھی بھر پور حملہ کر دیا ہے۔ درحقیقت دشمن سرحد کے ساتھ ساتھ چند اہم مقامات پر قبضہ کرنا چاہتا تھا تاکہ باقاعدہ جنگ چھڑنے پر اسے پیش قدمی کرنے میں سہولت ہو، مگر ایسٹرن کمانڈ نے اسے بھر پور جنگ کا آغاز قرار دیا تاکہ ایک تو جیسور میں ۳۸ اینٹ اینٹ کی طرح سلٹ اور زنگپور میں متعلقہ فوجی یونٹوں کی پسیانی کا جواز مل سکے، دوسرے جی ایچ کیو پر واضح ہو جائے کہ ٹائیگر نیازی کتنے دباؤ کا کس پامردی سے مقابلہ کر رہے ہیں۔

جیسور، سلٹ اور زنگ پور سیکٹرز میں ان بھڑیلوں کے بعد جنرل نیازی وہاں تشریف لے گئے۔ میں بھی ان کے ساتھ تھا۔ انہوں نے پسا ہونے والی یونٹوں کو بڑا بھلا کہا اور یہ فیصلہ صادر فرمایا: آئندہ کوئی فوجی دستہ یا یونٹ اس وقت تک پسا نہیں ہوگی جب تک کہ اس کی تین چوتھائی فوجی زخمی یا شہید نہ ہو جائے۔ ایسی صورت میں بھی پسیانی جی اوسی کی ذاتی اجازت کے بغیر نہیں ہوگی (بعد میں ان احکامات کی توثیق تحریری طور پر بھی کی گئی)۔

جنرل نیازی ۲۲ نومبر سے ۲ دسمبر تک تقریباً روزانہ سرحدی علاقوں کے دورے پر جاتے رہے۔ مجھے یاد ہے، ۲۴ نومبر کو وہ ہلی تشریف لے گئے جہاں غیر ملکی صحافیوں کی ایک جماعت بھی پہنچی ہوئی تھی۔ یہ جماعت درحقیقت سرکاری طور پر وہاں بھیجی گئی تھی تاکہ بھارتی جارحیت کی تازہ واردات دیکھ سکے (چند روز پہلے بھارتی حملے کے دوران دشمن کا ایک ٹینک تباہ ہو کر ہمارے علاقے میں رہ گیا تھا) وہیں ایک غیر رسمی اخباری کانفرنس شروع ہو گئی جو تقریباً آدھ گھنٹہ جاری رہی۔ اخباری کانفرنس کے آخر میں ایک صحافی نے پوچھا:

آپ کے خیال میں بھر پور جنگ کب شروع ہوگی؟

جنرل نیازی نے چکن ٹکنے کی پلیٹ سے اپنا سر اٹھاتے ہوئے فرمایا:



”میرے لیے بھرپور جنگ تو پہلے ہی شروع ہو چکی ہے؛
 ان کے اس جواب پر کسی کو اعتبار نہ آیا، کیونکہ سبھی جانتے تھے کہ اگر بھارت نے فضائیہ، ٹینک اور توپ خانے سے بھرپور جنگ
 شروع کر دی ہوتی، تو جنرل نیازی یمن پلیٹ چکن ٹکوں کے بعد اخبار نویسوں سے چٹکلے بازی کرنے کے بجائے کسی تہ خانے میں بیٹھ کر
 رو رہے ہوتے۔“

صحافیوں کی یہ جماعت جب تباہ شدہ بھارتی ٹینک دیکھنے روانہ ہوئی، تو جنرل نیازی نے ڈھاکہ روانگی کا ارادہ کیا۔ انہیں ہرگز
 خدشہ نہ تھا کہ ان کے ہیلی کاپٹر پر کہیں بھارتی جیٹ نہ جھپٹ پڑیں۔ وہ منستے کھلتے ایک نوجوان خاتون صحافی کو ہیلی کاپٹر میں بٹھا کر
 ڈھاکہ لے آئے تاکہ فلیگ سٹاف ہاؤس میں اسے رات کو خصوصی انٹرویو دے سکیں۔

یہ انگریزی اصطلاح EXCLUSIVE INTERVIEW کا ترجمہ ہے جس کا مطلب ایسا انٹرویو ہے جس کے دوران کوئی اور صحافی موجود نہ ہو۔



شکست کی تیاری

اگرچہ جنرل نیازی نومبر کے آخر میں اخبار نویسوں سے باتیں کرتے ہوئے دعویٰ کر چکے تھے کہ وہ بھارت سے بھرپور (ٹوٹل) جنگ لڑ رہے ہیں، مگر میدان جنگ میں ان کی سپاہ کی تنظیم و ترتیب سے اس کی لفظی ہوتی تھی۔ ان کے زیرِ کمان تمام فوج چھوٹی چھوٹی ٹکڑیوں میں بٹ کر ۲۰۰ کلومیٹر سرحدوں کے ساتھ ساتھ بکھری ہوئی تھی جو تخریب کاروں، شہر سپدوں اور سرحدی جھڑپوں کے لیے تو موزوں ہو سکتی تھی مگر بھرپور جنگ کے لیے نہیں، کیونکہ اس کے تقاضے کچھ اور تھے۔ یہ تقاضے کیا تھے اور ان سے عہدہ براہونے کے لیے کونسی دفاعی حکمت عملی مناسب تھی، اس کا جائزہ لینے سے پہلے آئیے اس خطہ زمین پر ایک نظر ڈال لیں جس کا دفاع جنرل نیازی کے سپرد تھا۔

مشرقی اور مغربی پاکستان کے درمیان کوئی ۱۶۰۰ کلومیٹر فاصلہ تھا۔ مشرقی بازو تین اطراف سے بھارتی علاقے میں گھرا ہوا تھا۔ چوتھی طرف خلیج بنگال تھی جس پر بھارتی بحریہ کا غلبہ تھا اور وہ آسانی اس کی ناکہ بندی کر سکتی تھی۔ صرف جنوب مشرقی سرحد پر ایک چھوٹی سی پٹی تھی جو برما کی طرف کھلتی تھی، مگر یہ علاقہ پہاڑیوں اور جنگلوں کی وجہ سے دشوار گزار تھا۔ یہاں میزو قبائل اور جنگلی درندوں کا دور دورہ تھا۔ اس علاقے میں چوری چھپے تخریب کاری، شراکتی یا محدود گوریلا کارروائی تو ممکن تھی مگر روایتی انداز میں ٹینکوں اور توپوں کی جنگ بعید از قیاس تھی۔

باقی صوبہ زیادہ تر آبی نوعیت کا تھا جسے دریائے جہنا، دریائے گنگا اور دریائے گھنا نے چار واضح حصوں میں تقسیم کر دیا تھا۔ ہر حصے میں چھوٹے چھوٹے دریا، نالے اور جھیلیں تھیں جنہیں فضا سے دیکھ کر یوں محسوس ہوتا تھا کہ کسی ماہر فنکار نے مختلف لکیروں، چوکوروں اور ٹکڑوں سے ایک شاہکار ترتیب دیا ہے۔ ان دریاؤں اور نالوں سے جو زمین بچی تھی اسے درختوں، فصلوں اور جھاڑیوں نے ڈھانپ رکھا تھا۔ اس کے علاوہ مشرقی پاکستان میں دو بڑے جنگل تھے جو سندر بن (جیسور کے قریب) اور مادھوپور (تنگیل کے قریب) میں واقع تھے۔ ان میں اچھی خاصی فوج پناہ لے سکتی تھی اور اسلحے اور ایمونیشن کے بڑے ذخائر آسانی چھپائے جاسکتے تھے۔

مشرقی پاکستان میں موسم کامزاج متلون تھا۔ سردیاں اور گرمیاں مختصر اور برسات طویل ترین۔ بارشیں عموماً اپریل میں شروع ہو کر اکتوبر تک جاری رہتیں مگر سرکاری لحاظ سے موسم برسات مئی سے ستمبر تک شمار ہوتا تھا۔ شاید ہی کوئی موسم برسات گزرا ہو جس میں سیلاب کی بلینار نہ ہوتی ہو۔ عموماً ہر سال وسیع علاقہ زیرِ آب آجاتا اور کشتیوں کے علاوہ آمد و رفت کے تمام ذرائع مفلوج ہو کر رہ جاتے۔ سیلاب اترنے کے بعد بھی خاصے خاصے عرصے تک زمین اتنی سیلی سیلی رہتی کہ وہاں فوجی مقاصد کے لیے وسیع پیمانے پر ٹرکوں یا ٹینکوں کی نقل و حرکت ناممکن سمجھی جاتی۔

زمین کی یہ دریا دہنی اور برسات کی یہ فراوانی اس بات کی نشاندہی کرتی تھی کہ بھارتی حملے کے لیے بہترین مہینے دسمبر سے مارچ ہوں گے۔ بھارت نے ہاتھ پر ہاتھ دھرے ان مہینوں کا انتظار کرنے کے بجائے اس عرصے کو بہت مفید (اس کے نقطہ نظر سے) طریقے سے گزارا۔ اس نے ایک طرف ہماری افواج کو ذہنی اور جسمانی طور پر تھکا دینے کے لیے ملتی باہنی کو استعمال کیا اور دوسری طرف اپنی عسکری قوت کو زیادہ منظم اور موثر بنانے پر پوری توجہ دی۔

آئیے ایک نظر بھارت کی اس عسکری قوت پر بھی ڈال لیں جس کا ہمیں مشرقی پاکستان میں سامنا تھا۔ بھارت کی آٹھ ڈویژن تازہ دم فوج مشرقی پاکستان کی سرحدوں پر صرف آرا تھی (دو اور ڈویژن چین کی طرف متعین تھے، مگر بوقت ضرورت ان کا رخ بھی مشرقی پاکستان کی طرف موڑا جاسکتا تھا)۔ ان آٹھ ڈویژنوں میں سے دو مغربی بنگال میں تھے تاکہ وہ حکم ملنے پر حبیبور کی طرف پیش قدمی کر سکیں۔ یہ ۲ کور کے ماتحت تھے۔ ہمارے شمال مغربی علاقے پر چڑھائی کے لیے تین ڈویژنوں پر مشتمل ۳۳ کور بھی۔ عین شمال میں ۱۰ کمیونی کیشن زون تھا جو ایک لڑاکا ڈویژن کے طور پر لڑنے کی صلاحیت رکھتا تھا۔ اس کی کمان ایک میجر جنرل کے سپرد تھی۔ وہ گئی مشرقی سرحد تو وہاں بھارت کے تین ڈویژن پڑے تھے جن کی کمان ۴ کور کے حوالے تھی۔ ہر ڈویژن کے ساتھ جو ٹینک اور توپخانہ ضروری ہوتا ہے، وہ بھی موجود تھا۔

اس کے علاوہ بھارت کے پاس رسالے اور آرٹلری کی کئی رجمنٹیں تھیں جن کی تفصیل یہ ہے:

(الف) فیلڈ رجمنٹ (توپخانہ) : ۴۸ توپیں (بعد میں ۶۰ کر دی گئیں)

(ب) میڈیم رجمنٹ (توپخانہ) : ۱۰ توپیں (بعد میں ۱۲ کر دی گئیں) ان توپوں میں روسی ساخت کی ۱۳۰ ملی میٹر دہانے والی توپیں بھی شامل تھیں جو ۳۰ کلومیٹر تک مار کرتی تھیں۔

(ج) ٹی ۵۵ ٹینک : ایک رجمنٹ

(د) پی ٹی ۶ ٹینک : ایک رجمنٹ اور دو سکواڈرن

(ه) شرم ٹینک : ایک رجمنٹ

ہمارے ٹینک رات کو استعمال نہیں ہو سکتے تھے، مگر بھارت کے اکثر ٹینکوں میں انفرا ریڈ شیشے نصب تھے جن کی مدد سے انہیں تاریکی میں بھی استعمال کیا جاسکتا تھا۔ اسی طرح اس کے بعض ٹینک پانی میں تیر کر رکاوٹ عبور کرنے کی بھی صلاحیت رکھتے تھے۔ علاوہ ازیں بھارت کے پاس معقول تعداد میں بکتر بند گاڑیاں تھیں جن کی مدد سے بیک وقت دو پلٹنوں کی نفری گولیوں کی بوچھاڑ سے محفوظ رہ کر میدان جنگ میں نقل و حرکت کر سکتی تھی۔

بھارت کی فضائی قوت اسی سکواڈرنوں (ایک سکواڈرن میں عموماً ۸ ایلٹے ہوتے ہیں) پر مشتمل تھی جس میں ۲۱ کینبرا (بمبار) ، ایس یو ۷ (لڑاکا بمبار) اور نیٹ (زمینی ٹارگٹ) دینے والے ایلٹے شامل تھے۔ ان طیاروں سے پورا پورا فائدہ اٹھانے کے لیے بھارت نے مشرقی پاکستان کے ارد گرد ہوائی اڈوں کا جال بچھا دیا تھا۔ دریاؤں کی رکاوٹ عبور کرنے کے لیے بار بردار طیارے اور ہیلی کاپٹر مہیا کیے گئے تھے۔

لے بھارتی توپخانے کی ایک رجمنٹ میں عموماً ۸ توپیں ہوتی ہیں جبکہ ٹینکوں کی رجمنٹ ۴۵ ٹینکوں (چار سکواڈرنوں) پر مشتمل ہوتی ہے۔



بھارت کی بحری قوت میں سب سے قابل ذکر اس کا (AIRCRAFT CARRIER) یعنی طیارہ بردار بحری بیڑہ تھا جسے "وکرنت" (VIKRANT) کہتے تھے۔ اس میں دیکھ بھال کرنے والے چھ طیارے، ہم اسمذری عقاب (ٹراکامبار) اور آبدوزوں کے خلاف استعمال ہونے والے تین سی ہاک طیارے شامل تھے۔ اس بیڑے کی حفاظت کے لیے معقول تعداد میں ڈسٹرائر (DESTROYER) اور فریگیٹ (FRIGATES) تھے۔ اس کے علاوہ بھارتی بحریہ کے پاس چار بڑے جنگی جہاز ریاس برہم پترا، کامورتا اور کرمارتی، دو آبدوزیں (نندھاری اور کالواری)، ایک ٹرنگس صاف کرنے والا جہاز اور پانچ مسلح کشتیاں (گن بوٹ) تھیں۔

اس بڑی، بحری اور فضائی قوت کے علاوہ بھارت کے پاس ایک چھتہ بردار بریگیڈ، تین بریگیڈ گروپ، بارڈر سیکورٹی فورس کی ۲۴ پلٹنیں اور ایک لاکھ "مکتی باہنی" تھی۔ بھارتی قوت میں، میں نے اس بنگالی آبادی کا ذکر نہیں کیا جو کسی پلٹن یا "باہنی" میں بھرتی ہونے کے بجائے اپنے اپنے گھروں میں تھی مگر اس کی ہمدردیاں بھارت اور اس کی آلہ کار مکتی باہنی کے ساتھ تھیں۔

اوپر بھارت کی صرف اس عسکری قوت کا ذکر کیا گیا ہے جو خالصتہ مشرقی پاکستان کے محاذ پر متعین تھی۔ اس کا مقابلہ کرنے کے لیے پاکستان کے پاس (مشرقی پاکستان میں) صرف تین انفنٹری ڈویژن تھے جو ضروری ساز و سامان سے بھی پوری طرح لیس نہ تھے۔ پاکستان ایئر فورس کا صرف ایک اسکواڈرن ڈھاکہ میں تھا جس میں ۱۶ سیبر طیارے تھے۔ ہوائی اڈہ بھی ایک ہی تھا جس کے خراب یا تباہ ہونے کی صورت میں سارے جہاز بیکار ہو سکتے تھے۔ ڈھاکہ چھاؤنی کے شمالی جانب زیر تعمیر اڈہ ابھی قابل استعمال نہ ہوا تھا۔ اگر اس اڈے وقت میں مزید طیارے وہاں بھیج دیے جاتے، تو ہوائی اڈوں کی کمی کے پیش نظر ان کی افادیت مشکوک ہو کر رہ جاتی۔ ہمارا کل بحری سرمایہ ایک ریڑائیڈ مرل اور چار مسلح کشتیوں (گن بوٹ) پر مشتمل تھا۔ یہ کشتیاں پندرہ بیس سال پہلے سمگلنگ کی روک تھام کے لیے خریدی گئی تھیں۔

یہ بھی ہماری کل دفاعی پونجی، اس میں اضافہ کرنے کے لیے رضا کاروں، مجاہدوں، اسکواڈوں اور ایٹ پاکستان سول آرمڈ فورسز (ای پی سی اے ایف) کی نیم عسکری نفری کٹھی کی گئی جس کی کل تعداد ۳۷ ہزار بنتی تھی۔ کہا جاتا ہے وسائل کی کمی کو جنرل کا ذہن پورا کر دیتا ہے مگر اس میدان میں بھی ہماری عزت جنرل نیازی جیسے آدمی کے ہاتھ میں تھی۔

بے شک بھارت کے وسائل ہم سے کئی گنا زیادہ تھے، مگر غور طلب بات یہ تھی کہ وہ انہیں کس مقصد کے لیے استعمال کرنا چاہتا تھا؟ دوسرے لفظوں میں بھارت کے عزائم کیا تھے؟ اگرچہ آج یہ سوال لایعنی معلوم ہوتا ہے، کیونکہ جنگ کا نتیجہ ہمارے سامنے ہے، مگر ان دنوں اس سوال کا جواب اتنا واضح نہ تھا۔ بہت سے فوجی دماغ اس ٹوہ میں بیٹھے تھے کہ دشمن کے ارادوں کو قبل از وقت بھانپ کر دفاعی اقدامات کیے جائیں۔ ان کی سوچ بچار کا پتہ پڑ گیا تھا کہ بھارت مشرقی پاکستان کے ایک حصے پر قبضہ کرنا چاہتا ہے تاکہ اسے آزاد بنگلہ دیش کا نام دے کر اس پر بنگالی پناہ گزینوں کو آباد کرے۔

اس بھارتی مقصد کو محور بنا کر مشرقی پاکستان میں موجود فوج کو سارے صوبے خاص طور پر سرحدی علاقوں میں بکھیر دیا گیا تاکہ مکتی باہنی یا اس کے سرپرست کسی قابل ذکر خطہ زمین پر قبضہ نہ کر لیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ہمارے سپاہیوں نے انتہائی نامساعد حالات میں بھارت کو آٹھ ماہ تک اس مقصد میں کامیاب نہ ہونے دیا، مگر کیا واقعی بھارت اسی مقصد کے لیے کام کر رہا تھا؟ حقیقت یہ ہے کہ بھارت سارے مشرقی پاکستان کو بٹیرپ کرنے کے درپے تھا اور سرحدی علاقے میں چھوٹی چھوٹی جگہوں پر قبضہ کرنے کی بھارتی کوشش اس کے عظیم منصوبے کی پہلی کڑی تھی۔



بھارتی عوام کا غلط اندازہ لگانے کی ذمہ داری کس پر عائد ہوتی ہے؟ جنرل نیازی پر ایچ کیو پر؟ اس سوال کا خلاصہ جواب دینے کے لیے ضروری ہے کہ اس بات کا کھوج لگایا جائے کہ جی ایچ کیو نے جنرل نیازی کو "مشن" کیا دیا تھا۔ یہ بات صیغہ راز میں نہیں کہ ایسٹرن کمانڈ کو مشرقی پاکستان کے دفاع کا فرض سونپا گیا تھا اور یہ بات ایسٹرن کمانڈ کے کمانڈر (جنرل نیازی) پر چھوڑ دی گئی تھی کہ وہ اس مشن کو پورا کرنے کے لیے دشمن کے عوام کا اندازہ لگائے اور انہیں ناکام بنانے کے لیے فوجی اسٹریٹجی وضع کرے۔

مشرق پاکستان کے مخصوص حالات میں بہترین فوجی اسٹریٹجی کیا تھی؟ اور جنرل نیازی نے کس اسٹریٹجی کو اپنایا؟ آئیے اس مسئلے پر ذرا ٹھنڈے دل سے غور کریں۔ مشرقی پاکستان کے دفاع کے چار طریقے تھے:

اول: تمام تر توجہ ڈھاکہ پر مرکوز کر دی جائے اور جتنے وسائل دستیاب ہیں، انہیں استعمال میں لا کر ڈھاکہ کے گرد دفاعی حصار بنا دیا جائے۔ جغرافیائی لحاظ سے یہ دفاعی حصار تین بڑے دریاؤں (جمنا، برہم پتر اور میگھنا) کے کناروں پر استوار کیا جاسکتا تھا۔ اس حکمت عملی کے دو واضح نقصان تھے۔ ایک یہ کہ ہر چیز اس دفاعی حصار پر مرکوز کرنے سے مشرقی پاکستان کا بیشتر حصہ جس میں جیسور، کشتیا، راجشاہی، بوگرہ، رنگ پور، سلہٹ، کومپلا اور جٹاگانگ شامل تھے، کسی مزاحمت کے بغیر دشمن کے قبضے میں چلا جاتا۔ دوسرا یہ کہ اس دفاعی حصار کو توڑنے کے لیے بھارت کو بمشکل چار ڈویژن فوج درکار ہوتی اور وہ باقی چار ڈویژن بآسانی مغربی محاذ پر منتقل کر دیتا جہاں ہمیں زندگی میں پہلی بار (اور شاید آخری مرتبہ) قریب قریب عدوی برابری حاصل ہوتی تھی۔ یہاں یہ بات بے محل نہ ہوگی کہ ہم قیام پاکستان سے کہتے آئے تھے کہ "مشرق پاکستان کا دفاع مغربی پاکستان سے ہوگا"۔ اس لیے مغربی محاذ پر بھارتی فوج کی بھرمار اس قومی اسٹریٹجی میں رکاوٹ کا باعث بن سکتی تھی۔

دوئم: اپنے سارے وسائل سرحدوں کے دفاع پر لگا دیے جائیں اور دباؤ پڑنے پر بوقت ضرورت آہستہ آہستہ پیچھے ہٹا جائے حتیٰ کہ ہم ڈھاکہ کے ارد گرد جمع ہو جائیں۔ بظاہر ایک معقول تدبیر تھی لیکن دو وجوہ نے اسے ناقابل عمل بنا دیا تھا۔ ایک تو بھارت کی فضائی برتری کی وجہ سے دن کے وقت لپٹا ہونا مشکل تھا، دوسرے رات کو جگہ جگہ کئی باہنی کا سامنا کرنا پڑتا۔ سوئم: اس نکتہ فکر کے مطابق مشرقی پاکستان کا بہترین دفاع اس میں تھا کہ کسی ایک جگہ کو آخری دم تک "بچانے کے بجائے متحرک جنگ" کا راستہ اختیار کیا جائے۔ اس نقطہ نظر میں قباحت یہ تھی کہ اس بھاگ بھاگ میں بھارتی فوج اور کئی باہنی کے تعاون سے زمین ہمارے لیے تنگ ہو سکتی تھی۔ صوبے کے اندر اور باہر مخالفت کے پیش نظر یہ اسٹریٹجی مناسب نہ تھی۔

چہارم: اس طریقہ کار کا بنیادی نکتہ یہ تھا کہ سرحدی شہروں خصوصاً ان شہروں کو جو حملہ آور کے راستے میں پڑتے تھے "دفاعی قلعوں" میں تبدیل کر لیا جائے۔ ان میں طویل لڑائی کے لیے راشن، ایمونیشن اور دیگر جنگی سامان جمع کر لیا جائے اور ارد گرد مورچے کھود لیے جائیں تاکہ اوپر سے دشمن جتنی ضرر بھی لگاتا جائے، انہیں بلا نقصان سہا جائے اور وقت ضرورت اپنی دفاعی قلعوں کو بنیاد بنا کر دشمن پر حملہ بھی کیا جائے۔ یہ طریقہ کار اگرچہ بہت پرانا اور کسی حد تک فرسودہ تھا، مگر موجودہ حالات میں اس میں دو فائدے تھے۔ ایک یہ کہ اس طرح وسیع علاقہ کسی مزاحمت کے بغیر دشمن کے حوالے کرنے کے بجائے اس کا جگہ جگہ دفاع کیا جاسکتا تھا۔ دوسرے یہ کہ ہم اپنے ناکافی وسائل کو مخصوص مقامات پر جمع کر کے مؤثر دفاع کی صورت پیدا کر سکتے

تھے۔ خیال تھا اول تو دشمن کو ہر دفاعی قلعہ "فتح کر کے آگے بڑھنا پڑے گا جو آسان کام نہ ہوگا اور اگر اس نے سے 'غیر
 مفتوح" چھوڑ کر آگے بڑھنے کی کوشش کی، تو اسے ہر وقت پیچھے سے حملے کا ڈر رہے گا۔ تیسری صورت یہ ہو سکتی تھی کہ
 وہ ہر قلعہ کو محصور کر کے آگے بڑھے گا جس کا مطلب ہوگا اسے ہر قلعے کو محصور کرنے کے لیے معقول تعداد میں فوج تعینات
 کرنا پڑے گی اور پیش قدمی کے لیے مزید نفری درکار ہوگی یعنی ڈگنی فوج لگانی پڑے گی۔ اس حکمت عملی کو فوجی مبصر عموماً
 لوہار کے "مٹھوڑے" اور آہرن سے تشبیہ دیتے ہیں یعنی مٹھوڑا حملہ کرنے والے کا اور آہرن حملہ سہنے والا۔ اس کی حمایت
 میں عموماً یہ دلیل دی جاتی ہے کہ مٹھوڑا اچلائے والے بازو تھک جاتے ہیں مگر آہرن "نہیں ٹوٹتی۔"

مذکورہ بالا طریقوں میں سے جنرل نیازی نے طریقہ نمبر ۳ منتخب کیا اور سرحد کے قریب چیدہ چیدہ شہروں کو دفاعی قلعوں میں
 بدل دیا۔ ان شہروں میں جسیور، جنیدہ، بوگرہ، رنگ پور، جمال پور، مہین سنگھ، سلٹ، بہراب بازار، کومیلا اور چٹاگانگ شامل تھے۔
 ہر دفاعی قلعے میں ۳۵ دن کا راشن اور ۶۰ دن کا گولہ بارود جمع کرنے کو کہا گیا۔ ان کے علاوہ بعض شہروں اور قصبوں کو مضبوط مقام
 (STRONG POINT) کا درجہ دیا گیا۔ یہ مقامات عام شہروں سے زیادہ اور دفاعی قلعوں سے کم دفاعی صلاحیت رکھتے تھے۔

ان دفاعی قلعوں پر مبنی ایسٹرن کمانڈ نے جو فوجی اسٹریٹجی وضع کی، اُس کے نمایاں خدوخال یہ تھے:
 (۱) سرحدی چوکیوں پر متعین ہمارے فوجی اُس وقت تک لڑتے رہیں گے جب تک کہ مقامی جنرل آفیسر کمانڈنگ انہیں پسپا
 ہونے کا حکم نہیں دیتا۔

(ب) پسپا ہوتے ہوئے حتی الامکان مزاحمت کی جائے گی تاکہ زیادہ سے زیادہ وقت میں کم سے کم زمین ہاتھ سے جائے، اور
 (ج) بالآخر یہی فوج واپس آکر دفاعی قلعوں میں مورچہ بند ہو جائے اور آخری وقت تک لڑتی رہے۔

جنرل حمید (چیف آف سٹاف) جب ڈھاکہ آئے، تو انہیں اس منصوبے کی تفصیلات پیش کی گئیں۔ انہوں نے اصولی طور پر اتفاق
 کیا۔ بعد میں یہ منصوبہ جی ایچ کیو روانہ کیا گیا جہاں پیشہ ورانہ نقطہ نظر سے اس کا جائزہ لیا گیا۔ اس منصوبے کو درج ذیل تصریحات کے
 ساتھ منظور کر کے ایسٹرن کمانڈ کو لوٹا دیا گیا:

(۱) راجشاہی کے سامنے سرحد پار انگلش بازار پر حملے کی گنجائش پیدا کی جائے۔
 (ب) فرخا بند کو تباہ یا مفلوج کرنے کے لیے چھاپہ مار فوج کے اقدامات کو منصوبے میں شامل کیا جائے۔
 (ج) چٹاگانگ میں ایک پلٹن ضرور رکھی جائے تاکہ وہ سمندری راستے سے آنے والی کسی کمک کو وصول کر سکے۔
 (د) ڈھاکہ کو مشرقی پاکستان کے دفاع کی گنجی سمجھا جائے۔

ایسٹرن کمانڈ نے حسب الحکم ان تصریحات کو اصلی پلان میں شامل کر لیا اور جی ایچ کیو کو تعمیل ارشاد سے آگاہ کر دیا۔
 اب یہ اندازہ لگانا باقی تھا کہ دشمن کے حملے کا رخ کس طرف ہوگا یعنی کس جانب سے وہ پوری طاقت سے حملہ کرے گا اور
 کس طرف سے اضافی کوشش کرے گا۔ اس رخ کا اندازہ کرنا بہت ضروری تھا، کیونکہ اسی کے مطابق دفاعی فوج کو بھی متعین کرنا تھا۔
 اس سلسلے میں فوجی رولز کے مطابق مختلف مفروضوں (مفروضہ نمبر ایک، مفروضہ نمبر دو، مفروضہ نمبر تین اور مفروضہ نمبر چار) کو زیر بحث
 لایا گیا اور اتفاق رائے اس بات پر ہوا کہ اصلی اور بڑا حملہ کلکتہ کی جانب جسیور سیکٹر میں ہوگا اور ذیلی اقدام (مشرق میں) تری پور کے
 علاقے سے کومیلا سیکٹر میں ہوگا۔ اسی سوچ کے مطابق تمام وسائل کو حسب ذیل طریقے سے بانٹ دیا گیا:

(۱) جلسیور سیکٹر

اس سیکٹر میں ایک ڈویژن (نمبر ۹) تھا جس کی کمان میجر جنرل محمد حسین انصاری کے سپرد تھی۔ اس ڈویژن میں دو برگیڈ تھے۔ ۱۰۷ برگیڈ اور ۵۷ برگیڈ۔ ان کے ہیڈ کوارٹر بالترتیب جلسیور اور حنیدہ میں واقع تھے۔ پیدل فوج کے علاوہ اس ڈویژن کے پاس توپخانے کی دو رجمنٹیں اور (دید بانی اور کمک رسائی کے لیے) ایک آر اینڈ ایس بٹالین تھی۔

(۲) شمالی بنگال

اس محاذ پر میجر جنرل نذر حسین کا سولہواں ڈویژن تھا جس کا ہیڈ کوارٹر ناٹور میں تھا۔ اس ڈویژن میں بھی دو برگیڈ تھے۔ ایک برگیڈ (۲۳) رنگ پور میں تھا اور دوسرا (۲۰۵) بوگرہ میں۔ اس ڈویژن کے پاس رسالے اور توپخانے (فیلڈ) کی ایک ایک رجمنٹ اور ہلکی توپوں (مارٹر) کی دو بیٹریاں تھیں۔

(۳) مشرقی سرحد

مشرقی سرحد کا دفاع میجر جنرل عبد المجید قاضی کے سپرد تھا جو ۴ ڈویژن کی کمان کر رہے تھے۔ اس ڈویژن کا ایک برگیڈ (۲۷) مہین سنگھ میں تھا اور دوسرا (۲۱۲) سلہٹ میں، اس کے علاوہ جنرل قاضی کے پاس توپخانے کی ایک رجمنٹ، مارٹر توپوں کی دو بیٹریاں اور چار ٹینک تھے۔ جنرل قاضی کا مستقل ہیڈ کوارٹر ڈھاکہ تھا۔

(۴) چٹاگانگ سیکٹر

اس سیکٹر کا دفاع برگیڈ بریوٹ کے سپرد تھا جس کے پاس ۹۳ برگیڈ تھا۔ اس کا ہیڈ کوارٹر چٹاگانگ میں واقع تھا۔ مذکورہ بالا تقسیم کے بعد اندازہ ہوا کہ زمین زیادہ ہے اور سپاہی تھوڑے؛ چنانچہ ان کی کمی کو پورا کرنے کے لیے نیم عسکری جمعیت یعنی مجاہدوں، رضا کاروں، اسکاؤٹوں، پولیس اور ای پی سی اے ایف کی نفزی کو بھی متعلقہ جرنیلوں کے حوالے کیا گیا تاکہ وہ اپنے اپنے دفاع کو مزید "گھنا" کر سکیں جنگ کے دوران جب دباؤ پڑا، تو ہماری دفاعی لائن میں یہی نفزی سب سے کمزور تھی۔

جب جنگ کے بادل گہرے ہونے لگے تو جنرل نیازی نے دشمن کو دھوکا دینے کے لیے دو عبوری ڈویژن ہیڈ کوارٹر اور چار عبوری برگیڈ ہیڈ کوارٹر کھڑے کر دیے۔ ایک ڈویژن ہیڈ کوارٹر کا انچارج ای پی سی اے ایف کے ڈائریکٹر جنرل میجر جنرل حمید کو بنایا گیا جو پہلے کلاہی ڈھاکہ میں تھے اور دوسرا ہیڈ کوارٹر میجر جنرل رحیم خاں کی قیادت میں چلا۔ پور روانہ کر دیا گیا۔ جنرل رحیم ان دنوں جنرل نیازی کے نائب کے طور پر ڈپٹی مارشل لائیڈ منسٹر پیٹر کے فرائض انجام دے رہے تھے۔

۴ ڈویژن کا ۲۷ برگیڈ جو مہین سنگھ میں مقیم تھا اسے مشرقی سرحد پر اب بازار منتقل کر دیا گیا، مگر اس کی ایک پلٹن مہین سنگھ میں روک لی گئی۔ ایک اور پلٹن ملا کر ایک نیا برگیڈ (زیر قیادت برگیڈیر قادر) تشکیل دیا گیا۔ جنرل حمید کے پاس یہ ایک برگیڈ اور اپنی نیم فوجی (ای پی سی اے ایف) نفزی تھی۔

۵۳ برگیڈ اڑے وقت میں ڈھاکہ کے دفاع کے لیے مخصوص تھا۔ نیازی نے اسے فنی میں جنرل رحیم کے زیر کمان کر دیا۔ جنرل رحیم کے ڈویژن کا دوسرا برگیڈ (۱۱۷) ۴ ڈویژن سے لیا گیا جو کوسلا میں متعین تھا، اب بھی وہیں رہا۔ اس طرح جنرل رحیم کے پاس فنی

لے ایک بیٹری میں عموماً ۱۲ ہلکی توپیں ہوتی ہیں۔

اور کومیلوالے دو بریگیڈ آگئے۔

جہاں تک ۴۴ عبوری بریگیڈ میڈ کوارٹروں کا تعلق ہے، ان کا ذکر گلے ابواب میں آئے گا۔ جنرل نیازی کو اپنی ان عبوری تخلیقات پر بڑا فخر تھا، وہ اکثر اپنا نچلا ہونٹ چباتے ہوئے دعوے کرتے کہ "جب دشمن کو ان میڈ کوارٹروں کا پتہ چلے گا، تو وہ بوکھلا اٹھے گا۔" کہ راتوں رات اتنی زیادہ فوج کہاں سے آگئی، یقیناً اس سے اس کے حوصلے پست ہو جائیں گے اور وہ حملے کا ارادہ ترک کر دے گا۔ پتہ نہیں ان عربوں سے جنرل نیازی دشمن کو دھوکا دے رہے تھے یا اپنے آپ کو، کیونکہ وطن کے دفاع کے لیے جو نفری پہلے موجود تھی، اب بھی وہی رہی۔ میڈ کوارٹربنانے سے اس کی کارکردگی میں کوئی حیرت انگیز تبدیلی نہ آئی۔ ڈویژن میڈ کوارٹروں کو دیکھنا اگر مشرقی پاکستان میں چڑیاں اور کوڑے بھی معمول سے زیادہ نظر آتے، تو اس کی اطلاع ملتی باہمی اور بھارتی فوج کو بل جاتی تھی۔

مزید نفری حاصل کرنے کے لیے جنرل نیازی نے نومبر کے وسط میں میجر جنرل جمشید اور اپنے چیف آف سٹاف بریگیڈیر باقر صدیقی کو راولپنڈی بھیجا۔ اس دورانیہ میں نے جی ایچ کیو کو بتایا کہ ساری سرحدوں پر دشمن کا دباؤ بہت بڑھ گیا ہے، کئی سرحدی علاقے دشمن کے قبضے میں جا چکے ہیں، موجودہ وسائل نا کافی ثابت ہو رہے ہیں، اس لیے مزید دو ڈویژن فوج مشرقی پاکستان بھیجی جائے۔ جی ایچ کیو کے لیے سوچنے کا مقام یہ تھا کہ ان دو ڈویژنوں سے مشرقی پاکستان کی دفاعی صلاحیت میں کتنا اضافہ اور مغربی پاکستان کی جنگی قوت میں کتنی کمی واقع ہوگی۔ اس نے فیصلہ کیا کہ دو ڈویژن بھیجنے کے بجائے آٹھ پلٹنیں ڈھاکہ بھیج دی جائیں۔ ان میں سے پانچ پلٹنیں نومبر کے آخری عشرے میں ڈھاکہ پہنچ گئیں اور ان کے فوراً چھتے بخرے کر کے مختلف کمانڈروں میں تقسیم کر دیے گئے۔ ان پلٹنوں کی نہ صرف وحدت اور لگائٹ ٹوٹ گئی، بلکہ ان کی جنگی صلاحیت بھی متاثر ہوئی۔ ایک کمپنی کہیں دوسری کہیں اور بٹالین میڈ کوارٹروں کہیں باقی تین پلٹنیں ابھی باقی تھیں کہ ۱۲ دسمبر کو جنگ چھڑ گئی اور بین الصوبائی رابطہ منقطع ہو گیا۔

۹ نومبر کو عید الفطر تھی، عید کا چاند نظر آنے کے بعد راولپنڈی سے پیغام آیا کہ انٹیلی جنس کی تازہ اطلاع کے مطابق عید کے روز حملے کا خطرہ ہے۔ مزید انکشاف کیا گیا کہ اس حملے کا زور کومیلوالی جانب ہوگا اور ذیلی اقدام جیسور سیکٹر میں روپڑ پر ہوگا۔ جی ایچ کیو نے ایسٹرن کمانڈ کو مشورہ دیا کہ وہ تازہ ترین اطلاعات کے مطابق اپنے دفاعی انتظامات میں ضروری ردوبدل کرے۔ جنرل نیازی نے اس مشورے پر کوئی عمل نہ کیا، حالانکہ اس کی ساری نفری ملتی باہمی اور شہر سپروں کا مقابلہ کرنے کے لیے جگہ جگہ بکھری ہوئی تھی اور باقاعدہ جنگ کے لیے ان کی ترتیب نو ضروری تھی؛ البتہ نئی اطلاع کی روشنی میں جنرل نیازی نے اپنی ساری دفاعی پوزیشن کا جائزہ لیا، تو اندازہ ہوا کہ مشرقی سرحد پر کومیلوالی اور فیٹی کے درمیان ہماری حالت نرم ہے۔ اگر حملہ مشرق ہی سے آ رہا ہے، تو غالباً اس کا رخ ہی نرم ہی ہوگا۔ یہی وہ خطرہ تھا جس کے پیش نظر جنرل نیازی نے ڈھاکہ میں مقیم ۵۲ بریگیڈ فوراً فیٹی روانہ کر دیا گیا۔ ۲۰ نومبر کو جنرل رحیم بھی چند سٹاف آفیسر اور بہت سے جنگی لقمے لے کر چاند پور پہنچ گئے۔ جنرل رحیم اس علاقے کے دفاع کے بارے میں خاصے پُر امید تھے، کیونکہ ان کا خیال تھا کہ ایک بریگیڈ کومیلوالی میں ہے اور دوسرا فیٹی میں۔ دونوں کے درمیان اگر دشمن نے سر دیا، تو اُسے دبا کر کچل دیا جائے گا۔ اطلاعاً جیسور سیکٹر کے انچارج میجر جنرل انصاری کو بھی متوقع خطرے سے آگاہ کر دیا گیا۔

خوش قسمتی سے دشمن نے عید کے دن بھر پور حملہ نہ کیا؛ البتہ بعض سرحدی علاقوں پر پہلے کی نسبت دباؤ بڑھ گیا۔ اس دباؤ کو

بھر پور حملے کا نام دینا اور اسے کامیابی سے روکنے کو ایک کارنامہ قرار دینا حقائق کے بالکل برعکس ہے حقیقت یہ ہے کہ اس روز دشمن اپنی عسکری قوت کو حرکت میں نہیں لایا تھا۔ ڈھاکہ شہر پر ایک بھی ہوائی حملہ نہ ہوا، کہیں بھی بھارتی طیاروں کی گڑگڑاہٹ سنائی نہ دی، بلکہ سائے صوبے میں بسیں ریل گاڑیاں، کشتیاں اور موٹر لائینیں حسب معمول چلتی رہیں اور تو اور خود جنرل نیازی روزانہ کے معمول کے مطابق صبح سویرے سہلی کا پیر پور روانہ ہوتے اور دن بھر چلن مکے، کھا کر شام کو بحیر و عافیت کسی خاتون صحافی کو "خصوصی انٹرویو" دینے کے لیے ڈھاکہ لوٹ آتے، حالانکہ جب ۱۳ دسمبر کو بھر پور جنگ شروع ہوئی تو چوتھے دن ہی جنرل نیازی ہلک ہلک کر رونے لگے جس کا تفصیلاً ذکر اگلے صفحات میں آئے گا۔

اسی دنوں (اواخر نومبر) کا ذکر ہے کہ جنرل نیازی نے اخبار نویسوں کو اپنی دفاعی جنگ کا فلسفہ بیان کرتے ہوئے فرمایا تھا کہ "میرے پاس ہی کھلے ہاتھ کی انگلیوں کی طرح سرحدوں تک پھیلے ہوئے ہیں، وہ آہستہ آہستہ سکڑ کر ایک ٹکے کی شکل اختیار کر لیں گے اور پھر دشمن کا جبر اتور ڈیں گے" ساتھ ہی انہوں نے اپنے ماتحت کمانڈروں کو حکم دے دیا کہ جب تک سرحدی چوکی پر متعین نفری میں تین چوتھائی شہید یا زخمی نہیں ہو جاتے، کوئی فرد پیچھے نہ ہٹے۔ مجھے یہ آرڈر عجیب لگا، کیونکہ جس ہاتھ کی تین چوتھائی انگلیاں لوٹ جائیں، اس ہاتھ سے نکال کیے بن سکتا تھا۔ میرا تو ایک ناخن بھی زخمی ہو، تو پوری طرح ٹھٹھی بند نہیں ہوتی۔ میرا خیال خام سہی، مگر اہل نظر بھی کہتے ہیں کہ جنرل نیازی نے اپنی "دفاعی صلاحیتوں پر ضرورت سے زیادہ اعتماد کیا۔" ان کی صلاحیتوں سے قطع نظر امر واقعہ یہ ہے کہ وہ یہ ہرگز تسلیم کرنے کو تیار نہ تھے کہ وہ اپنی فوج کو مسلح کے دانوں کی طرح سرحد کے ساتھ ساتھ بکھیر کر اپنی شکست کی راہ ہموار کر رہے ہیں۔

یوم الحساب

۳ دسمبر بڑا تاریخی دن تھا۔ ملک کے لیے بھی اور جنرل نیازی کے لیے بھی۔ ملک اس روز بھارت کی دوسری بھر پور جارحیت کا شکار ہوا اور جنرل نیازی اس دن آخری مرتبہ ڈھاکہ سے باہر نکلے۔ وہ مین سنگھ تشریف لے گئے تھے۔ شام کو واپس آئے تو میں اپنے دفتر میں بیٹھ کر اخبارات کے لیے دن بھر کی روداد لکھنے لگا۔ پانچ بج کر دس منٹ پر بریگیڈیئر باقر صدیقی کا فون آیا۔ وہ خاصے جھجھلائے ہوئے تھے۔ انہوں نے چھوٹے ہی کہا: تم کیسے پریس آفیسر ہو؟ ریڈیو پاکستان نے جنگ چھڑنے کی خبر نشر کر دی ہے اور تم نے مجھے بتایا ہی نہیں؟ میں نے لجاجت سے کہا: میں سمجھ رہا تھا جنگ کی خبر سب سے پہلے آپ بتائیں گے۔

”چھوڑو باتیں نہ بناؤ، فوراً نیک ہیڈ کوارٹر پہنچو۔“

نیک ہیڈ کوارٹر ایک چھتار درخت تلے زمین کھود کر بنایا گیا تھا۔ اس میں تین چار میٹر گہرے چھوٹے چھوٹے کمرے تھے جن کی چھت پر گھاس بچوس ڈال کر اسے ہوا بازوں سے چھپانے کی کوشش کی گئی تھی۔ میں کوئی چھ زینے نیچے اتر کر ایک تنگ کیلبری میں داخل ہوا اور دونوں جانب مین مین کمرے چھوڑ کر سیدھا آپریشن روم میں پہنچ گیا۔ یہ کمرہ نسبتاً بڑا تھا۔ اس کی دیواروں پر مختلف سیکٹروں کے فوجی نقشے لگے تھے۔ ایک طرف دو میزوں پر کوئی نصف درجن ٹیلیفون اور وائرلس سیٹ رکھے تھے۔ ایک انصر صرف ٹیلیفون سننے پر مامور تھا۔ یہ کمرہ مشرقی پاکستان میں تمام فوجی کارروائیوں کا محور تھا۔ احکام یہاں سے جاتے تھے اور مختلف حصوں سے صورت حال کی خبریں بھی یہیں موصول ہوتی تھیں۔

جس وقت میں آپریشن روم میں داخل ہوا، جنرل نیازی چیدہ چیدہ افسروں سے خطاب کر رہے تھے۔ انہوں نے ٹھنڈی پتلون اور سلیٹی رنگ کی بشرٹ پہنی ہوئی تھی۔ گلے میں ریشمی رومال (اسکارف) تھا۔ ان کی پشت دیوار کی طرف تھی۔ تیس بیٹیس حاضرین میں میجر جنرل راؤ فرمان علی اور ریئر ایڈمرل محمد شریف بھی شامل تھے۔ جنرل یاری گفتگو کرنے کے ساتھ ساتھ محدودی جگہ میں ٹہلتے بھی جلتے تھے۔ ان کے چہرے پر پریشانی یا بھران کے کوئی آثار نہ تھے؛ البتہ ماحول اتنا گھمبیر تھا کہ ان کے منہ سے جو لفظ نکلتا، سیدھا دل میں اتر جاتا تھا۔ ان کے خطاب کا ٹب لباب یہ تھا کہ اب تمام بندشیں ٹوٹ چکی ہیں۔ اب

۱۔ نیک ہیڈ کوارٹر انگریزی الفاظ TACTICAL HEADQUARTERS سے لیا گیا ہے جنگ کے دوران فوجی کمانڈر اپنے مستقل ہیڈ کوارٹر سے نیک ہیڈ کوارٹر منتقل ہوجاتے ہیں۔ جنرل نیازی کا نیک ہیڈ کوارٹر چھاؤنی کے اندر ہی اپنے مستقل ہیڈ کوارٹر سے ایک آدھ کلومیٹر کے فاصلے پر تھا۔

ہیں بین الاقوامی سرحدیں پار کرنے کی آزادی ہے۔ اب بادل چھٹ چکے ہیں۔

سامعین کے چہروں سے یوں معلوم ہوتا تھا کہ ان کے دل و دماغ پر سے کوئی بھاری بوجھ اتر گیا ہے۔ وہ گزشتہ آٹھ ماہ سے شریپندوں کے خلاف صف آرا تھے، مگر اس پابندی کے ساتھ کہ ان کے تعاقب میں بین الاقوامی سرحد پر آنے پانے اب بین الاقوامی سرحد کا تقدس پامال ہو چکا تھا۔ ان کے خیال میں اب دونوں پارٹیوں کو آزادی ہوگی اور فیصلہ ہو کر رہے گا طمانیت کی وجہ یہ بھی تھی کہ اب تک مغربی پاکستان کی سرحدیں خاموش تھیں، صرف مشرقی پاکستان کی پٹائی ہو رہی تھی۔ خیال تھا کہ اب جہاں تنومند بازو بھی اپنا زور دکھائے گا اور ہم پر ہونے والے ظلم و استبداد کا بدلہ لے گا۔ اب بھارت کو پتہ چلے گا کہ مشرقی پاکستان کا دفاع مغربی پاکستان سے ہوگا کے کیا معنی ہیں۔

تقریر کے بعد سب لوگ چلے گئے، تو جنرل نیازی نے مجھے اپنے کمرے میں بلایا اور اعلان جنگ کے موقع پر ان کی طرف سے آرڈر آف دی ڈے "یا فرمان امروز" تیار کرنے کا حکم دیا۔ انہوں نے تاکید کی کہ ان کے زیرِ کمان افسروں اور جوانوں پر دو باتیں واضح کی جائیں۔ ایک یہ کہ اب دشمن جہاں بھی ملے جدھر بھی ملے، سرحدوں کا خیال کیے بغیر اسے تھس تھس کر دیں اور دوسری بات یہ کہ آخری دم تک دشمن کا ڈٹ کر مقابلہ کریں، کیونکہ فرار یا جان بچا کر بھاگنے کی تمام راہیں مسدود ہیں۔ میں چلنے لگا تو انہوں نے فرار والا جملہ کھوا دیا۔

میں اسی شام فرمان امروز کا مسودہ تیار کر کے ان کے پاس لے گیا۔ انہوں نے مسودے سمیت مجھے ریگڈیٹیر باقر صدیقی کے حوالے کر دیا، مگر وہ اپنی مصروفیت کی وجہ سے اس کی لوک پٹک نہ سنوا سکے۔ بات اگلے روز پر جا پڑی۔ مسودہ منظور ہوا اس کی نقلیں نہیں اور تمام محاذوں پر افسروں اور جوانوں کو بھیجنے کا اہتمام ہونے لگا، مگر اب محاذ تک پہنچنے کے تمام راستے مسدود ہو چکے تھے۔ واحد ذریعہ پہلی کاپی تھی، لیکن ان کی تعداد کم اور ان کے کام زیادہ تھے؛ چنانچہ یہ پلندہ ڈھا کہ ہی میں پڑا اور بالآخر وہیں نذر آتش کرنا پڑا۔

مغربی پاکستان کے محاذ پر جنگ کی ابتدا پاک فضائیہ کے حملوں سے ہو چکی تھی جس کا جواز یہ پیش کیا گیا کہ پہل بھارت نے کی ہے اور پاکستانی جیٹ طیارے جو اب کارروائی کے لیے سات بھارتی اڈوں پر تباہی پھرا کر آئے ہیں، ان کے بعد ہماری بڑی فوج بھی پیش قدمی کر چکی ہے۔ یہ ساری باتیں ہمیں ریڈیو پاکستان کے ذریعے پہنچیں۔ جہاں تک مشرقی پاکستان کا تعلق ہے بھرپور جنگ کا پہلی بار احساس ۳ اور ۴ دسمبر کی درمیانی رات دوج کر چالیس منٹ پر ہوا جب بھارتی طیاروں نے ڈھا کہ ایئر پورٹ پر ہلہ بول دیا۔ اس وقت اڈے سے تھوڑی دور اپنے مکان کی بالائی منزل میں سو رہا تھا۔ بھارتی طیاروں اور ہماری طیارہ شکن توپوں کی گمن گرج سے میری آنکھ کھل گئی۔ میں پلنگ سے اٹھ کر کمر کی میں کھڑا ہو گیا جہاں سے ایئر پورٹ کا منظر دیکھا جاسکتا تھا۔

رات چاندنی کو معصوم بچے کی طرح گود میں لیے انسان کی تباہ کاریوں کا مشاہدہ کر رہی تھی اور اوپر جھل جھل کرتے ستارے خاموش تماشائی بنے بیٹھے تھے۔ زمین اور آسمان کے درمیان گولیوں اور گولوں کی بھرا تھی۔ ٹریس گولیوں کی روشنی تیزی سے آنکھوں کے سامنے سے گزرتی اور دھماکوں کی آواز بار بار کانوں سے نکرتی۔ تیز رفتار بھارتی طیارے بے ضمیر رُوح کی طرح بے قرار چہرتے اور ہماری طیارہ شکن توپیں نفرت کے شعلے ان پر پھینکنے کی کوشش کرتیں۔ یہ منظر پو پھٹے تک جاری رہا۔ ادھر سورج نکلا اور ادھر



بنگامہڑک گیا جسے جواز شرفا کے جاگنے سے پہلے پہلے اپنا کام مکمل کر کے غائب ہو جاتے ہیں۔

حملہ ختم ہونے کے بعد میں نے حجامت بتائی، استری شدہ وردی پنی اور ٹیک ہیڈ کو اڑھل دیا۔ وہاں کوئی خاص سرگرمی نظر نہ آئی سوائے صبح کی کانفرنس کے جس کا ذکر کرنے سے پہلے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ایک مختصر نظر پاک تجزیہ اور فضائیہ کی کارکردگی پر بھی ڈالیں تاکہ زمینی جنگ کا جائزہ لیتے وقت یہ اندازہ رہے کہ ہماری نیوی اور ایئر فورس کو کیا ہوا؟

بنگ کی پہلی زد پاک فضائیہ ریڑھی۔ بھارت کے جدید طیاروں کا مقابلہ ہمارے پُرانے سید طیاروں اور صاحبِ کمال ہوا بازوں نے خوب ڈٹ کر کیا۔ جدید اور قدیم کے علاوہ تعداد کے لحاظ سے مقابلہ ایک اور دس کا تھا ہمارے پاس طیاروں کا ایک اسکواڈرن اور چودہ دن کا گولہ بارود تھا۔ بھارت کے پاس کم از کم دس اسکواڈرن اور ان گنت اسلحہ تھا ہمارے جہازوں نے پہلے دن ۳۲ فضائی معرکوں میں حصہ لیا اور مجموعی طور پر تیس ہزار راونڈ چلائے یہ فضائیہ کی تاریخ میں ایک دن میں ایئرویشن کا سب سے زیادہ خرچ تھا۔ فضائیہ کے علاوہ دیگر ہتھیاروں نے بھی ایک دن میں ستر ہزار گولیاں اور گولے پھونک دیے۔ اس سے حکام بالا کو تشویش ہوئی کہ اگر ایئرویشن کے یومیہ خرچ کی یہ شرح رہی تو تمام ذخیرے سات سے دس دن میں ختم ہو جائیں گے۔ ان دنوں اندازہ یہی تھا کہ ہمیں ایک طویل جنگ لڑنا پڑے گی جس کے لیے ایئرویشن کے خرچ میں کفایت شعاری برتنا ضروری ہوگی؛ چنانچہ ایئرویشن کے اسراف پر پابندی لگادی گئی اور صرف ضرورت کے مطابق طیاروں اور توپوں کو فائر کرنے کا حکم دیا گیا۔ اسے قدرت کی تم ظریفی کہیے کہ اس طرح بجائے ہوئے ایئرویشن کے ذخائر کو چند روز بعد آگ لگا کر ضائع کرنا پڑا۔ پہلے دن کے فضائی حملے میں بھارتی فضائیہ کے دس بارہ طیارے تباہ ہوئے، مگر وہ ڈھاکہ ایئر پورٹ کو کوئی نقصان نہ پہنچا سکے۔ صرف چار بم ایئر پورٹ کے نواح میں گرے جن سے ہماری جنگی صلاحیت پر کوئی اثر نہ پڑا۔ اس براہ راست بمباری کو بے سود سمجھ کر ہندوستان کو اپنی فضائی اسٹریٹیجی بدلنا پڑی اور اس نے ہمارے مواصلاتی نظام کو درہم برہم کرنے کی کوشش شروع کر دی۔ اس مقصد کے لیے وہ بم ۲۱ کی جگہ ایس یو ۷۱ (SU-71) اور ہنٹر (HUNTER) طیارے فضائی لے آیا۔ یہ طیارے سرحدوں پر اپنی تری فوج کی مدد کے علاوہ گھاٹوں، پتنوں اور مسافر بردار کشتیوں پر حملے کرنے لگے۔ اس لائحہ عمل سے ڈھاکہ ایئر پورٹ پر دباؤ کچھ کم ہوا جس کی وجہ سے ۵ دسمبر کو ہماری فضائیہ کو کوئی اور چند دوسرے علاقوں میں اپنی تری فوج کی اعانت کا موقع ملا۔ بھارتی فضائیہ نے ہندوستان کے دس بمباری کے لیے اپنی تری فوج کی اعانت کا موقع ملا۔ بھارتی فضائیہ نے ہندوستان کے دس بمباری کے لیے اپنی تری فوج کی اعانت کا موقع ملا۔ بھارتی فضائیہ نے ہندوستان کے دس بمباری کے لیے اپنی تری فوج کی اعانت کا موقع ملا۔

پانچ دسمبر کا سارا دن اور پورا رات ہماری توپوں اور طیاروں نے دشمن کے جہازوں کو ایئر پورٹ پر پھینکنے نہ دیا، لیکن ۶ دسمبر کی صبح ہمارے سید ایک سرحدی محاذ سے واپس آئے اور ایئر پورٹ پر فضائی چھاتہ ٹانے (COMBAT AIR PATROLLING) کے لیے اڑنے والے تھے کہ ہندوستان کے دس بمباری کے اڈائے ہماری طیارہ شکن توپوں نے انہیں لٹکارا، مگر بے سود۔ وہ زودی ساخت کے پانچ پانچ سو کلوگرام وزنی چھ بم گرانے میں کامیاب ہو گئے جن میں سے دو بم رن وے (RUNWAY) پر پڑے۔ ان بموں کی ساخت کچھ ایسی تھی کہ وہ پہلے سیدھے زمین میں دھنس جاتے اور پھر چند ثانیے بعد پھٹتے جس سے متاثرہ زمین میں بہت بڑا شگاف پڑ جاتا۔ یہ دونوں بم ایک دوسرے سے کوئی بارہ سو میٹر کے فاصلے

پر گری اور دونوں جگہوں پر وسیع اور گہرے شگاف چھوڑ گئے۔ ہر گڑھا تقریباً دس میٹر گہرا اور بیس میٹر چوڑا تھا۔ اس نقصان کی وجہ سے رن وے قابل استعمال نہ رہا۔ مرمت کا کام بڑی تندہی سے شروع کیا گیا۔ فضائیہ اور فوج کے ایم۔ ای۔ ایس کے محکمے اس کام میں جت گئے۔ مقامی انجینئرنگ سٹالین کے جوانوں اور چند بہاری مزدوروں نے بھی ہاتھ بٹایا۔ اوپر سے بھارتی فضائیہ پے پے حملے کرتی رہی اور ادھر یہ لوگ درمیانی وقفوں میں مصروف کار رہے۔ عین میدان جنگ میں کام کرتے کرتے گیارہ آدمی ہلاک اور بیس زخمی ہو گئے۔

اگلی رات ۱۶ اور ۱۷ دسمبر کی درمیانی شب، گڑھوں کو بھرنے کی جان توڑ کوشش کی گئی۔ ماہرین کا کہنا تھا کہ چھ سے آٹھ گھنٹے کام کرنے کی ہمت مل جائے تو رن وے قابل استعمال ہو جائے گا، مگر بھارتی طیاروں کے تابڑ توڑ حملوں کی مدافعت کا کام صرف طیارہ شکن توپوں کے سپرد تھا، کیونکہ ہمارے جہاز پرواز سے عاری تھے۔ دشمن کی طیارہ کامیاب رہی اور رن وے کے اہم مقامات پر تین اور شگاف پڑ گئے جنہیں پُر کرنے کے لیے مزید ۳۶ گھنٹے درکار تھے۔ اتنی طویل ہمت کہاں ملتی؟ کوشش جاری رہی، مگر ہم رن وے مرمت کر کے دوبارہ اپنی فضائیہ کو اڑنے کا موقع فراہم نہ کر سکے۔ گویا ۶ دسمبر کی صبح سے ہماری فضائیہ پیکار ہو کر رہ گئی۔ یہ مقصد حاصل کرنے کے لیے دشمن کے کم از کم ۲۲ اور زیادہ سے زیادہ ۲۴ طیارے تباہ ہوئے جن میں سے سات ہماری فضائیہ نے مار گرائے اور باقی ہماری طیارہ شکن توپوں کا شکار ہوئے۔

ڈھاکہ ایئر پورٹ سے کوئی ۵ کلومیٹر شمال میں کرمیولہ ایئر پورٹ زیر تعمیر تھا جس کا مرکزی رن وے مکمل ہو چکا تھا، مگر دیگر سہولتیں مفقود تھیں۔

پرانے اور نئے ہوائی اڈوں کے ناکارہ ہوجانے کے بعد یہ تجویز بھی زیر غور آئی کہ ڈھاکہ ایئر پورٹ کے قریب ایوب نگر (دارالحکومت ثانی) کی وسیع سڑکوں کو رن وے کے طور پر استعمال کیا جائے۔ اگر وہاں سے ہمارے سید طیارے پرواز کر سکیں، مگر اتر نہ سکیں، تو کم از کم دشمن کو نقصان پہنچا کر پیراٹوٹ کے ذریعے چھلانگ لگادیں۔ اس تجویز کے حامیوں کا کہنا تھا کہ اپنے سید طیارے زمین پر کھڑے کھڑے دشمن کے حوالے کرنے کے بجائے بہتر ہے کہ انہیں دشمن پر تباہی برسانے کے بعد ضائع کر دیا جائے۔ جب یہ تجویز پاکستان ایئر فورس ڈھاکہ کے بیس کمانڈر کو پیش کی گئی، تو انہوں نے فنی وجوہات کی بنا پر اسے ناجائز قرار دے دیا۔ اس کے ساتھ ہی مشرقی پاکستان میں ہماری فضائیہ کا کردار ختم ہو گیا۔

اب ڈھاکہ میں فضائیہ کے لڑاکا پائلٹوں کا کوئی مصرف نہیں رہ گیا تھا، چنانچہ انہیں ایک دوست ملک کے توسط سے مغربی پاکستان بھجوا دیا گیا جہاں ہماری فضائیہ ابھی سرگرم تھی۔ دس پائلٹ ۸ دسمبر کو اور چار ۹ دسمبر کو ڈھاکہ سے روانہ ہوئے۔ پیچھے بےیلی کاپٹروں کے پائلٹ اور ان کے انٹرکمرہ گئے۔ ان کے علاوہ آرمی ایوی ایشن کے پائلٹ اور بےیلی کاپٹر بھی ڈھاکہ ہی میں رہے۔

پی۔ اے۔ ایف کو اس مختصر رول پر کوئی افسوس نہ تھا، کیونکہ امن کے زمانے میں یہ بات تسلیم کی جا چکی تھی کہ موجودہ وسائل کے مطابق ہماری فضائیہ جنگ کے زمانے میں چوبیس گھنٹے سے زیادہ فعال نہ رہ سکے گی۔ یہاں وہ ۶۴ گھنٹے جی لیے۔ بیان کی سخت جانی، حوصلے اور فنی مہارت کا کمال تھا۔

پاک فضائیہ کی عدم موجودگی میں ڈھاکہ کے فضائی دفاع کی ساری ذمہ داری ہماری طیارہ شکن توپوں پر ان پڑی جو مشرقی



پاکستان میں سب سے پہلے گرجیں اور سب سے آخر میں خاموش ہوئیں۔ میں نے کچھ وقت ان بہادر توپچیوں کے ساتھ بھی گزارا۔ مجھے یاد ہے دھوپ ٹوب چلچلا رہی تھی۔ آسمان بالکل صاف تھا۔ ہمارے توپچی بھوری ٹوپیاں پہنے کھلے میدان میں دشمن کے جہازوں کے منتظر تھے جو نہی بھارتی طیارے نمودار ہوتے، یہ فوراً توپ کا دہانہ ان کی سیدھ میں کرتے، جلدی جلدی نشانہ باندھتے اور اللہ اکبر کے نعروں کے ساتھ گولوں کی بوچھاڑ کر دیتے۔ ادھر آگ کی حدت، ادھر ایمان کی حرارت اور پھر گرم گرم میدان جنگ، اُروح کو گرما دینے والا عجب منظر تھا۔ میں نے جنگ کے انتہائی نازک وقت میں جو لمحے ان توپچیوں کے ساتھ گزارے، میری زندگی کا قیمتی سرمایہ ہیں۔

مشرقی پاکستان میں ہماری بحریہ کی حالت فضائیہ سے چنداں بہتر نہ تھی۔ اس کی کل طاقت کو میلا، راجشاہی، جیسور اور سلٹ نامی چار کشتیوں پر مشتمل تھی۔ ریئر ایڈمرل محمد شریف ان کے سربراہ اعلیٰ تھے۔ یہ کشتیاں درحقیقت بحری راستوں سے اسمگلنگ کو روکنے کے لیے خریدی گئی تھیں۔ ان پر ۲۰/۶۰ ملی میٹر کی ہلکی توپیں نصب تھیں اور ہر کشتی کے عملے کی تعداد ۲۹ تھی۔ ان کی زیادہ سے زیادہ رفتار ۲۰ ناٹ (بحری میل) تھی۔

ریئر ایڈمرل شریف نے جنگ سے پہلے اپنے "وسائل" میں اضافہ کے لیے مقامی طور پر مزید، کشتیاں حاصل کر لی تھیں جن میں سے بعض پر ۱۲ ملی میٹر بھاری مشین گن اور بعض پر ۵۰ ایم ایم یا ۳۰ ایم ایم بروننگ مشین گن لگائی گئی تھیں۔ یہ کشتیاں شہرینوں کے تعاقب یا سرکوبی کرنے کے لیے بہت مفید تھیں مگر ان کا بھارتی بحری بیڑے سے کوئی مقابلہ نہ تھا جس میں ایئر کرافٹ کیئر (AIR CRAFT CARRIER) کے علاوہ کئی ڈسٹریویر (DESTROYER) اور فریگیٹ (FRIGATE) شامل تھے۔

پاک بحریہ کو ایک ناممکن کام کا سامنا تھا۔ وسائل محدود اور فرائض غیر محدود۔ صوبے کے اندر ہزاروں میل لمبے دریاؤں اور نالوں کو شہرینوں سے پاک رکھنے کے علاوہ اس کے ذمے ہمارے چھ سو کلومیٹر طویل ساحل سمندر کا دفاع بھی تھا جو برما کی سرحد پر واقع تیمناؤں (TEKNAU) سے لے کر مغربی بنگال کے پاس پتسار (PASSAR) تک پھیلا ہوا تھا۔ اس کے علاوہ کراچی اور چٹانگ کے درمیان ہزاروں میل آبی گزرگاہیں تھیں جن پر تجارت کو بالادستی حاصل تھی۔

جنرل نیازی کی طرح بلند ہانگ دعوے کے بجائے ریئر ایڈمرل شریف نے حقیقت پسندی سے کام لیا اور بڑی اور بھری سطح پر اپنے اعلیٰ افسروں کو جنگ سے بہت پہلے بتا دیا تھا کہ ان حالات میں نیوی سے کسی قسم کے موثر دفاع کی توقع نہ رکھنا۔ انہوں نے محدود وسائل کے پیش نظر صرف چٹانگ اور کھلنا کے قریب منگلا کے بحری اڈوں پر توجہ دی اور باقی ساحل سمندر اللہ کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا۔ چٹانگ کے دفاع کے لیے ایک ساحلی دفاعی بیٹری قائم کی گئی جس کے پاس دو توپیں تھیں۔ توپ کا دہانہ صرف ۴ انچ تھا اور اس کی مار بارہ ہزار میٹر تک تھی۔ چٹانگ ایئر پورٹ کی حفاظت کے لیے رضا کاروں کی مدد سے ہنگامی طور پر ایک طیارہ شکن بیٹری کھڑی کی گئی اور چٹانگ کے ساحلی علاقے پر نظر رکھنے کے لیے میرین ٹیلین رکھی گئی۔

منگلا پورٹ کا دفاع ایسٹ پاکستان سول آرمڈ فورسز کی ایک کمپنی کے سپرد تھا۔ بحریہ کی طرف سے وہاں چند کشتیاں (GUNBOAT) رکھی گئی تھیں جن میں سے اکثر ہنگامی طور پر مشین گن فٹ کر کے مسلح کی گئی تھیں۔ اس کے علاوہ وہاں ۲۵ پونڈ وزنی گولے والی دو توپیں تھیں۔ یہ تھی کل پونجی جس سے ہمیں ایک بھر پور جنگ لڑنا تھی۔



۳ دسمبر کو جب اچانک جنگ چھڑ گئی، تو کشتی کشتیاں ادھر ادھر بکھری ہوئی تھیں۔ راجشاہی نامی کشتی چٹاگانگ کے مستقر سے نکل کر سینڈیپ کی آبنا (CHANNEL) میں گھوم رہی تھی۔ سبٹ کسی فنی خرابی کی وجہ سے بے کار کھڑی تھی صرف 'کومیلا' گودی میں چاق و چوبند موجود تھی۔

بحریہ کے ہیڈ کوارٹر (ڈھاکہ) سے یہ حکم پہلے ہی جاری کیا جا چکا تھا کہ جنگ چھڑنے کی صورت میں تمام کشتیاں بندرگاہوں کے محفوظ ٹھکانوں میں سمٹ آئیں۔ ۳ دسمبر کو اعلان جنگ کے بعد کشتیاں تو بندرگاہ میں آگئیں، لیکن ان ۲۳ غیر ملکی جہازوں اور سات کو سٹروں (COASTERS) کا کیا بنے گا جو کھلے سمندر میں لشکر اندازتے۔ انہیں نہ بندرگاہ کے اندر سویا جا سکتا تھا اور نہ وہاں سے غائب کیا جا سکتا تھا۔ ان کو کسی قسم کی ہدایت دینے کے لیے کوئی مواصلاتی رابطہ بھی نہ تھا، کیونکہ وہ اپنے واٹر لیس سیٹ صرف مقررہ وقت پر کھولتے تھے۔ رابطے کی واحد ترکیب یہ تھی کہ کوئی جیالاہنت کرے اور ذاتی طور پر جا کر ان کو تازہ صورت حال سے آگاہ کرے۔ چنانچہ بحریہ کا ایک جوان سال افسر چند جاں نثاروں کو ساتھ لے کر ایک کشتی پر روانہ ہو گیا۔ وہ فر وافر جہاز کے پاس گیا اس کے کمپن کو جنگی صورت حال سے آگاہ کیا اور مشورہ دیا کہ اپنی سلامتی کے لیے اپنے اپنے ملک کے جھنڈے سر بلند کر لیں۔

چٹاگانگ میں جنگ کا دھماکہ ۳ اور ۴ دسمبر کی درمیانی رات کوئی دو بجے سنائی دیا جب دشمن کے جہازوں نے تیل کے ایک ذخیرے کو نذر آتش کر دیا۔ اگلے روز علی البصر ایک ہلکا سا بے ضرر طیارہ آہستہ آہستہ سمندر سے شہر کی طرف بڑھنے لگا۔ چٹاگانگ ایئر پورٹ پر متعین طیارہ ٹیکن بیٹری کے نو آموز رضا کاروں نے سوچا کیا بے جان سی شے پرائیونیشن صنایع کرنا ہے، کوئی جیٹ طیارہ آنے گا، تو مقابلے کا مزہ بھی آئے گا۔ انہیں اپنی غلطی کا احساس اس وقت ہوا جب یہی بے ضرر سا طیارہ ریفاٹری کو بجھک سے اڑا گیا۔ اس کے بعد پانچ کینبرا (CANBERRA) طیاروں کا ایک پرائیوڈار ہوا جس کو متعدد رضا کاروں نے نشانہ بنایا اور ان میں سے دو کو مار گرایا۔

اسی اثناء میں یہ غیر مصدقہ اطلاع ملی کہ گزشتہ رات دشمن "قطبہ" جزیرے پر اتر گیا ہے۔ یہ جزیرہ چٹاگانگ کے قریب ہی تھا اور دشمن کے وہاں اترنے سے چٹاگانگ کو خطرہ لاحق ہو سکتا تھا، چنانچہ چٹاگانگ پورٹ کے انچارج کو ڈور نے سوچا کہ اگر دشمن دروازے پر دستک دے رہا ہے تو کشتی کشتیوں (GUN BOATS) کو بچا بچا کر رکھنے کا کیا فائدہ؟ چنانچہ اس نے 'کومیلا'، 'بورگھاٹ' اور 'راجشاہی' کو اس مشن کے ساتھ روانہ کر دیا کہ وہ صورت حال کا جائزہ لیں اور حسب ضرورت کارروائی کریں۔

جب 'راجشاہی' مقررہ مقام پر پہنچی تو اسے دشمن کے کوئی آثار نظر نہ آئے۔ یہ ابھی وہیں تھی کہ اوپر سے دشمن کے چار ہینڈلر طیارے حملہ آور ہو گئے۔ راجشاہی نے اپنی ۴۰/۶۰ ملی میٹر توپ سے انہیں دور رکھنا چاہا، مگر ناکام رہی۔ اٹنا اس کو چھ ضربیں آئیں جن سے انجن کو آگ لگ گئی اور پانی بھی غیب غیب اندر آنے لگا۔ یوں لگتا تھا کہ آگ اور پانی جو ہمیشہ سے ایک دوسرے کے دشمن چلے

لے گن بوٹ (GUN BOAT) اور پٹرول بوٹ (PATROL BOAT) ایک ہی طرح کی کشتیوں کو کہتے تھے جن کا کام اسمگلنگ کی روک تھام کے لیے گشت کرنا اور وقت ضرورت اسمگلروں پر ناز کرنا تھا۔

آتے ہیں آج ایک سوچی سمجھی سازش کے تحت تعاون پر اتر آئے ہیں تاکہ اس بے چاری کشتی کو تباہ کر دیں۔ راجشاہی کے کیپٹن اور اس کے ساتھیوں نے اسے بچانے کی جان توڑ کوشش کی۔ اس جدوجہد میں کیپٹن سمیت پانچ آدمی زخمی ہو گئے جن میں سے ایک چل بسا، مگر انہوں نے ہمت نہ ہاری اور پانی اور آگ سے برسہا پیکار رہے۔ دشمن کے طیارے گن بوٹ سے شعلے بھڑکتے دیکھ کر واپس چلے گئے۔ بوٹ کے عملے کی کوششیں بالآخر بار آور ثابت ہوئیں اور راجشاہی کو بچالیا گیا۔

'کومیلا' راجشاہی سے تھوڑے ہی فاصلے پر تھی، لیکن یہ بھی اس کی مدد کو نہ پہنچ سکی، کیونکہ خود اس پر دشمن کے نو طیارے ٹوٹ پڑے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا ہر پالٹ نشانہ بازی میں دوسرے سے سبقت لے جانے کی کوشش کر رہا ہے ہر حملے کے بعد کشتی یوں ڈول جاتی تھی جیسے کمزور حریف طاقتور باکسر کا گھونسا کھا کر لڑکھڑا جاتا ہے۔ 'کومیلا' کے عملے کے کئی ارکان بھی زخمی ہو چکے تھے، مگر انہوں نے اسے بچانے کی کوشش جاری رکھی۔ اچانک ہوائی جہاز کا ایک نشانہ سیدھا تیل کی ٹینگی میں آگاہی سے اس میں آگ لگ گئی۔ تھوڑی دیر میں یہ آگ پھیل کر اس حصے میں پہنچنے والی تھی جہاں بارود کے چھ سو گولے رکھے تھے؛ چنانچہ کیپٹن نے حکم دیا کہ 'کومیلا' کو چھوڑ کر اپنی اپنی جان بچائی جائے؛ لہذا دو افسروں اور ۲۱ ارکان پر مشتمل عملہ حفاظتی بیٹوں سمیت سمندر میں کود گیا۔ ادھر کودنے سے پانی اچھلا اور ادھر بارود کو آگ لگ جانے سے دھماکے دار شعلہ بلند ہوا، 'کومیلا' کے پرچے اڑ گئے۔

تیسری کشتی 'بلور گھاٹ' جو ہوائی حملوں سے محفوظ رہی، 'کومیلا' کے عملے کو اٹھانے اور چٹا گانگ پورٹ پہنچانے میں کامیاب ہو گئی۔

کھٹان کے قریب منگلا پورٹ نسبتاً چھوٹی اور غیر اہم تھی۔ وہاں دفاعی جمعیت بھی کم تھی۔ بحری طاقت میں سے صرف جیو گن بوٹ وہاں تھی۔ باقی پانچ کشتیاں وہ تھیں جو ہنگامی طور پر 'دو سال بڑھانے' کی خاطر تیار کی گئی تھیں۔ ان میں سے دو توجنگ کے پہلے روز ہی تباہ ہو گئیں اور باقی تین قریب ترین جنگل میں پناہ لینے پر مجبور ہو گئیں۔

جہاں تک بحری جنگ کا تعلق ہے، پاکستان بحریہ ۲۴ کھٹوں ہی میں دم توڑ گئی؛ البتہ ساحلوں پر پہرہ دینے دفاعی قلعوں کا دفاع کرنے اور صوبے کے اندر فوجی جوائنوں اور ساز و سامان کو ایک مقام سے دوسرے مقام تک لے جانے میں یا آخری وقت تک فعال رہی۔

جب فضائیہ اور بحریہ جنگ کے ابتدائی ایام ہی میں اپنا اپنا کردار ادا کر کے میدان جنگ سے غائب ہو گئیں تو ساری فوجی ضرورتیں اور ان کے زیرِ کمان پینتالیس ہزار ریگولر فوج اور تیس ہزار نیم عسکری نفری پر ان پڑی۔ اب جنگ کا فیصلہ دو ہاتوں پر تھا، فوج کی جسمانی بہادری اور اس کے کمانڈر کی اخلاقی جرات؛ ایسے پہلے جنرل نیازی کی ایک جھلک دیکھتے چلیں؛ جنرل نیازی ہر روز صبح ۸ بجے آپریشن روم میں چیدہ چیدہ افسروں کی کانفرنس بلاتے۔ وہ ہر افسر سے خندہ پیشانی سے پیش آتے اور بول چال اور حرکات و سکنات سے بالکل نارمل لگتے؛ البتہ ایک بات ذرا عجیب سی لگتی کہ وہ مشرقی پاکستان میں جنگ پر توجہ دینے کے بجائے شروع شروع میں مغربی پاکستان میں زیادہ دل چسپی لیتے رہے۔ انہوں نے آپریشن روم کی مغربی دیوار پر مغربی پاکستان محاذ کا بہت بڑا نقشہ لگا رکھا تھا جس پر وہاں کی سبھی صورت حال دکھانے کے لیے چھوٹے چھوٹے پین لگے تھے۔ دن میں دو مرتبہ (اور بعد میں ایک مرتبہ) جی ایچ کیو سے مغربی محاذ کی صورت حال کا پانچوڑ مار (سگنل) کے ذریعے

ڈھاکہ پہنچتا تھا۔ ایک افسر کی ڈیوٹی یہ تھی کہ وہ اس سگنل میں ورج اطلاع کو فحشے پر سرخ اور سبز بن لگا کر واضح کر دیا کہ سرخ
بن دشمن کی پوزیشن ظاہر کرتے تھے اور سبز ہماری —

میں جنرل نیازی کی اس میٹنگ میں روزانہ حاضری دیتا۔ حالانکہ میرے ہونے یا نہ ہونے سے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا میں
نے دیکھا کہ مغربی پاکستان کی مشرقی سرحد سے چند سنٹی میٹر دور (بھارت کی جانب) تین چار سبز بن لگے تھے۔ بڑی خوشی ہوئی کہ
ہمارے قدم دشمن کی سرزمین پر ہیں۔

۴ دسمبر کو دوپہر کے قریب میں "اپریشن روم" میں داخل ہوا تو سارا ماحول خوشی سے جھکتا ہوا پایا۔ حیران تھا کہ چند گھنٹوں
میں کونسا میدان مار لیا ہے! پتہ چلا: امرتسر فتح ہو چکا ہے اور فیروز پور فتح ہونے والا ہے۔ ہماری فوجیں اس کے قریب جوار
میں پہنچ چکی ہیں۔

میں نے پوچھا: اگر یہ خبر درست ہے تو جی ایچ کیو سے آنے والے سگنل میں اس کا ذکر کیوں نہیں؟
ایک صاحب بولے: اس کی وجہ یہ ہے کہ جب تک وہاں ہماری پوزیشن مستحکم نہیں ہو جاتی، جی ایچ کیو اس کا
دعویٰ نہیں کرنا چاہتا۔

یہ باتیں ہو رہی تھیں کہ میں جنرل نیازی کے کمرے میں داخل ہوا۔ وہ مجھے دیکھتے ہی کرسی سے اٹھ کر پہلوانوں کی طرح ڈنٹر
پیلنے لگے۔ انہوں نے طعنے کے انداز میں کہا: دیکھا تم نے؟ جب میں کہا کرتا تھا کہ اگر جنگ چھڑی تو میدان جنگ بھارت
کی زمین بنے گی، تو تم مجھے غیر ضروری خوش فہمی نہ پیدا کرنے کا مشورہ دیا کرتے تھے، مگر اب دیکھ لو، اگر نہیں نہیں، تو میرا بڑا بھائی
(مغربی پاکستان) تو جنگ کو ہندوستان کے علاقے میں لے گیا ہے۔ اس کے فوراً بعد انہوں نے ٹیلیفون گھما کر گورنر مالک کو بھی
یہ خوشخبری سنائی۔ گورنر نے کہا: جنرل صاحب! چوڑنگا کا کیا حال ہے؟

جنرل نیازی نے حکم دیا کہ امرتسر فتح ہونے کی خبر مشرقی پاکستان کے کونے کونے میں تمام فوجیوں تک پہنچادی جائے، کیونکہ
اس سے ان کے مورال پر خوشگوار اثر پڑے گا۔ ایڈمرل شریف نے کہا: بہتر ہو گا کہ پہلے اس خبر کی تصدیق کرائی جائے۔ میں سب
سے جو نیرتھا مجھے ہی حکم ملا کہ پتہ کر و خبر کہاں سے آئی؟ میں نے ساتھ والے آپریشن روم سے پوچھا۔ جواب ملا پی اے ایف بیس
ڈھاکہ کے آپریشن روم سے اطلاع آئی ہے۔ سنایے وہاں پشاور سے ایئر فورس کے کمانڈر انچیف نے ہاٹ لائن پر اطلاع دی
ہے۔ میں نے ڈھاکہ بیس ٹیلیفون کیا اور کہا: کیا آپ نے امرتسر اور فیروز پور کے متعلق خبر سنی ہے؟

جی ہاں۔

کہاں سے اطلاع آئی؟

ایئرٹن کمانڈ ہیڈ کوارٹر سے۔

جب ڈھاکہ میں اس خوشخبری کا کھوج نہ مل سکا، تو راولپنڈی ٹیلیفون کھڑکائے گئے۔ وہاں سے بھی اس کی تصدیق نہ

لے یہ گورنر اے۔ ایم۔ مالک کا آبانی گاؤں تھا جو بیسویں سیکٹر میں سرحد سے چند میل اندر واقع تھا۔ اس دن بھارتی فوجیں وہاں

پہنچ چکی تھیں۔



ہوسکی۔ بالآخر یہ خبر سراسر بے بنیاد نکلی۔ خوشی کی بولہراچانک اٹھی تھی، وہ فوڑیا س میں ڈوب گئی۔

اگلی صبح ۲۸ بجے کانفرنس ہوئی۔ بٹنرہن وہیں تھے جہاں پہلے روز تھے۔ ریڈیو پاکستان پر کان لگائے کہ شاید کوئی تازہ خبر سننے میں آئے۔ وہاں بھی ہر بیٹن میں یہی جملہ سننے میں آتا: "ہماری بہادر افواج اپنے دم دمے مضبوط کر رہی ہیں۔" ایک صاحب نے تنگ آکر کہا: "انہیں اوزی سلچے بھیجو تاکہ جلدی سے یہ کام پٹا کر آگے بڑھ سکیں۔"

۴ دسمبر کو جنرل نیازی مغربی محاذ سے مایوس ہو چکے تھے۔ انہوں نے صبح کی کانفرنس میں جی ایچ کیو سے آمدہ تار کے اقتباسات پڑھوانے بند کر دیے اور دہلوار پر سے مغربی پاکستان کے نقشے ہٹوا دیے۔ وہ دوبارہ مشرقی پاکستان کے خول میں سمٹ آئے جہاں تاریکیاں ان کا انتظار کر رہی تھیں۔

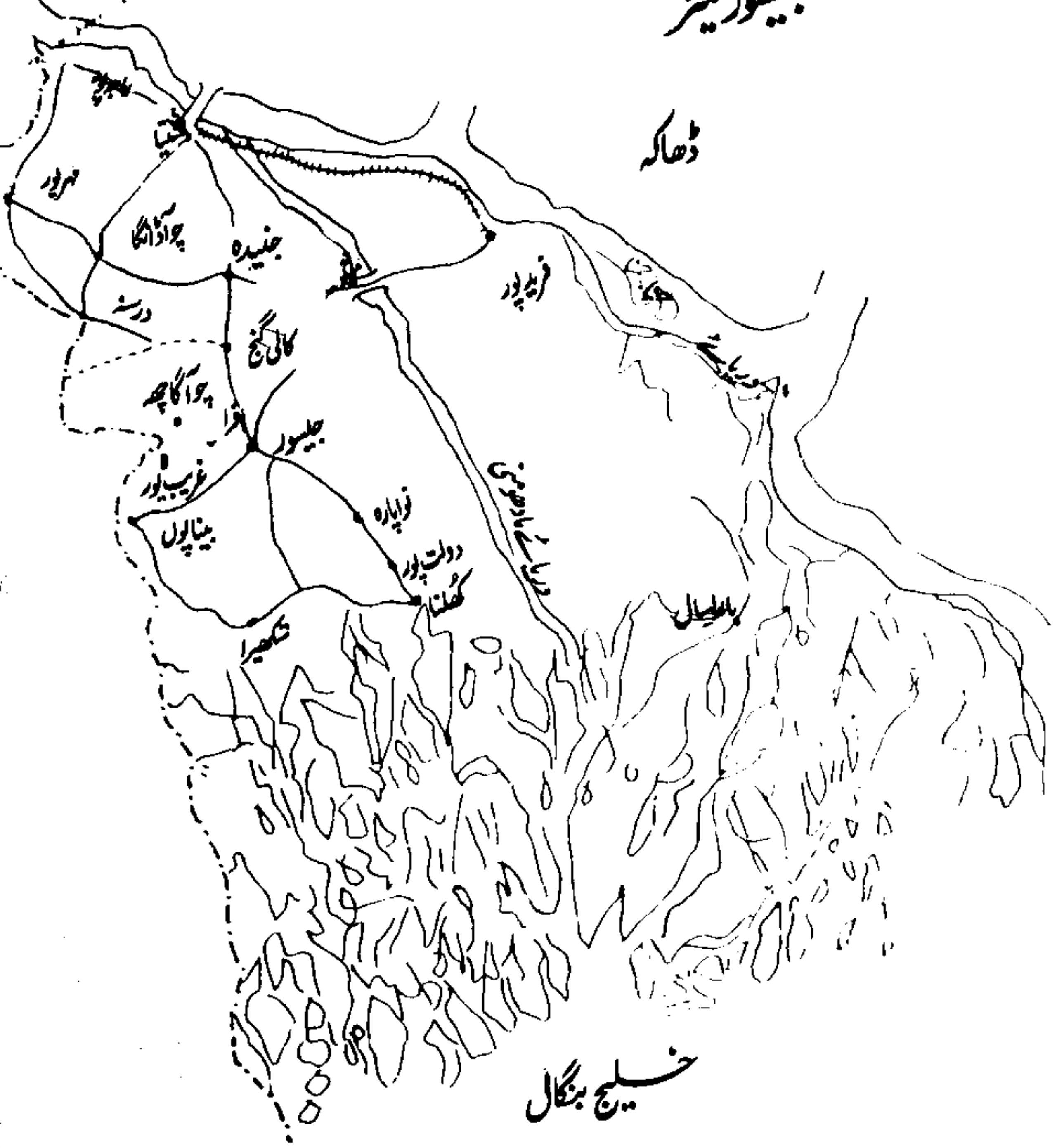
مشرقی پاکستان کے نقشوں پر سبز اور سُرخ پن کے بجائے اسی رنگ کی پنسلوں سے لکیریں کھینچ کر پاکستانی اور ہندوستانی افواج کی پوزیشن دکھائی گئی تھی۔ سبز تیرہماری پپانی اور سُرخ تیرہ دشمن کی چڑھائی کی نشاندہی کر رہے تھے۔

آئیے ان تیروں کے چکروں سے نکل کر خود محاذ جنگ پر چلیں اور اپنی آنکھوں سے دیکھیں کہ جنگ کا رنگ کیا ہے۔



جیسور سیکر

ڈھاکہ



خليج بنگال

بین الاقوامی سرحد
شہریں
ریلوے
دریا

جیسور سیکٹر (۹ ڈویژن)

جیسور سیکٹر مشرقی پاکستان کا جنوب مغربی علاقہ تھا جس کے شمال میں دریائے گنگا، مشرق میں دریائے میگھنا اور جنوب میں خلیج بنگال تھی۔ مغربی جانب مغربی بنگال کی مشرقی سرحد لگتی تھی۔ اس علاقے کے اہم شہر کھلنا، جیسور، جنیدہ، کشتیا، باریسال اور فرید پور تھے۔

اس سیکٹر کا بارڈر چھ سو کلومیٹر کے لگ بھگ تھا، اندرونی مواصلاتی نظام خصوصاً سڑکیں اور ریل کی سڑکیاں شمالاً جنوباً پھیلی ہوئی تھیں اور ان کا فاصلہ بین الاقوامی سرحد سے کہیں تیس اور کہیں ساٹھ کلومیٹر بنتا تھا۔ جنوب سے شمال کی طرف جلتے ہوئے اس سڑک پر اہم شہر کھلنا، جیسور، جنیدہ اور کشتیا پڑتے تھے۔ اس کے علاوہ دوسری سڑکیں جیسور اور جنیدہ سے مشرق کی طرف جاتی تھیں جنہیں بوقت ضرورت فوجی کارروائی کے لیے استعمال کیا جاسکتا تھا۔ جیسور اور جنیدہ سے مشرق میں ایک چھوٹا سا دریا "مادھوتی" بہتا تھا جو دفاعی نقطہ نظر سے بہت مفید تھا۔ مجموعی طور پر سارا سیکٹر میدانی تھا جس میں آزادانہ طور پر فوجی گاڑیوں کی نقل و حرکت ہو سکتی تھی، البتہ ٹینکوں کے لیے اسے ناموزوں سمجھا جاتا تھا، کیونکہ راستے میں کئی چھوٹے بڑے نالے پڑتے تھے۔

دریائے گنگا کے جنوبی کنارے بین الاقوامی سرحد پر ایک چھوٹی سی جگہ تھی جسے راجہ پور کے نام سے پکارا جاتا تھا۔ اس سے لے کر نیچے (جیسور سے شمال مغرب میں) درسنہ تک کا علاقہ بریگیڈ ۹ ڈویژن کے ماتحت تھا جنہوں نے اپنے ۵ بریگیڈ کا ہیڈ کوارٹر جنیدہ میں بنا رکھا تھا۔ جیسور سیکٹر کا پچھلے نصف حصہ یعنی درسنہ سے خلیج بنگال تک بریگیڈ ۹ ڈویژن کے پاس تھا جس کا (۱۰۷) بریگیڈ ہیڈ کوارٹر جیسور میں تھا۔ یہ دونوں بریگیڈ ۹ ڈویژن کے زیرِ کمان تھے جس کے جی او سی میجر جنرل محمد حسین انصاری (رٹائرڈ) تھے۔ زمانہ امن میں ان کا ہیڈ کوارٹر بھی جیسور میں تھا، لیکن جنگ شروع ہونے سے چند دن پہلے وہ دریائے مادھوتی اور جنیدہ کے درمیان منگورہ کے مقام پر منتقل ہو چکے تھے۔ دو بریگیڈوں کے علاوہ اس ڈویژن میں ای پی سی اے ایف کے سپاہی اور رضا کار وغیرہ بھی تھے جن کے ذمے کھلنا کا دفاع تھا۔ وہاں کے کمانڈر کرنل فضل حمید تھے۔

جنرل نیازی نے مشرقی پاکستان کے دفاع کے لیے دفاعی قلعوں، پرمیٹی جس اسٹریٹیجی کا انتخاب کیا تھا، اس کے تحت اس سیکٹر میں جیسور اور جنیدہ کو قلعوں کی حیثیت حاصل تھی جبکہ کشتیا اور کھلنا وغیرہ اہم مقام (STRONG POINT) سمجھے جاتے تھے۔ دفاعی منصوبہ یہ تھا کہ دشمن کو پہلے تو راجہ پور، درسنہ، بینا پول اور دیگر سرحدی مقامات پر روکا جائے اور پھر اہستہ اہستہ "تھوڑی سے تھوڑی زمین زیادہ سے زیادہ وقت میں" چھوڑتے ہوئے دفاعی قلعوں میں آجائے اور پھر وہاں آخری دم تک ڈٹ کر مقابلہ کیا جائے۔ قیاس یہ تھا کہ دشمن جیسور اور جنیدہ میں سے اول تو دونوں یا پھر ایک قلعے کو مسخ کرنے کے بعد ہی آگے

بڑھنے کی سوچے گا، ورنہ ہندو کا اتنا دل گروہ کہاں کہ وہ اپنے پیچھے ایک ایک قلعے میں ایک ایک بریگیڈ کی پروا کیے بغیر سیدھا ڈھا کہ کی طرف پیش قدمی کرے۔ یہ بھی خیال تھا کہ اگر اس نے کسی قلعے کو فتح کرنے کے بجائے اسے محض محصور کرنے پر اکتایا تو حصار باندھنے والی فوج محصور فوج (یعنی ایک بریگیڈ) سے کم نہ ہوگی، یعنی جیسور سیکٹر میں اگر اس نے دفاعی قلعوں کو محصور کر کے آگے بڑھنا چاہا، تو اس کے دو بریگیڈ (یعنی ایک ڈویژن) تو حصار بندی میں صرف ہو جائیں گے، آگے بڑھنے کے لیے اسے علیحدہ فوج درکار ہوگی جو افریقہ میں اس کے پاس موجود نہ تھی۔

ہمارے بچھنے کے مطابق بھارت جیسور سیکٹر میں تین راستوں سے حملہ کر سکتا تھا:

(ا) کلکتہ سے بنیپول اور جیسور

(ب) کٹن گڑھ سے درسنہ اور چوڑا ڈانگا

(ج) مرشد آباد سے راجہ پور اور کشتیا

فوجی ذہن عموماً حملے کا رخ متعین کرتے وقت رسل و رسائل کے ذرائع کو بہت اہمیت دیتے ہیں، لہذا مذکورہ بالا تین راستے ہی بھاری تعداد میں ٹرکوں توپوں اور ٹینکوں کی آمدورفت کے لیے استعمال ہو سکتے تھے، لیکن بھارتی منصوبہ بندوں کی دایرجے کہ انہوں نے متوقع راستوں میں سے کسی کو بھی نہ اپنایا۔ انہوں نے باقاعدہ جنگ سے پہلے ہمارے علاقے میں جہاں جہاں قدم جما رکھے تھے وہیں سے آگے بڑھنے کی کوشش کی۔ آپ کو یاد ہو گا ۱۲ نومبر کو جیسور سیکٹر میں ایک جھڑپ ہوئی تھی جس میں ہمارے چھ ٹینک اور دو سیرٹیارے تباہ ہو چکے تھے اور ایسٹرن کمانڈ نے شور مچایا تھا کہ بھر پور جنگ چھڑ گئی۔ یہ واردات بوہرا یا غریب پور کے مقام پر ہوئی تھی جہاں راتوں رات بھارت نے قبضہ کر لیا تھا اور ہم اسے پسپا کرنے میں ناکام رہے تھے۔ ہم نے صرف آنگیا تھا کہ ڈویژن کے وسائل کام میں لاتے ہوئے دشمن کے مورچوں کے سامنے حصار باندھ دیا تھا تاکہ وہ آگے نہ بڑھنے پائے۔ یہ بریگیڈیر محمد حیات کے ۷۰ بریگیڈ کا علاقہ تھا) دوسرا سرحدی علاقہ جو باقاعدہ جنگ سے قبل دشمن کے قبضے میں جا چکا تھا، درسنہ کے قریب جہن نگر تھا جو بریگیڈر منظور کے ۵۰ بریگیڈ میں واقع تھا جنگ چھڑنے پر جیسور سیکٹر میں دشمن نے انہی مقامات سے آگے چھلانگ لگانے کی کوشش کی۔ آئیے پہلے بریگیڈیر محمد حیات کے علاقے کا حال دیکھیں۔

غریب پور کے مقام پر ۱۵۰ مربع کلومیٹر علاقہ بھارت کے قبضے میں تھا۔ وہاں سے جیسور تک توپ کے گولے کا فاصلہ بمشکل ۱۱ یا ۱۲ کلومیٹر بنتا تھا۔ نومبر والے واقعہ کے بعد اگرچہ دشمن نے پیش قدمی روک لی تھی مگر وقتاً فوقتاً جیسور کی طرف گولے پھینک کر اپنی موجودگی کا احساس دلاتا رہتا تھا۔ ۳ دسمبر کو بھر پور جنگ چھڑنے کے بعد گولہ باری میں مزید شدت آگئی اور دشمن نے حصار توڑ کر آگے بڑھنے کی کوششیں شروع کر دیں۔ ہماری طرف سے تین پلینیں یعنی ۶ پنجاب ۲۱ پنجاب اور ۲۲ فرنٹیر فورس کی ایک پلینی اسے روکے ہوئے تھی جن کی پوزیشن برنڈہ آٹھ آر (R-8) اور محمد پور کے علاقے میں تھی۔ دشمن نے کھیر لورڈ جیسور کی طرف بڑھنے کی کوشش کی، مگر ہماری فوج نے زبردست مزاحمت کی۔ دشمن بار بار اس حصار سے سر ٹکراتا اور ہر بار پسپا ہو کر اپنے کھار میں دب جاتا یہ رسائی ساٹھ گھنٹے جاری رہی، گویا ۱۶ دسمبر کی صبح تک دشمن اپنے ارادے میں کامیاب نہ ہو سکا۔

لے یہ دونوں مقامات قریب قریب تھے۔

اسی حصار پر حبسور کے دفاع کا انحصار تھا، کیونکہ اگر ایک دفعہ بند ٹوٹ جاتا، تو ریلا سیدھا حبسور میں رکتا، کیونکہ درمیان میں کوئی دفاعی لائن نہ تھی، بلکہ زیادہ تشویش ناک بات یہ تھی کہ حبسور کے دفاعی قلعے میں راشن اور ایمونیشن تو وافر مقدار میں تھا، مگر وہاں لڑنے والے نہ تھے۔ وہی سپاہی جو سرحد کے ساتھ ٹنگے ہوئے تھے، اُنہی کو واپس آ کر حبسور کے ارد گرد مورچے سنبھالنے تھے۔ یہ سپاہی حبسور سے قریب ترین مقام پر بینا پول (۲۳ کلومیٹر) اور بعید ترین مقام پر شکھیرہ (۹۰ کلومیٹر) میں تھے۔ بریگیڈیر محمد حیات جو ایک عمدہ فوجی کمانڈر سمجھے جاتے تھے، اس نکتے کو بخوبی جانتے تھے کہ اگر غریب پور والا حصار ٹوٹ گیا، تو سرحدوں سے سپاہی واپس لا کر حبسور کا دفاع منظم کرنے سے پہلے دشمن حبسور میں داخل ہو جائے گا۔ بہت سے ذرائع نے تصدیق کی ہے کہ انہوں نے جنگ چھڑنے سے پہلے اپنے جی اوسی میجر جنرل ایم۔ ایچ۔ انصاری کو اس خطرے سے آگاہ کیا تھا اور اجازت چاہی تھی کہ وہ سرحدوں سے کچھ نفری واپس بلا کر حبسور میں رکھ لیں تاکہ دشمن کو کم از کم اتنی دیر کے لیے روکا جاسکے کہ باقی نفری حبسور پہنچ جائے۔ جنرل انصاری نے جو ۲۵ کلومیٹر پیچھے منگورہ کے مقام پر بیٹھے تھے، اس اقدام کی اجازت نہ دی کیونکہ جنرل نیازی نے کہہ رکھا تھا کہ جب تک تین چوتھائی آدمی شہید یا زخمی نہ ہو جائیں سرحدوں سے کوئی پیچھے نہ ہٹے۔

بریگیڈیر حیات نے یہ سرکاری حکم مان لیا، لیکن اپنے طور پر فیصلہ کیا کہ غریب پور کا حصار ٹوٹنے کے بعد حبسور میں قلعہ بند ہونے کے بجائے کھلنا کی طرف سپاہیوں کو منگورہ کی طرف علاقوں میں پھیلی ہوئی نفری کو اکٹھا کرنے کا وقت مل سکے۔ اسی خیال کے پیش نظر انہوں نے جنگ سے قبل اہم ہتھیاروں کا ایمونیشن حبسور سے کھلنا منتقل کر دیا تھا۔ یہ کارروائی جنگی منصوبے کے سراسر منافی تھی۔ دفاعی منصوبے میں کہا گیا تھا کہ سرحدوں سے سپاہیوں کو حبسور اور جنیدہ کے دفاعی قلعوں میں بھر پور لڑائی لڑی جائے گی اور اگر بفرس محال ان قلعوں کو چھوڑنا پڑا، تو سپاہی منگورہ کی طرف ہوں گی نہ کہ کھلنا کی طرف۔ بریگیڈیر حیات کے افسروں کا کہنا ہے کہ منگورہ یا مادھوتی کی طرف سپاہیوں کا کسی منصوبے میں ذکر نہ تھا، اس لیے منصوبے کے منافی کارروائی کا الزام سراسر غلط ہے، جبکہ ایٹرن کمانڈر کے بریگیڈیر باقر صدیقی کا کہنا ہے کہ یہ بات زبانی طور پر جنرل انصاری کو بتائی گئی تھی اور تحریری طور پر اس کا ذکر دفاعی منصوبے میں اس لیے نہیں کیا گیا تھا کہ جو نیر افسر پیچھے کی طرف دیکھنا شروع نہ کر دیں۔

سپاہیوں کا تعین کس طرف اور کس سطح پر کیا گیا تھا، اس سے قطع نظر بریگیڈیر حیات نے کھلنا کو ترجیح دی اور جنگ کے تیسرے روز (۵ دسمبر) ایک پٹھان کمانڈنگ آفیسر کو اعتماد میں لیتے ہوئے کہا: دیکھنا، کہیں سوتے ہوئے پکڑے نہ جانا، اگر ہمیں حبسور چھوڑنا پڑا، تو ہمارا رخ منگورہ کی طرف نہیں، کھلنا کی طرف ہوگا۔

ادھر بریگیڈیر حیات اپنی سپاہیوں کا رخ متعین کر رہے تھے اور ادھر دشمن گھیر توڑنے کی سر توڑ کوشش کر رہا تھا۔ اس نے جنگ کے ابتدائی دنوں میں ہمارے سپاہیوں کو پیچھے دھکیل کر اپنے گلے کا طوق ذرا وسیع کر لیا تھا، مگر مکمل طور پر گھیر توڑنے میں کامیاب نہ ہوا تھا۔ گھیرا کھلا ہونے کے بعد اب ہماری پلٹنوں کی دفاعی لائن قائم کھولا، سنٹوش نگر اور امرت بازار کی سیدھ میں آگئی تھی۔ گھیرے کی نئی پوزیشنوں کی وجہ سے ساتھ والی پلٹن (۲۲ ایف ایف) کی پوزیشن کو بھی بدلنا پڑا۔ اس پلٹن کی ایک کمپنی کو جو بینا پول کی سرحدی چوکی پر تھی، چھ کلومیٹر پیچھے سارچہ کے مقام پر منتقل کر دیا گیا اور دوسری کمپنی جو راگھوناتھ میں تھی، اُسے بھی پیچھے ہٹا کر جھنگر گاچہ میں متعین کیا گیا۔ گویا مجموعی طور پر ہمارا حصار سرحد سے اور پیچھے آ گیا تھا۔

بریگیڈیر حیات کے بریگیڈ (۱۰۷) کو بھارت کے ڈویژن کا سامنا تھا۔ اس نے چھ دسمبر کو حصار توڑنے پر اپنی پوری طاقت

صرف کر دی۔ پہلا دھاوا صبح کے وقت بولا جو ناکام رہا، دوسرا حملہ اانجے کے قریب کیا، جو بے اثر ثابت ہوا، البتہ دوپہر کو اس کی تیسری کوشش جزوی طور پر کامیاب ہو گئی۔ اس کا ہراول دستہ ہماری ایک پلاٹون (تقریباً ۳۰ آدمی) کو روندتا ہوا آگے بڑھ گیا۔ بد قسمتی سے اس شگاف کو پُر کرنے کے لیے فالتوفری دستیاب نہ تھی۔ جو سپاہی جہاں موجود تھے، انہیں وہاں سے ہٹانے سے ایک اور شگاف پیدا ہو سکتا تھا، چنانچہ پنجاب کے سیکنڈ ان کمانڈ (نائب سالار) میجر یحییٰ نے جسیور میں بریگیڈ ہیڈ کوارٹر کو اطلاع دی کہ ہماری دفاعی لائن میں شگاف پڑنے سے دشمن کے ٹینک اور بکتر بند گاڑیاں جسیور/جنیدہ روڈ کی طرف دوڑی جا رہی ہیں۔ بریگیڈیر حیات کو یہ پیغام کوئی تین بجے پہر (۶ دسمبر) ملا۔ ۲۲ ایف ایف کے کمانڈنگ آفیسر لیفٹیننٹ کرنل شمس اس وقت ان کے پاس تھے۔ بریگیڈیر حیات نے شمس سے کہا کہ وہ اپنی پلٹن کو مینا پول/جسیور روڈ سے ہٹا کر کھلنا/جسیور روڈ پر لڑناں پارہ کے مقام پر لے جائیں اور ایک کمپنی کو جسیور شہر کے چوک میں چھوڑ جائیں تاکہ باقی پلٹنوں کو صحیح سمت میں جانے میں رہنمائی کر سکے۔ سپانی — جانب کھلنا — کی اطلاع واٹر لیس پر باقی پلٹنوں کو بھی دے دی گئی۔

بریگیڈیر حیات اور ان کے ہیڈ کوارٹر نے ساڑھے پانچ بجے شام جسیور کو خیر باد کہا، جب وہاں دشمن کا نام و نشان تک نہ تھا۔ انہوں نے کھلنا کی طرف روانگی میں اپنی عجلت دکھائی کہ جسیور میں مدفون ایمونیشن کے ذخیرے بھی نذرِ آتش نہ کر سکے بغیر ملکی صحافیوں نے جو بھارتی افواج کے ساتھ تھے، مجھے بتایا کہ انہوں نے ہمارے بریگیڈ کمانڈر کا خالی حمیرہ دیکھا جس کی اس ٹرے میں آدھا جلا ہوا سگریٹ رکھا تھا، وہاں کلرکوں کے دفتر دیکھے جہاں ٹائپ کی مشینوں میں ابھی تک کاغذ چڑھے ہوئے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ اتنی عجلت کا کوئی جواز نہ تھا، کیونکہ یہ ہیڈ کوارٹر چھ دسمبر کی شام کو خالی کیا گیا اور بھارتی دستے ۷ دسمبر کی دوپہر کو جسیور میں داخل ہوئے۔ دراصل بھارت اندھا دھند جسیور میں داخل نہیں ہونا چاہتا تھا، اس کا خیال تھا کہ اس "دفاعی قلعے" کو مسخر کرنے میں بڑی مزاحمت کا سامنا کرنا پڑے گا، اس لیے وہ اگرچہ ۶ دسمبر کی شام یا سہ پہر کو اس کے گرد و نواح میں پہنچ چکا تھا، مگر داخل ہونے سے پہلے بھر پور تیاری ضروری سمجھتا تھا۔

بریگیڈیر حیات کے بعض دوستوں کا خیال ہے کہ چھ دسمبر کی شام کو جسیور سے منگورہ جانے والی سڑک دشمن کے قبضے میں جا چکی تھی، اس لیے اس طرف سپانی میں زبردست مزاحمت کا سامنا کرنا پڑتا۔ یہ تاثر حقیقت کے برعکس ہے، کیونکہ رات گئے اسی راستے سے ہمارے کئی افسر منگورہ گئے اور انہیں وہاں دشمن کے کوئی آثار نظر نہ آئے۔ لیفٹیننٹ کرنل احسان جو اسی راستے سے گزرے، بتاتے ہیں کہ انہوں نے راستے میں اپنی ملٹری پولیس کے دستے دیکھے جن کے سپرد یہ کام تھا کہ وہ جسیور سے منگورہ جانے والی سڑک کی رہنمائی کریں۔ انہیں جگہ جگہ سڑک کے مرمت شدہ حصے نظر آئے تاکہ ٹریفک بلا رکاوٹ گزر سکے۔ اس کے علاوہ جسیور سے جنیدہ جانے والی سڑک پر بھی چھ دسمبر کی رات کو، اانجے تک ہمارے آدمی بلا روک ٹوک گزرے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ اگر بریگیڈیر محمد حیات دلی طور پر منگورہ کی طرف ہٹنا چاہتے، تو وہ ہٹ سکتے تھے۔

آئیے ذرا دیکھیں کہ بریگیڈیر حیات نے جو راستہ اختیار کیا، ادھر کیا پیش آیا —

۶ اور ۷ دسمبر کی درمیانی رات ۱۰۔۱۱ بریگیڈ کے لیے بڑی بھگدڑ کی رات تھی۔ اس بریگیڈ میں جتنی نفری تھی، اُسے پتہ تھا کہ اگر لپسا

۱۰ ایئر کمانڈ کی فراہم کردہ اطلاع پر ریڈیو پاکستان ۸ دسمبر تک دعویٰ کرتا رہا کہ جسیور ہمارے پاس ہے اور وہاں گھسان کی جنگ ہو رہی ہے۔

ہونا پڑا، تو جیسور جانا ہو گا۔ ان میں سے کوئی بھی کھلنا جانے کے لیے ذہنی طور پر تیار نہ تھا۔ اکثر نے "نواں پارہ" کا پہلے سبھی نام تک نہ سنا تھا۔ افسر کھلنا کی طرف مراجعت میں پوشیدہ حکمت سے نا آشنا تھے۔ وہ حکم کے بندھے ہوئے بھاگم بھاگ جیسور پہنچے جہاں چوک میں ۲۲ ایف ایف کی کمپنی (مجر باہر) نے انہیں کھلنا کی راہ پر ڈال دیا۔ اس بھگدڑ میں ایک ایمرینس گاڑی 'نواں پارہ' کے بجائے "غریب پور" کی طرف دوڑتی نظر آئی۔ اسے روک کر ڈانٹا گیا کہ "بڈھو، تمہیں اتنا بھی اندازہ نہیں کہ نواں پارہ کدھر ہے، تم مخالف سمت میں مُنڈا اٹھائے چلے جا رہے ہو" ڈرائیور نے سنجیدگی سے جواب دیا: "سر، مجھے سمت کا اندازہ ہے، مگر میں غریب پور سے زخمیوں کو لکالتے وقت بعض سپاہیوں سے وعدہ کر آیا تھا کہ انہیں دوسرے پھیرے میں لے جاؤں گا، وہ میرا انتظار کر رہے ہوں گے۔"

۱۰۷ بریگیڈ کو دراصل ایک ہی جہت میں نواں پارہ نہیں پہنچا تھا۔ اُسے راستے میں سب سے پہلے سنگ میل نمبر ۳ پر روکا گیا۔ وہاں اُس کے قدم نہ جم سکے، تو وہ سنگ میل نمبر ۲۵ پر جا اٹکا، وہاں دشمن کو آتے دیکھا، تو مزید پانچ میل پیچھے ہٹ گیا پہلا محرکہ ۱۰ ستمبر کو سنگ میل نمبر ۲۰ پر پڑا اور پھر ایک ہی جہت میں سنگ میل نمبر ۱۰ (دولت پور) تک پسپا ہو گیا۔ وہاں اُس نے دشمن کا ڈٹ کر مقابلہ کیا۔ ۱۶ دسمبر کی صبح کو یہ بریگیڈ دولت پور چھوڑ کر کھلنا جانے کی تیاریاں کر رہا تھا کہ ڈھاکہ سے 'جنگ بندی' کی اطلاع آگئی مجموعی طور پر دیکھا جائے، تو بریگیڈ بریجیات نے یہ پرائیویٹ جنگ بڑی مہارت سے لڑی اور وہ دشمن کا ایک ڈویژن اپنے تعاقب میں دولت پور تک لے جانے میں کامیاب ہو گئے۔

کھلنا کا ہنگامی بریگیڈ جو کرنل فضل حمید کے زیرِ کمان تھا، جیسور خالی ہونے کی خبر سن کر بدک اٹھا۔ اُس نے اُسی رات (۱۶ اور ۱۷ دسمبر) اپنا بوریا بستر لپیٹا اور نقل و حمل کا جو ذریعہ ملا، اُسے قابو کر کے ڈھاکہ کی طرف کوچ کر گیا۔ کھلنا میں نیوی کے سب سے سینئر افسر کمانڈر گل زریں تھے، انہوں نے آؤ دیکھا نہ تاؤ اپنے اعلیٰ افسروں کو اطلاع دیے بغیر ایک گن بوٹ میں سوار ہو کر سمندر کی طرف نکل گئے جس طرح جیسور افراتفری میں چھوٹا، اس سے کہیں زیادہ بھاگم بھاگ میں کھلنا خالی ہو گیا۔ اب آئیے جنرل انصاری کے دوسرے بریگیڈ (۵۷) کی طرف جس کی قیادت بریگیڈیئر منظور کے سپرد تھی۔ بریگیڈیئر منظور اپنی شرافت اور ملائمت کے لیے مشہور تھے۔ ان کے بریگیڈ کو بھارت کے ۴ پہاڑی ڈویژن کا سامنا تھا۔ بریگیڈیئر منظور کے پاس دو مکمل پلٹنیں (۲۹ بلوچ اور ۸ پنجاب) اور ایک کمپنی تھی جو ۱۲ پنجاب (آر اینڈ ایس) سے لعلق رکھتی تھی۔ بھاری ہتھیاروں میں ان کے پاس توپ خانے کی ایک رجمنٹ اور (۲۴-۸) مینکوں کا ایک اسکواڈرن تھا۔ یہ ٹینک درحقیقت ایٹرن کمانڈ کی "ملکیت" تھے جو آڑے وقت میں کسی بھی بریگیڈ کو دیے جاسکتے تھے۔ انہیں کشتیا کے پاس رکھا گیا تھا تا کہ وہ دریائے گنگا کے دونوں جانب کسی بھی مقام پر استعمال کیے جاسکیں۔

دسمبر کے ابتدائی ایام میں بریگیڈیئر منظور اپنے ہیڈ کوارٹر (جنیدہ) میں بیٹھے تھے کہ ان کو خبر ملی دشمن "جین نگر" (جہاں وہ پہلے ہی اپنے قدم جا چکا تھا) سے پھیل کر درسنہ کی طرف بڑھنے کے لیے ہاتھ پاؤں مار رہا ہے۔ درسنہ ایک سرحدی قصبہ تھا جس کے ہاتھ سے جانے سے گورنر مالک کے آبائی قصبے جو اڈانگا کے لیے راستہ کھل جاتا تھا اور اگر دشمن چو اڈانگا پہنچ جاتا، تو وہ اگلی لہ ان دنوں سڑک پر میلوں کے نشان تھے۔ کلومیٹر کا نظام ابھی رائج نہیں ہوا تھا۔

۴ MOUNTAIN DIVISION

جست میں جنیدہ یا کشتیا جاسکتا تھا۔ بریگیڈ پر منظور نے دشمن کو سرحدی علاقے میں روکنے کے لیے خود آگے جانا مناسب سمجھا۔ مگر ان کی آمد سے جنگی صورت حال پر کوئی اثر نہ پڑا۔ جنگ کے پہلے دن ہی دشمن نے چھپٹ کر درسنہ پر قبضہ کر لیا۔ بریگیڈ پر منظور نے اب ساری توجہ چوڈانگا پر مرکوز کر دی۔ انہوں نے سرحدی چوکیوں سے اپنی ساری لفری بلا کر وہاں جمع کی اور دشمن کا انتظار کرنے لگے۔ دشمن ایسا بے مروت نکلا کہ اس نے بریگیڈ پر منظور کی توقعات پر پورا اترنے کے بجائے اپنے لیے ایک نئی جہت کا انتخاب کیا۔ قیاس تھا کہ اس کا رخ جیسور جنیدہ روڈ پر واقع کالی گنج کی طرف ہو گا تاکہ ۷۵ بریگیڈ اور ۱۰۷ بریگیڈ ایک دوسرے سے کٹ جائیں۔ دشمن کو اس حرکت سے باز رکھنے کے لیے جنرل انصاری نے اپنے کرنل اسٹان کرنل آفریدی کو بھیجا جنہوں نے ۵۰ پنجاب کی دو کمپنیوں اور جنم نگر سے اگھڑی ہوئی ۳۸ ایف ایف کے اجزا کو ملا کر ایک ٹاسک فورس (TASK FORCE) قائم کر لی اور کالی گنج کے قریب دشمن کا انتظار کرنے لگے۔ تعجب کی بات کہ ادھر بھی دشمن طلوع نہ ہوا۔

آخر وہ کیا کہاں؟

بھارتی فوج کئی باہنی کی انگلی پکڑے برساتی نالوں سے سچی، کھیتوں اور کچے راستوں سے ہوتی ہوئی چوڈانگا اور جنیدہ کے درمیان سادھوٹی کے مقام پر جانکلی جہاں اس کا استقبال کرنے والا کوئی نہ تھا۔ ۴ اور ۵ دسمبر کی درمیانی رات کو پہلے پہل اس کی صرف ایک کمپنی اور چند ٹینک (ایک ٹروپ) وہاں پہنچے۔ اس کمپنی کے کمانڈر بھارتی میجر نے بعد میں بتایا کہ وہ پہلی رات کا پتار ہا کہ مجھے کہاں ڈالا گیا ہے۔ ایک طرف جنیدہ ہے، دوسری طرف چوڈانگا میں دو جبرٹوں میں پس کر رہ جاؤں گا۔ رات رام رام کرتے گزری، مگر ہماری طرف سے اس کی گوشمالی کو کوئی نہ پہنچا۔ اگلی صبح دس بجے راشن ڈھونڈنے والی چند گاڑیاں چوڈانگا سے جنیدہ جا رہی تھیں۔ بھارتی میجر نے بوکھلا کر قبل از وقت ان پر فائر کروا دیا۔ وہ گاڑیاں واپس چوڈانگا چلی گئیں اور یوں بریگیڈ پر منظور کو اطلاع ملی کہ ان کا اپنے ہیڈ کوارٹر سے رابطہ ٹوٹ چکا ہے۔ اب ان کے سامنے دو راستے تھے۔ ایک یہ کہ وہ بلاتا خیر سادھوٹی پر حملہ کر کے رکاوٹ کو دور کر دیں، دوسرا یہ کہ وہ چوڈانگا (جو STRONG POINT تھا) کو اپنا سکن بنائے رکھیں جہاں ان کا تقریباً سارا بریگیڈ جمع تھا۔ انہوں نے جنگی صورت حال کا نہایت ملامت سے جائزہ لیا۔ پہلے ایک افسر کو بھیجا کہ جاؤ بھی ڈراپہ تو کر آؤ کہ واقعی دشمن وہاں ہے بھی کہ نہیں۔ جب اس کی تصدیق ہو گئی، تو انہوں نے ایک مٹھی بھر دستہ روانہ کیا کہ جاؤ بھی اُس کو وہاں سے ہٹا دو۔ وہ ناکام لوٹ آیا، تو پھر میجر زاہد کی قیادت میں ایک پلاٹون کو روانہ کیا۔ اب چھ دسمبر ہو چکی تھی۔ دشمن نے گزشتہ ۳۶ گھنٹوں میں نہ صرف اپنی دفاعی پوزیشن مضبوط بنالی تھی، بلکہ مزید فوج اور ٹینک بھی وہاں پہنچ چکے تھے۔ میجر زاہد پلاٹون لے کر دشمن کے قریب پہنچے اور حملے کی تیاری کرنے لگے۔ اتنے میں حکم ملا کہ نہیں بھیجی، واپس آ جاؤ، ایک پلاٹون بھاری کیا کرے گی۔

اسی دن (۶ دسمبر) جیسور بھی خالی کیا جا چکا تھا۔ شام کو جنرل انصاری نے بریگیڈ ہیڈ کوارٹر جنیدہ میں ٹیلی فون کیا۔ بریگیڈ پر منظور کا بریگیڈ میجر میجر جعفر بولا۔ جنرل انصاری نے کہا: "جعفر، کیا ہو رہا ہے؟" کچھ خاص کام تو نہیں ہو رہا، "اچھا، تو تم منگورہ آ جاؤ اور (کرنل) آفریدی سے بھی کہو کہ وہ (کالی گنج سے) واپس آ جائے۔ یہاں ڈویژنل ہیڈ کوارٹر کے دفاع کے لیے کوئی نہیں۔ جیسور تو جا ہی چکا۔"

اسی رات کرنل آفریدی کی لفری بھی جنیدہ واپس آ گئی اور اگلی صبح (۷ دسمبر) میجر جعفر نے بریگیڈ ہیڈ کوارٹر کا عملہ، فائلیں اور

نقشے گاڑیوں پر لادے اور منگورہ روانہ ہو گئے۔ آخری گاڑی گیارہ بجے نکلی۔ اسی شام دشمن گولی چلائے بغیر ڈوئیشن کے دوسرے دفاعی قلعے میں داخل ہو گیا۔

برگیڈیئر منظور شرافت سے چوڑا ٹنکا میں بیٹھے تھے۔ انہوں نے سوچا میں یہاں بیکار بیٹھا کیا کر رہا ہوں۔ اگر یہیں محصور ہو گیا تو راشن اور ایمونیشن بھی زیادہ عرصہ ساتھ نہیں رہے گا، کیوں نہ کشتیا چلا جائے وہاں چل کر دیکھتے ہیں کہ صورت حال کیا بنتی ہے؟ چنانچہ وہ ۷ اور ۸ دسمبر کی درمیانی رات کو اپنی سپاہ کو کشتیا منتقل کرتے رہے۔ وہاں پہنچ کر انہوں نے شہر کے ارد گرد فوجی دستے متعین کر دیے تاکہ دشمن کسی طرف سے ان پر حملہ نہ کرے۔ انہوں نے حکام بالا کو بھی اطلاع کر دی کہ میں کشت و خون سے بچتا ہوں کشتیا پہنچ گیا ہوں۔ اس پر ایٹرن کمانڈر ہیڈ کوارٹر نے ان سے کہا کہ وہ سڑک کے راستے جنیدہ پہنچ جائیں یا ریلوے لائن کے ساتھ ساتھ منگورہ کی طرف چلے جائیں۔ برگیڈیئر منظور نے ذرائع آمد و رفت کی قلت اور متوقع مزاحمت کے پیش نظر کسی ایک طرف جانے سے معذوری ظاہر کر دی۔ انہوں نے کشتیا ہی میں رہنے کو ترجیح دی۔

ان کی وہاں موجودگی فوجی نقطہ نگاہ سے اگر مفید ہو سکتی تھی تو یوں کہ دشمن مشرق کی طرف مزید پیش قدمی سے پہلے اس حقیقت کو نظر انداز نہیں کر سکتا تھا کہ اس کے بائیں بازو پر ایک پاکستانی برگیڈ موجود ہے۔ واقعی ایسا ہی ہوا۔ دشمن نے ۸ دسمبر کو جنیدہ کی طرف سے ایک بھاری جمعیت کشتیا کی طرف روانہ کی۔ برگیڈیئر منظور نے میجر زاہد کی قیادت میں ۸ پنجاب کی ایک کمپنی اور میجر شیر الرحمن کی قیادت میں نصف سکواڈرن ٹینک روانہ کیے۔ ایک بجے دوپہر ۱۲ بجے تقریباً ۳ گھنٹے جاری رہا، بالآخر دشمن بہت ہار بیٹھا اور پسپا ہو گیا۔ دسمبر کی ساری جنگ میں ۷۷ برگیڈ کی یہ پہلی اور آخری لڑائی تھی جو اس نے لڑی۔ خدا کے فضل سے اس میں اسے سرخروئی حاصل ہوئی اور میجر زاہد اور میجر شیر کو ستارہ جرات کا اعزاز ملا۔

دشمن بھاگتے ہوئے اپنی لاشیں بھی وہیں چھوڑ گیا۔ ایک لاش جو ایک بھارتی جرنیل کے بیٹے کی تھی، سڑک کے کنارے یوں پڑی تھی کہ دھڑ سڑک کی ڈھلوان پر تھا اور سڑک کے کنارے میدان کارزاری گرما گرمی میں ہمارا ایک ٹینک اس عرصے کی کھوپڑی کھپتا ہوا گر گیا۔ بعد میں دوران امیری میجر زاہد اور میجر شیر کو اس کی کڑی سزا بھگتنی پڑی۔ ان پر الزام تھا کہ انہوں نے بھارتی لاشوں کو جان بوجھ کر مسخ کیا ہے۔

کشتیا پر برتری حملہ تو ناکام ہو گیا، مگر توپوں اور ٹیاروں کی بمباری زور پکڑ گئی۔ وہ باری باری کشتیا پر چاند ماری کرتے جس سے نقصان کم اور دہشت زیادہ بھلتی۔ ہتھوڑے اور آہرن والی مثال تھی، لیکن ہتھوڑے چلانے والوں کے تھکنے سے پہلے آہرن کی قوت برداشت جواب دے گئی اور برگیڈیئر منظور نے طے کیا کہ وہ ہار ڈنگ پل کے ذریعے دریا کے گنگا پار کر جائیں تو شاید محفوظ ہو جائیں گے۔

انہوں نے ۱۰ اور ۱۱ دسمبر کی درمیانی رات کشتیا کو خیر باد کہا۔ راتوں رات ۷۷ برگیڈ کی بیشتر نفری، گاڑیاں اور جنگی ساز و سامان پل پار کر کے ۱۶ ڈوئیشن کے علاقے میں اتر گیا، مگر اگلی صبح بھارتی فضائیہ نے پل پر بمباری کر کے اسے ناقابل استعمال بنا دیا۔ ابھی تک اگر یہ پل بھارتی فضائیہ سے محفوظ تھا، تو شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ صبح و سالم اس پر قبضہ کرنے کا ارادہ رکھتے تھے، لیکن اب اسے یوں استعمال ہوتے دیکھ کر وہ رہ نہ سکے۔

اب مسئلہ یہ تھا کہ باقی ماندہ نفری دریا کے پار کیسے جائے؟ اس نفری میں صرف فوجی یا نیم فوجی ہی نہیں، بہت سے بنگالی یا بھاری

سولہیں بھی تھے جو پاکستان سے محبت کی وجہ سے پاک فوج کے بغیر اپنی زندگی خطرے میں سمجھتے تھے۔ ان میں بوڑھے، بچے اور عورتیں بھی شامل تھیں۔ اکثر لے اپنے اپنے آٹے چھوٹی چھوٹی گھڑیوں میں باندھ کر بغل میں دبا رکھے تھے۔ ان کو دریا پار کرنے میں کور آف انجینئر کے میجر راٹھور نے بہت کام کیا۔ وہ کشتیوں کے ذریعے انہیں ٹوٹے ہوئے پل سے لے کر اگلے کنارے تک لے جاتے۔ ان کو وہ بوڑھی عورت یاد ہے جو پوہلی بغل میں دبائے شکستہ پل سے سالم کشتی میں اترنے کی کوشش کر رہی تھی۔ پوہلی سنبھالتی تھی، تو خود گرنے کا ڈر تھا اور اپنے آپ کو سچاتی تھی، تو پوہلی ہاتھ سے جاتی تھی۔ ایک فوجی جوان نے اسے سہارا لے کر پوہلی سمیت کشتی میں بٹھادیا اور وہ دعائیں دیتی پار اتر گئی۔

گویا جیسو سیکرٹ میں ہمارے ۹ ڈویژن کا یہ حال ہو گیا تھا کہ اس کا ایک بریگیڈ (۱۰۷) کھلنا کی طرف نکل گیا تھا اور دوسرا (۵۷) دریا پار کر کے شمالی بنگال میں اتر گیا تھا۔ درمیان میں دشمن کے لیے راستہ کھلا تھا کہ وہ جتنی فوج چاہے لے کر مشرق کی طرف پیش قدمی کر جائے۔

چنانچہ اب بھارت نے منگورہ کی طرف توجہ دینی شروع کی۔ اس کا مقابلہ کرنے کے لیے ہمارے پاس ۵۰ پنجاب اور ۳۸ ایف ایف کی وہی نفری تھی جو کرنل آفریدی کالی گنج سے لے کر ڈویژنل ہیڈ کوارٹر کی طرف آگئے تھے۔ اس چھوٹی سی جمعیت کو پہلے منگورہ میں رکھا گیا اور پھر مزید پیچھے ہٹا کر دریائے مادھوتی کے مشرقی کنارے پر تعینات کیا گیا۔ ڈویژنل ہیڈ کوارٹر مزید سپاہیوں کو فرید پور پہنچ چکا تھا جہاں جنرل انصاری مصلے پر بیٹھے اپنے جیالوں کی کالیابی کے لیے دُعا کرتے رہتے تھے۔

ہماری مُٹھی بھر یہ فوج دریائے مادھوتی کے کنارے دشمن کی آمد کا انتظار کرتی رہی مگر دشمن نے اُس کی طرف اُس وقت تک توجہ نہ دی جب تک ۵۷ بریگیڈ کا آخری فرد دریائے گنگا کے پار نہ اتر گیا، چنانچہ دو دن کے وقفے کے بعد دشمن نے ہماری دفاعی پوزیشن پر فائرنگ کی۔ ہمارے جوانوں نے ڈٹ کر فائر کا جواب فائر سے دیا۔ دشمن کو اندازہ ہو گیا کہ سیدھا چڑھ دوڑنے میں خطرہ ہے، لہذا اس نے مکتی باہنی کی مدد سے سات کلومیٹر اُپر جا کر ایک ایسا مقام منتخب کیا جہاں عارضی پل باندھ کر دریا پار کیا جاسکتا تھا، چنانچہ ایک رات کے وقفے کے بعد ہماری دفاعی پوزیشن پر دائیں پہلو سے حملہ کر دیا۔ اس ریلے میں ہمارے تھکے ہارے سپاہیوں کے قدم متر لزل ہو گئے، انہیں وہاں سے ہٹا کر فرید پور پہنچا دیا گیا۔ وہ وہاں ۱۵ دسمبر کو پہنچے اور اگلی صبح دشمن نے ابھی اُن کے نئے دفاعی قلعے پر دستک نہیں دی تھی کہ ڈھاکہ سے اطلاع آئی کہ جنگ بندی کا فیصلہ ہو گیا ہے۔

نالور سیکر (۱۶ ڈویژن)

شمالی بنگال باقی صوبے سے دو دریاؤں یعنی گنگا اور جہنا کے ذریعے کٹا ہوا تھا۔ اس کی مغربی اور شمالی سرحد بھارت سے ملتی تھی۔ رقبے کے لحاظ سے یہ سب سے بڑا سیکر تھا اور اس کی کمان ایک وسیع الجبہ اور وسیع القلب جرنل کے سپرد تھی۔ ان کا نام سب جرنل سید نذر حسین شاہ تھا جو اپریل کے آغاز میں ۱۶ ڈویژن کے جی اوسی بن کر آئے تھے۔ اپریل سے دسمبر تک ٹرینڈوں کی سرکوبی اور عام انتظامی امور کی وجہ سے وہ اپنے علاقے کے چنیے چنیے سے واقف ہو چکے تھے۔

ان کے سیکر کی جغرافیائی خصوصیات یہ تھیں کہ اس کے شمال مشرق میں ایک چھوٹا سا دریا بہتا تھا جسے ٹیٹا (TISTA) کہتے تھے۔ اس دریا کے اُس پار لال منیر ہاٹ کا نشا سا ہوائی اڈہ، کری گرام کارپورے جکشن اور پٹ گرام جیسے اہم علاقے واقع تھے۔ گویا یہ علاقہ بذاتِ خود ایک سیکر یا سب سیکر کی حیثیت رکھتا تھا۔ اس سیکر کی دوسری خصوصیت یہ تھی کہ اس کا شمالی بارڈر کٹا پھٹا تھا۔ سرحد کہیں شرماکر پانچ دس میٹرز تک آتی تھی اور کہیں جراتِ زندانہ دکھا کر پندرہ بیس میٹرز باہر پھیل جاتی تھی۔ نقشے پر یوں معلوم ہوتا تھا کہ کھلے ہاتھ کی انگلیوں کے پور نظر آ رہے ہیں۔ کوئی اونچا، کوئی نیچا۔ ان کی دفاعی اہمیت یہ تھی کہ اگر ہر کٹاؤ کے ساتھ فوجی متعین کیے جاتے تو ۱۶ ڈویژن کا بیشتر حصہ انہی کی نذر ہو جاتا اور اگر انہیں یونہی چھوڑ دیا جاتا، تو کئی باہنی اور اس کے آقا انہیں ماسانی ٹہرپ کر لیتے۔

اس سیکر میں کھلے ہاتھ کی بلند ترین انگلی بھارت کی گردن کو جا چھوتی تھی جو مغربی بنگال / بھارت کو آسام / تریپورہ سے ملاتی تھی۔ اس گردن کا پٹی کی چوڑائی بمثل ۲۵ کلومیٹر تھی جس کے جنوبی کونے پر بھاری سرحد کا بلند ترین اُبھار ٹیٹا (TITALYA) تھا۔ دشمن کو ڈر تھا کہ اگر پاکستان نے ٹیٹا لپے سے بڑھ کر ۲۵ کلومیٹر کی پٹی پر قبضہ کر لیا، تو بھارت کی افواج دو حصوں میں کٹ کر رہ جائیں گی؛ چنانچہ اس نے جنگ سے پہلے ہی ٹیٹا لپے پر قبضہ کر کے اپنے آنے جانے کا راستہ محفوظ کر لیا تھا۔ اسی طرح باقی انگلیوں کے پور بھی اس نے قلم کسے اپنی سرحد سیدھی کر لی تھی۔

اس سیکر کی مغربی سرحد گھوڑے کی کاٹی کی مانند تھی۔ دباؤ والی جگہ پر پٹی کا مقام تھا جس پر سواری کرنے کی بھارت نے بہت کوشش کی۔ اس کا احوال آگے آئے گا۔ پٹی کے شمال اور جنوب میں سرحد پھولے ہوسے پیٹ کی طرح باہر نکل آئی تھی۔ اس حصے یا سب سیکر میں یہی خطرہ تھا کہ دشمن اس دباؤ کو اور دبا کر شمالی بنگال میں گس آئے اور وہاں سے ۴۵ کلومیٹر ڈورا سس سڑک کو کاٹ دے جو شمال اور جنوب میں بلبلے کا واحد ذریعہ تھی۔ اس علاقے میں سڑک کے علاوہ شمالاً جزبائیل کی پیٹری بھی تھی، گروہ پٹی کے مقام پر بارڈر سے اتنی قریب گزرتی تھی کہ ریلوے اسٹیشن کی عمارت ایک ملک میں تھی اور پیٹری دوسرے ملک میں گزرتی تھی۔

مارچ کے بعد حالات خراب ہوتے ہی یہاں سے ریل گاڑیوں کی آمد و رفت معطل ہو گئی تھی۔

باقی سرزمین جو شمال سے پھوٹی اور جنوب کی طرف بڑھتی تھیں شمالی حصے تک محدود تھیں۔ شمالی اور جنوبی علاقوں کو ملانے والی سرزمین بہت کم تھیں۔ یہاں کی سب سے بڑی سڑک ۱۵۳ کلومیٹر لمبی تھی جو رنگ پور کو بوگرہ سے ملاتی تھی، بوگرہ سے ایک سڑک نالور کو نکلتی تھی جہاں جنرل نذر حسین شاہ کا ڈویژنل ہیڈ کوارٹر تھا اور دوسری گلونڈ وگھات کے راستے ڈھاکہ کو جاتی تھی۔

اس علاقے میں دشمن کے عزائم کیا ہو سکتے تھے؟ ایک خیال یہ تھا کہ وہ اپنی گردن کو جسے SILI GURI NECK کہا جاتا ہے، بچانے کے لیے شمال سے حملہ آور ہو گا اور ہماری دفاعی پوزیشنوں کو پیٹتا ہوا جنوب کی طرف بڑھے گا۔ اس مفروضے کی حمایت میں یہ دلیل دی جاتی تھی کہ اس سیکٹر میں دشمن کا سب سے بڑا مسئلہ اپنی گردن کو بچانا اور رابطے کے اس راستے کو محفوظ اور وسیع کرنا ہے جہاں سے چین کی سرحد مثلاً ۷۵ کلومیٹر دور تھی۔ اس راستے کو وسیع کر کے وہ پاکستان اور چین کے درمیان فاصلہ بھی بڑھا سکتا تھا۔ اس مفروضے کی مخالفت میں یہ کہا جاتا تھا کہ اگر وہ شمال سے پیش قدمی کرتا ہوا سو دو سو کلومیٹر بھی آجائے، تو سقوطِ مشرقی پاکستان کا مقصد حاصل نہیں ہو سکتا؛ البتہ اگر اس کا مقصد صرف بنگلہ دیش قائم کرنے کے لیے ایک قطعہ زمین حاصل کرنا ہے، تو یہ حکمت عملی اس کے لیے مفید ہو سکتی ہے۔

دشمن کے عزائم کے متعلق مفروضہ یہ تھا کہ وہ ہلی کے راستے داخل ہو کر سیدھا مشرق کی طرف بڑھے گا تاکہ اس سیکٹر کو دو حصوں میں کاٹ دے اور اوپر والے حصے کو بنگلہ دیش بنالے۔ اس سے اُس کے دو مقاصد حاصل ہو سکتے تھے۔ ایک تو یہ کہ سلیگوری والا راستہ وسیع اور محفوظ ہو جاتا تھا اور دوسرے بنگلہ دیش کے لیے موزوں قطعہ زمین بھی ہاتھ آجاتا تھا جس میں زر خیز زمین کے علاوہ لال منیر ہاٹ کا ہوائی اڈہ، کری گرام، رنگ پور اور دیناج پور کے ریلوے جکشن بھی شامل تھے۔

دشمن کے عزائم کے اس تجزیے کے پیش نظر جنرل نذر حسین شاہ نے اپنے دونوں بریگیڈوں کو اس طرح لگایا کہ دشمن شمال سے جنوب کی طرف باسانی پیش قدمی کر سکے نہ ہلی کے راستے داخل ہو کر شمالی بنگال کو دو حصوں میں کاٹ سکے۔ انہوں نے بریگیڈ انصاری کی قیادت میں ۲۳ بریگیڈ کو رنگ پور میں رکھا اور اس کی نفری شمال، شمال مشرق اور شمال مغرب کے سرحدی علاقوں میں پھیلا دی۔ دوسرا بریگیڈ (۲۰۵) بریگیڈ سیرتھل حسین کی زیر نگرانی بوگرہ میں تعینات کیا اور اس کی قابل اعتبار پلٹن ۴ فریڈیر فورس کو ہلی کے دفاع پر لگا دیا۔ باقی نفری کو ہلی کے شمال اور جنوب میں پھیلا دیا۔ جنگ سے کچھ عرصہ پہلے جو بنگامی بریگیڈ ہیڈ کوارٹر کھڑے کیے گئے تھے، ان میں سے ایک کو راجشاہی میں رکھا گیا۔ اس کی کمان بریگیڈ سیر اشرف کے سپرد تھی جن کی زیر کمان نفری زیادہ تر نیم سگری تنظیموں سے لی گئی تھی۔ اس علاقے میں کوئی ایسی جوبی نہ تھی جو دشمن کی توجہ کو اپنی جانب مبذول کرتی۔ صرف دریائے گنگا میں کشتیوں کے ذریعے داخل ہو کر راجشاہی کے پاس اترنے کی کوشش کر سکتا تھا، مگر کشتیوں پر وہ کہاں تک، ترک، توپیں اور ٹینک لاتا؟ امکان یہی تھا کہ اس حصے میں تند و تیز جنگ نہیں ہوگی۔

جنرل نذر حسین کے دفاعی وسائل میں ایک چیز ایسی تھی جو مشرقی پاکستان میں نایاب تھی یہ تھے ٹینک۔ اس صوبے کی واحد ٹینک رجمنٹ — ۲۹ کیولری — ۱۶ ڈویژن کے پاس تھی جس کی وجہ یہ تھی کہ میدان جنگ کی نبض بچانے والے ماہرین کا خیال تھا کہ اگر مشرقی پاکستان میں کہیں ٹینکوں کی لڑائی ہو سکتی ہے، تو شمالی بنگال میں، کیونکہ یہاں ندی نالے نسبت کم تھے اور کھیتوں میں پانی زیادہ عرصہ نہیں رکتا تھا۔ اس رجمنٹ میں جس کا ہیڈ کوارٹر رنگ پور میں رکھا گیا تھا، ایم ۲۴ ساخت کے

ٹینک تھے جو دوسری جنگ عظیم میں کارہائے نمایاں انجام دینے کے بعد کوریا (۱۹۵۱ء) کی جنگ میں بھی اپنے جوہر دکھانے لگے تھے۔ ان کا ماضی شاندار سی، مگر حال خستہ تھا۔ ان کی ٹرپوں کے دہانے اتنے ملام (GROOVELESS) ہو چکے تھے کہ گولہ پوری شدت سے باہر نہیں نکلتا تھا اور جب نکلتا تھا تو ایک ہزار میٹر سے دُور نہ جاتا تھا۔ ان ٹینکوں کی رفتار بھی عمر کے ساتھ ساتھ مدہم پڑ چکی تھی، مگر بے اولاد گھرانے میں اپنا سچا بچہ بھی بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ ہمیں مشرقی پاکستان میں اس کیولری رجمنٹ پر بڑا فخر تھا۔ یہ ہمارے زور بازو کی علامت تھی جہاں ٹینک ہوتے، جواؤں کے حوصلے بلند تر ہو جاتے۔ جنرل نذر نے اس رجمنٹ کے حصے بخرے کر کے انہیں مختلف جگہوں پر بانٹ رکھا تھا تاکہ زیادہ سے زیادہ علاقے میں ہمارے سپاہیوں کی حوصلہ افزائی اور دشمن کی حوصلہ شکنی ہو۔

اس کے برعکس ہندوستانی رسالہ جدید ترین ٹینکوں سے لیس تھا جس میں ٹی سلسلے (T-56 + T-55) کے روسی ٹینک بھی شامل تھے۔ اس کے علاوہ بھارت کے اپنے کارخانوں میں بنے ہوئے وجنتا (VIJANTA) ٹینک تھے۔ ان دونوں قسم کے ٹینکوں کی مجموعی قوت کے سامنے دوسری جنگ عظیم کے ایم ۴ ٹینک کوئی حیثیت نہ رکھتے تھے۔

جنگ کا اتنا چرچا دیکھنے سے پہلے آئیے ایک نظر اس صورت حال پر ڈال لیں جو جنگ سے پہلے یہاں رونما ہو چکی تھی۔ اس سیکٹر میں بلی دشمن کی آنکھ میں شروع سے کھٹک رہا تھا۔ اس نے اس کے سامنے اپنا ۲۰ ڈویژن رسالے اور توپ خانے سمیت ڈال رکھا تھا اور گزشتہ ستمبر سے اس پر گولہ باری بھی شروع کر رکھی تھی۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ جب کئی باتنی کی کارروائیاں زور پکڑتی گئیں تو اس گولہ باری میں بھی شدت آتی گئی۔ ماہ نومبر میں تو شاید ہی کوئی دن گزرا ہو جب بلی میں گولوں کی بارش نہ ہوتی ہو۔ اس گولہ باری کی آڑ میں کئی بار دشمن نے آگے بڑھ کر بلی پر قبضہ بھی کرنا چاہا، مگر ہر بار ہماری ۴ فریٹیر فورس (۴ ایف ایف) نے اس کے عزائم خاک میں ملا دیے۔

۲۱ نومبر کو جب بھارت نے ہماری سرحدوں کے اندر پاؤں جانے کے لیے سرحدی موڑوں کو ٹرپ (WAR OF SALIENTS) کرنے کی کوشش کی تو اس نے بلی پر بھی دباؤ بڑھا دیا۔ اس کی ایک پلیٹن، ۷ گارڈز نے بلی اور اس کے نواح میں قاسم، ہار، نواپارہ اور ایٹور کی چوکیوں پر تڑپ بول دیا۔ قاسم پوسٹ جو بلی کے شمال میں کوئی دو سو کلومیٹر کے فاصلے پر تھی دشمن نے ذمہ ڈالی۔ وہاں ہمارے دس جوان شہید اور بارہ زخمی ہوئے۔ زخمیوں میں نوجوان پلاٹون کمانڈر بھی شامل تھا۔ یہاں سے دشمن نے ریلوے لائن کے ساتھ ساتھ باہر پوسٹ کی طرف بڑھنے کی کوشش کی، مگر اس کی پیش قدمی کو روک دیا گیا اور دشمن کو بھاری نقصان پہنچا۔ اس کے تین ٹینکوں میں سے صرف ایک ریلوے لائن عبور کر کے ہمارے علاقے میں گھس آنے میں کامیاب ہوا، مگر ایک ٹینک شکن توپ کے گولے نے اسے وہیں بے کار کر دیا۔ دشمن نے کھلی جارحیت کے اس نشان کو کھینچ کر واپس لے جانے کی کوشش کی، مگر ناکام رہا۔ ۲۶ نومبر کو چکن تنگے کی پلیٹ پر جنرل نیازی جن صحافیوں سے ملے، وہ اسی جارحیت کو دیکھنے کے لیے دھاک سے یہاں لائے گئے تھے۔

اگرچہ ۴ ایف ایف نے باہر پوسٹ پر دشمن کی یلغار کو ناکام بنا دیا تھا، مگر اس کا خیال تھا کہ اگر بھارت کی تازہ دم فوج نے اس پر اچانک حملہ کر دیا تو کہیں اس کا حشر بھی قاسم پوسٹ والا نہ ہو۔ چنانچہ وہاں پر متعین پلاٹون (تقریباً ۳۰ آدمی) کو واپس بلا لیا گیا۔ دشمن نے اس چوکی کو خالی پا کر چپکے سے قبضہ کر لیا اور یوں پہلی بار اس کے پاؤں ریلوے لائن کے مشرقی جانب جم گئے۔

آپ کو یاد ہوگا ۲۹ کیوری کے چند ٹینک دریائے گنگا پر ہارڈنگ پل کے پاس رکھے گئے تھے کہ وقت ضرورت دریا کے دونوں جانب استعمال کیے جائیں۔ ملی پر مذکورہ دباؤ پڑا تو ان ٹینکوں کا ایک ٹروپ (۴ ٹینک) یہاں لایا گیا جسے ایف ایف کی ڈی کمپنی کے ہیڈ کوارٹر واقع ڈنگاپارہ میں رکھا گیا۔ بابرپوسٹ سے جو نفری واپس بلائی گئی تھی اسے بھی ڈنگاپارہ میں متعین کیا گیا۔ ڈنگاپارہ سے شمال میں ۳۴ پنجاب (آر اینڈ ایس) کی ایک پلاٹون لگا دی گئی جس کے پاس ٹینک ٹینک تو ہیں تھیں۔ اس طرح وسائل کو مجتمع کرنے کے بعد ہم میں اتنی سکت اچھی تھی کہ ہم دوبارہ حملہ کر کے بابرپوسٹ پر قبضہ کر لیں، مگر اس ارادے میں کامیاب نہ ہو سکے، کیونکہ اسی اثناء میں دشمن نے بھی وہاں اپنی طاقت میں اضافہ کر لیا تھا۔

چنانچہ یہی طے ہوا کہ یہ پوسٹ خالی کرنے کے بجائے اپنی نفری کو یوں متعین کیا جائے کہ دشمن کا پھیلاؤ بڑھنے نہ پائے؛ لہذا دو کمپنیوں کو ہم نے جنوب اور مشرق کی طرف ڈال کر بابرپوسٹ کے گرد حصار باندھ دیا اور تیسری کمپنی (سی کمپنی) کو ریلوے لائن کے پشتے کی مغربی جانب رکھا گیا تاکہ دشمن اس جانب آزادانہ نقل و حرکت نہ کر سکے۔ اس کمپنی کی قیادت ایک جری انفر میجر اکرم کے سپرد تھی۔ نومبر کے آخر میں دشمن نے میجر اکرم کی پوزیشن کو تباہ کر کے اپنے پہلو سے کانسٹانٹانے کی سرٹورز کو کشش کی مگر ناکام رہا۔ ۳ دسمبر کو جنگ کا آغاز ہونے تک میجر اکرم اپنی جگہ ڈٹے ہوئے تھے۔

بھرپور جنگ سے پہلے شمالی سرحد کے ساتھ ساتھ دشمن نے چھوٹے چھوٹے موڑوں، ٹکڑوں اور اٹھاروں کو اپنے قبضے میں لے لیا تھا ان میں ٹیٹالیہ، پٹ گرام اور بڑنگاماری شامل تھے۔ ٹیٹالیہ پر قبضہ کر کے دشمن نے بہار اور آسام کے درمیان سیکڑی کا راستہ ۲۵ کلومیٹر سے بڑھا کر ۵۵ کلومیٹر کر لیا تھا۔ بھارت نے اسی پر اکتفا کرنے کے بجائے مزید جنوب کی طرف پیش قدمی کی تھی اور ۲۸ اور ۲۹ نومبر کی درمیانی رات کو اس نے پانچاگرھ پر اور اس سے اگلے دو روز میں بڑھ کر قبضہ کر لیا تھا۔ یوں دشمن اس علاقے میں ایک اہم قصبے ٹھا کر گاؤں پر دھک دینے لگا۔

اس کے علاوہ اس نے دریائے ٹیٹا (TISTA) کے پار سرحدی چوکیوں کو رفتہ رفتہ پیچھے دھکیل کر ۲ دسمبر تک کڑی گرام اور لال منیر ہاٹ تک پہنچا دیا تھا۔ اس طرف دباؤ پڑنے سے انتہائی مشرقی جانب جو چوکیاں چلماری تک پھیلی ہوئی تھیں، انہیں بھی سیٹ کر کڑی گرام میں اکٹھا کر لیا گیا۔ ۳ دسمبر تک یہی حالت تھی۔

بھرپور جنگ چھڑتے ہی بھارتی فضائیہ نے کڑی گرام اور لال منیر ہاٹ پر گولہ باری میں اضافہ کر دیا۔ اگرچہ یہ دونوں شہر ماہ نومبر ہی سے ان حملوں کو سہہ رہے تھے، مگر ۴ دسمبر کو ان پر قمر کی جو آگ برسی انہوں نے پہلے کسی نہ دیکھی تھی۔ وہاں پڑے رہنے اور مار کھاتے رہنے کا کوئی فائدہ نہ تھا؛ چنانچہ اسی شام ہی اسی (میجر جنرل نذر حسین) نے حکم دیا کہ دریائے ٹیٹا کے پار جتنی افواج ہیں وہ تمام رنگپور میں جمع ہو جائیں۔ سپاہی ۴ اور ۵ دسمبر کی درمیانی رات کو شروع ہوئی اور اگلے روز شام تک جاری رہی۔

فوج کو لپسا ہوتے دیکھ کر مقامی محبت وطن شہری بھی گھروں سے نکل کھڑے ہوئے۔ انہوں نے سوچا کہ پاک فوج کے بغیر وہاں ان کا رہنا موت کو دعوت دینے کے مترادف ہے، کیوں نہ فوج کے ساتھ چلا جائے تاکہ جو اس پر بیٹے کی وہ بھی سہہ لیں گے؛ چنانچہ جو ریل گاڑی ہمارے سپاہیوں کو رنگ پور پہنچانے کے لیے کڑی گرام سے روانہ ہوئی، اس پر یہ لوگ بھی ٹوٹ پڑے۔ اس علاقے میں یہ آخری ریل گاڑی تھی جو متحدہ پاکستان کے دور میں فوج کی زیر نگرانی چلائی جا رہی تھی۔ اس کے انچارج ایک میجر تھے جنہوں نے اس ناقابل فراموش سفر کا حال مجھے یوں بتایا:

”گاڑی میں اکثریت شہری باشندوں کی تھی جن میں سے بیشتر زار و قطار رو رہے تھے۔ پاکستانی سپاہی کھڑکیوں میں سے رائفلوں کی تالیاں باہر نکال کر متوقع حملہ آوروں سے ان کی حفاظت کر رہے تھے۔ گاڑی کا آخری ڈبہ ایک کھلے پلیٹ فارم کی مانند تھا جس کے ارد گرد ریت کی بوریوں کی دیوار کھڑی کی گئی تھی۔ اندر بلکی توپیں (مارٹر) نصب تھیں تاکہ گھمبیر حملے کی صورت میں انہیں استعمال میں لایا جاسکے۔ چلتی گاڑی پر جگہ جگہ باغیوں نے فائرنگ کی جس کا جواب کھڑکیوں سے فائر کر کے دیا گیا، مگر گاڑی کسی رکاوٹ کے بغیر چلتی رہی۔ دریائے ٹیسا پر ریلوے کا پل سامنے نظر آ رہا تھا۔ ہم اسے عبور کرنے والے تھے کہ کچھ ڈور رضا کاروں کا ایک دستہ نظر آیا۔ ہم رُک گئے تاکہ انہیں بھی ساتھ لیتے چلیں۔ ہم نے انہیں بلایا، مگر وہ اپنی جگہ سے نہ ہلے۔ ہم ان کی اہمیت نش لڑکوں کی بے جسی پر حیران آگے بڑھ گئے۔ دریا کو عبور کر کے پل اڑا دیا۔ اس کے بعد انہی لڑکوں نے زور کاغذ لکھایا: ”جئے بنگلہ“ (بنگلہ دیش زندہ باد) دراصل وہ مکتی باہنی کے لوگ تھے جو جاسوسی کی خاطر رضا کاروں کی صفوں میں گھس آئے تھے۔“

۵ اور ۶ دسمبر کی درمیانی رات کو دریائے ٹیسا کے پار کی ساری نفری رنگ پور پہنچ گئی۔ اسی رات بقیہ شمالی سرحد سے بھی ہمارے سپاہی اتنے پیچھے ہٹ آئے کہ ہماری دفاعی لائن رنگ پور اور ٹھاکر گاؤں کی سیدھ میں آگئی۔ ٹھاکر گاؤں پر مزید دباؤ پڑا۔ تو ہم دیناج پور کے شمال میں منڈل پارہ پہنچ گئے۔ منڈل پارہ اور رنگ پور کے درمیان ایک اور سڑک شمالاً جنوباً جاتی تھی جس کے شمالی سرے پر ڈومرو واقع تھا۔ اب ڈومر سے بھی فوجی دستے واپس بلا کر سید پور میں جمع کیے گئے۔ گویا ۶ دسمبر کو ہماری نئی دفاعی لائن رنگ پور، سید پور اور دیناج پور کی سیدھ میں تھی۔ رنگ پور میں تقسیم ۲۳ بریگیڈ اس بات پر بخیر کر سکتا ہے کہ اس نے جنگ کے آخر تک اس دفاعی لائن کو پتھر نہ ہونے دیا۔

دوسری طرف بلی کے مقام پر دشمن نے بھر پور جنگ چھڑتے ہی ہمارے دفاع میں شکاف ڈالنے کے لیے سر توڑ کوششیں شروع کر دیں۔ ۴ ایف ایف جو کئی مہینوں سے دشمن کا ڈٹ کر مقابلہ کر رہی تھی اب بھی اپنے مورچوں میں جی رہی؛ البتہ بلی سے ااکھو میٹر شمال میں چرائی کے مقام پر دشمن کو ہماری پوزیشن میں ایک ملائم مقام مل گیا جس سے وہ فائدہ اٹھا سکتا تھا۔ چرائی میں ابتداءً ہمارے پاس ایک کمپنی تھی (سوسو سوا افراد) مگر نومبر کے آخر میں قاسم پوسٹ والے سانحے کے بعد یہاں سے کچھ نفری ہٹا کر ایک اور جگہ بھیج دی گئی تھی جہاں اس کی زیادہ ضرورت تھی۔ گویا چرائی میں ہماری دفاعی پوزیشن کمزور تھی۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ ہمارے کمانڈروں کا خیال تھا کہ یہاں کسی بڑے بھارتی حملے کی توقع رکھنا عبث ہے، کیونکہ نہ تو وہاں سے کوئی بڑی سڑک پھوٹی ہے جس پر چڑھ کر وہ آگے بڑھ سکے اور نہ اس علاقے میں کوئی ایسا مقام ہے جو جنگی نقطہ نظر سے بھارت کے لیے اہمیت رکھتا ہو۔ مزید برآں عام خیال یہ تھا کہ اس علاقے میں — کم از کم نقشے پر — ایسے دلدلی علاقے ہیں جن سے ٹیکوں کا گزر ناممکن تھا۔

مکتی باہنی اس علاقے کے تمام خدو خال سے واقف تھی۔ اس نے اپنے آقاؤں کو بتایا کہ بلی پر سر پھوڑنے کے بجائے اگر اس کے اوپر یا نیچے قسمت آزمائی کی جائے تو کامیابی حاصل ہو سکتی ہے۔ بھارت نے جب چرائی کا انتخاب کیا، تو مکتی باہنی والوں نے اسے بتایا کہ علاقہ بالکل خشک پڑا ہے اور وہاں پاکستان کی نفری بھی بہت تھوڑی ہے؛ چنانچہ دشمن نے مکتی باہنی کی رہنمائی میں

ایک کمپنی اور چند ٹینک ادھر روانہ کر دیے۔ انہوں نے چرائی کو گھیرے میں لے کر اس کے جنوبی حصے سے آگے بڑھنا شروع کیا وہاں پر موجود پلاٹون کمانڈر نے شام کو اپنے افسر اعلیٰ کو وارٹھیں پر اطلاع دی:

”میرے بائیں جانب سے دشمن کے ٹینک گزر کر رنگ پور / بوگرہ روڈ کی طرف بڑھ رہے ہیں۔“

افسر نے کہا: بیوقوف! یہاں ٹینک کہاں؟ شام کے دُھند لگے ہیں تم نے ہمیں دیکھی ہوں گی۔“

پلاٹون کمانڈر نے عرض کیا: سر، آپ درست ہی کہتے ہوں گے، مگر ان بھینسوں پر سو ملی میٹر دہانے کی توہیں فٹ

ہیں جو ہمارے مورچوں کو ایک ایک کر کے چلتی جا رہی ہیں۔“

اگرچہ دشمن چرائی کو چیر کر آگے بڑھ چکا تھا، مگر اس کو پتہ تھا کہ اس کے جنوبی پہلو میں میجر اکرم اپنی سی کمپنی کے ساتھ موجود

ہے، چنانچہ بھارت نے دو مضبوط دستے شمال اور جنوب کی طرف روانہ کیے تاکہ وہ میجر اکرم کی کمپنی کو دو جیٹروں میں پھنسا کر ختم

کر دیں۔ میجر اکرم نے اپنی دفاعی پوزیشن اس طرح ترتیب دی تھی کہ وہ دونوں طرف سے دفاع کر سکتا تھا، چنانچہ دشمن نے اپنے

حملے کرتا رہا، لیکن میجر اکرم کا بال بیکانہ کر سکا؛ حتیٰ کہ ۶ دسمبر آگیا۔ اس نے مزید ۲۸ گھنٹے دونوں جانب سے سی کمپنی کی پوزیشن پر

پورا دباؤ ڈالا، لیکن بے سود۔ اب ۸ دسمبر ہو چکی تھی اور میجر اکرم کی کمپنی غیر معمولی جرأت کا مظاہرہ کر کے اپنی پوزیشن میں ڈٹی ہوئی

تھی۔ میجر اکرم ایک مورچے سے دوسرے مورچے میں جا جا کر اپنے جوانوں کو شاباش دے رہے تھے۔ اسی کیفیت میں اچانک

ٹینک کا ایک گولہ ان پر آپٹا اور وہ موقع ہی پر جاں بحق ہو گئے۔ ان کی موت کے سنگین صدمے نے ان کے سپاہیوں کو بے حد

متاثر کیا۔ دشمن نے میجر اکرم کی شہادت کے بعد دوبارہ شمال اور جنوب سے سی کمپنی پر بھر پور حملہ کیا جو کامیاب رہا۔ ہمارے جوانوں

کے قدم اکٹڑ گئے۔ صرف چالیس جوان اس معرکے سے سلامت بچ کر پلٹن سے جا ملے۔ میجر اکرم کو بعد از شہادت نشان حیدر

کا اعزاز دیا گیا۔

جب دشمن میجر اکرم سے نپٹ رہا تھا، تو اس کا ایک اور دستہ مشرق کی طرف پیش قدمی کرتا ہوا رنگ پور / بوگرہ روڈ پر

پیر گنج کے مقام پر پہنچ گیا جس کی ہمیں کانوں کان خبر نہ ہوئی۔ ہم ہی سمجھتے رہے کہ لڑائی ابھی سرحد کے ساتھ ساتھ میجر اکرم کے

علاقے میں ہو رہی ہے۔ ۷ دسمبر کی سہ پہر کو میجر جنرل نذر حسین شاہ رنگ پور کا دورہ کر کے آ رہے تھے۔ ان کے ساتھ بریگیڈیئر

تخل حسین اور چند اور افسر تھے۔ جب وہ شمال کی طرف سے آتے ہوئے پیر گنج کا مورڈرنے لگے، تو ان پر اچانک فائر کھل گیا۔

وہ فوراً گاڑیاں چھوڑ کر درختوں کے ایک جھنڈ میں اوجھل ہو گئے۔ جنرل نذر حسین شام نے بعد میں مجھے فاتحانہ انداز میں بتایا: دشمن

کے ٹینک مجھ سے مشکل ۵۰۰ میٹر دور تھے۔ درختوں کے جھنڈے سے ہوتے ہوئے جنرل نذر اور ان کے ساتھی ایک دیہات

میں پہنچے جہاں ایک خداترس بنگالی نے انہیں ایک محفوظ راستے سے رنگ پور جانے والی سڑک پر پہنچا دیا۔

میجر جنرل نذر حسین شاہ کی جیب پر دو ستاروں والی پلیٹ لگی تھی جو وہ وہیں چھوڑ کر بھاگ گئے تھے۔ اس پلیٹ کے اٹنی

طرف تین ستارے لگے تھے تاکہ لیفٹیننٹ جنرل نیازی کی آمد پر بھی اسے استعمال کیا جاسکے۔ بھارتی سپاہی یہ پلیٹ لڑائی کے

طور پر اتار کر اپنے افسروں کے پاس لے گئے، تو وہ تین ستارے دیکھ کر بہت خوش ہوئے کہ انہوں نے لیفٹیننٹ جنرل پر

داؤ مارا ہے۔ انہیں کیا پتہ کہ جب سے بھر پور جنگ کی خبر ریڈیو پاکستان سے نشر ہوئی تھی، جنرل نیازی ڈھاکہ سے باہر

ہی نہیں نکلے تھے۔

جنرل نذر حسین کی گمشدگی کی اطلاع ۷ اور ۸ دسمبر کی درمیانی رات کو ایسٹرن کمانڈ ہیڈ کوارٹر میں پہنچی۔ میں بھی اس وقت وہاں آپریشن روم میں موجود تھا۔ ہم سب کا گمان یہی تھا کہ وہ گرفتار ہو چکے ہیں؛ چنانچہ میجر جنرل جمشید کو (جو سول آرڈ فورسز کے ڈائریکٹر جنرل اور ۳۹ ہنگامی ڈویژن کے جی او سی تھے) اسی وقت پہلی کاپٹر کے ذریعے روانہ کیا گیا تاکہ وہ جنرل نذر کی جگہ ڈتہ واریاں سنبھال سکیں۔ ڈیڑھ دو گھنٹے ٹامک ٹوشیاں مارنے کے بعد جنرل جمشید بے نیل مرام کوئی دو بجے واپس ایسٹرن کمانڈ ہیڈ کوارٹر پہنچ گئے۔ انہوں نے بتایا کہ وہ رات کی تاریکی میں جنرل نذر کے ہیڈ کوارٹر میں اترنے کے تھوڑی دیر بعد اطلاع آئی کہ جنرل نذر حسین شاہ بخیر و عافیت واپس اپنی جگہ پہنچ گئے ہیں۔

یوں جی او سی کو خطرے میں ڈال کر یہ بنیادی معلومات حاصل کی گئیں کہ رنگ پور / بوگرہ روڈ پر دشمن پہنچ چکا ہے۔ اس کا واضح مطلب یہ تھا کہ اگر اس کوئی الفور وہاں سے ہٹایا نہ گیا، تو ۱۶ ڈویژن مستقل طور پر دو حصوں میں بٹ کر رہ جائے گا یعنی ۲۳ بریگیڈ اور رنگ پور میں اور ۲۰۵ بریگیڈ نیچے بوگرہ میں۔ اور اگر ڈویژن تقسیم ہو جائے، تو وہ ڈویژن نہیں رہتا؛ چنانچہ جی او سی نے دو دستے تیار کرنے کا حکم دیا۔ ہر دستے کو ٹاسک فورس (TASK FORCE) کا نام دیا گیا۔ ایک ٹاسک فورس کو اوپر سے حملہ آور ہونا تھا اور دوسری کو جنوب سے۔ بنیادی فلسفہ وہی تھا جو بھارت نے تھیراکرم کی سی پکنی کے خلاف استعمال کیا تھا، یعنی دشمن کو دو جہتوں میں بھینچ کر تباہ کر دینا۔ جنوبی ٹاسک فورس کی قیادت بریگیڈیئر جمل کے سپرد تھی جبکہ شمالی ٹاسک فورس نے کر بریگیڈیئر نعیم کو رنگ پور کی طرف سے حملہ آور ہونا تھا۔ بریگیڈیئر نعیم نومبر کے آخر میں ٹرینڈوں کے تعاقب میں جنوب سے شمال کی جانب جانکلے تھے اور جنگ چھڑنے کے بعد وہیں ٹرک گئے تھے، اڑتالیس قیمتی گھنٹے گزر گئے، مگر کوئی 'جبر' بھی دشمن کے نزدیک نہ پہنچا۔ بریگیڈیئر نعیم سے جب بھی پوچھا گیا، وہ یہی کہتے رہے کہ بس حملے کا پلان بنا رہا ہوں۔ ادھر بریگیڈیئر جمل نے خود جنوبی ٹاسک فورس کی قیادت کرنے کے بجائے ۳۲ بلوچ کے کمانڈنگ آفیسر لیفٹیننٹ کرنل سلطان سے پیرگنج کی طرف جانے کو کہا۔ جب اس میں تاخیر ہوئی، تو بریگیڈیئر جمل نے لیفٹیننٹ کرنل سلطان پر خوب لعن طعن کی؛ یہاں تک کہ ان پر بزوری کا الزام لگایا۔ اس پر لیفٹیننٹ کرنل سلطان کو اتنا طیش آیا کہ وہ فوراً اپنی پلٹن ٹرکوں میں لا کر پیرگنج کی طرف روانہ ہو گئے۔ ان کا خیال تھا پیرگنج سے ذرا ادھر وہ ٹرکوں سے اتر کر پوزیشن سنبھال لیں گے اور فوجی بکھلائی کے مطابق دشمن تک پیش قدمی کریں گے، مگر وہ یہ بھول گئے کہ گزشتہ دو تین دنوں میں دشمن ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھا نہیں رہا، بلکہ اس نے اس دوران میں مزید ٹینک اور پیدل فوج بلا کر اپنی دفاعی پوزیشن کو پیرگنج سے نیچے تک پھیلا دیا ہے؛ لہذا ابھی لیفٹیننٹ کرنل سلطان کی پلٹن ٹرکوں ہی پر تھی کہ دشمن کے ٹینکوں اور پیدل فوج نے ان پر فائر کھول دیا۔ ہراول کمپنی کو دشمن نے ٹھون کر رکھ دیا۔ کرنل سلطان سمیت سب آدمی شہید ہو گئے۔ بقیہ پلٹن سر اسیر حالت میں سپاہیوں نے پر مجبور ہو گئی۔ بریگیڈیئر جمل کو خیال ہوا شاید دشمن ان کا تعاقب کرتا ہوا جنوب کی طرف پیش قدمی کرے گا؛ چنانچہ انہوں نے ۳۲ پنجاب کی ایک ایک کمپنی چند توپوں سمیت ملک کے طور پر روانہ کی۔ دشمن ابھی پیش قدمی کے موڈ میں نہیں تھا۔ وہ پیرگنج سے ذرا جنوب میں پلاس باری کے مقام پر ٹرک گیا تھا۔

دشمن کی نئی پوزیشن کا اثر ۲۰۵ بریگیڈ کی دفاعی پوزیشنوں پر بھی پڑا۔ یعنی اس بریگیڈ کی وہ نفری جو بوگرہ کے شمال مشرق اور شمال مغرب میں پھیلی ہوئی تھی، بے اثر نظر آنے لگی، کیونکہ دشمن بوگرہ کے عین شمال سے حملہ آور ہونے کی تیاریاں کر رہا تھا؛ لہذا

برگیڈیئر تجمل نے شمال مغرب میں ۴ ایف ایف کو تہی میں اپنے پرنے مورچوں سے اکھاڑ کر واپس بلا لیا اور شمال مشرق میں چھوٹی چھوٹی چوکیاں مثلاً پھلچری گھاٹ، بونہ پارا اور گوبند گنج خالی کر دیں۔

دشمن نے بوگرہ / رنگ پور روڈ پر اپنا قبضہ مستحکم کر لیا اور ۱۶ ڈوٹرن جنرل نذر حسین شاہ کی تمام تر عزیمتی کے باوجود مستقل طور پر دو حصوں میں کٹ گیا۔ شمالی برگیڈ رنگ پور / سید پور / دیناج پور تک محدود تھا اور جنوبی برگیڈ بوگرہ کے شمال تک۔ اب دونوں کو اپنی اپنی دفلی علیحدہ علیحدہ بجائی تھی۔ وہ جو فوجی مبصر کہ گئے ہیں کہ ڈوٹرن ایک آرکیٹرکالی مانند ہوتا ہے جس کے تمام ہار موسیقاً کے اشارے پر ہم آہنگ ہو کر بچتے ہیں، یہاں محض کتابی بات معلوم ہوتی تھی۔

اب دشمن کی نظریں بوگرہ پر تھیں جو ایک مشہور شہر اور اہم موصلاتی مرکز تھا۔ جنرل نذر بوگرہ کی جنگ برگیڈیئر تجمل کے سپرد کر کے ناٹور کی طرف سپاہ چکے تھے۔ برگیڈیئر تجمل نے بوگرہ سے ۱۴ کلومیٹر شمال میں مہاستھان کے مقام پر دشمن کے سامنے دفاعی بند باندھنے کی کوشش کی۔ انہوں نے وہاں سٹرک اور سٹرک کے دونوں جانب ۸ بلوچ اور ۳۲ پنجاب کی کپنی لگا دی۔ ۴ ایف ایف جو تہی سے واپس بلائی گئی تھی اسے چند دن آرام دینے کے لیے بوگرہ ہی میں رکھا گیا۔ مہاستھان کا دفاع کرنے والی فورس شمال کی طرف سے آنے والے دشمن کا راہ تکتی رہی اور وہ کتنی باہنی کے بتائے ہوئے راستوں پر چلتا ہوا سٹرک کو چھوڑ کر اس کے مشرقی جانب کھیتوں میں جا نکلا جہاں سے وہ مڑ کر ہماری پوزیشن کے جنوب میں آ گیا۔ ہماری لڑاکا نفری آگے شمال کی طرف تھی اور پیچھے بسالین سید کو اڑ میں کلرک، باورچی اور دوسرا عملہ تھا۔ دشمن نے انہیں اور وہاں پر موجود چند ٹروں کو اپنے قبضے میں لے لیا۔ اس کے بعد اس نے ہماری پشت سے ہم پر حملہ کر دیا۔

میجر ساجد جو ۳۲ پنجاب کی کپنی کے قائد تھے دشمن کے ہتھے چڑھ گئے۔ ان کے خواب و خیال میں نہ تھا کہ دشمن ہماری پشت پر بھی پہنچ سکتا ہے۔ میجر ساجد تو کپڑے گئے، مگر ان کے سپاہی مورچوں میں لڑتے رہے۔ ان میں سے بعض تو سامنے اور پیچھے سے بیک وقت حملے کی تاب نہ لا کر بہت ہار بیٹھے، مگر حوالدار عکداد اپنے مورچے میں ڈنار ہا۔ اس پر دشمن نے تین حملے کیے، لیکن اس نے تینوں سپا کر دیے۔ ہر سپاہی کے ساتھ دشمن کو جانی نقصان بھی اٹھانا پڑا۔ اس پر ہندوستانی میجر نے اپنے قیدی میجر ساجد سے کہا: اس جنوبی کور کو؛ ورنہ ہم اسے مورچے ہی میں روند ڈالیں گے۔ ساجد نے نائل سے کام لیا تو بھارتی افسر نے اپنے سپاہیوں کو حکم دیا کہ وہ مورچے پر حملہ کر کے اسے خاموش کر دیں۔ عکداد اپنے مورچے میں تنہا تھا اس پر حملہ آوروں نے گولیوں کی بوچھاڑ کر دی۔ اس نے جھک جھک کر یہ وار سہا اور جنوبی دشمن آگے بڑھنے لگا اس نے تین آدمیوں کو گولیوں کے ایک برسٹ (بوچھاڑ) سے ڈھیر کر دیا۔

اب بھارتی میجر اور پیرا۔ اس نے ریوالور میجر ساجد کی چھاتی پر رکھتے ہوئے کہا: اسے بند کراؤ؛ ورنہ تمہیں گولی مار دوں گا۔ میجر ساجد نے جو عکداد کی آنکھوں سے اوجھل تھا، زور سے کہا: "عکداد! اب بس کرو۔" اس نے ٹھیٹھ پنجابی میں جواب دیا: "صاحب! اپنا امینیشن مکانی بیٹھے اوتے مینوں آکھنے او بس کر، میرے کول اچھے دو میگزیناں باقی ہن۔" اس نے ہار نہ مانی اور دشمن نے مزید جانوں کی قربانی دے کر اسے مورچے ہی میں ختم کر دیا۔

اے صاحب! آپ اپنا امینیشن ختم کر بیٹھے ہو اور مجھے کتے ہو بس کر، ابھی تو میرے پاس گولیوں کے دو میگزین باقی ہیں۔"

۱۲ دسمبر کو ہم مہاستھان سے پساہوکر بوگرہ کے بیرونی حاشیے پر آگئے۔ گویا اب بوگرہ کے دفاعی قلعے کی جنگ شروع ہونے والی تھی جس کے لیے بریگیڈیئر جمل نے شہر کے چاروں طرف موہچے کھدوا رکھے تھے۔ ہمارے سپاہیوں نے پوریشن سنبھال لی۔ دشمن کے طیارے اور توپیں اوپر سے گولے برساتے رہے اور ہم اپنے مورچوں میں بیٹھے گولہ باری سستے رہے گویا ہتھوڑے اور آہرن والی بات شروع ہوگئی، لیکن یہ خیال غلط نکلا کہ ہمیشہ تھوڑا چلانے والے ہاتھ پہلے تھک جاتے ہیں اور آہرن کی قوت برداشت میں فرق نہیں آتا۔ اس گولہ باری سے جب لوگ شہید اور زخمی ہونے لگے اور عمارتیں مسمار ہونے لگیں، تو حوصلے بھی پست ہونے لگے۔ جتنے آدمی گولوں یا گرنے والی عمارتوں کی اینٹوں کا شکار ہوتے، انہیں ایک عمارت میں جمع کر دیا جاتا تا کہ جب حالات اجازت دیں گے، تو ان کی طرف توجہ دی جائے گی۔

بوگرہ میں قلعہ بند ہونے پر لیفٹیننٹ کرنل سرفراز ملک سے کہا گیا کہ وہ ۴ ایف ایف کی کمان سنبھال لیں، کیونکہ اس کے اصل کمانڈنگ آفیسر عباسی کی جگہ عارضی طور پر لیفٹیننٹ کرنل ممتاز ملک نے کمان سنبھال لی تھی اور وہ اب واپس ایسٹرن کمانڈ ہیڈ کوارٹر جا چکے تھے، کرنل سرفراز ۱۳ اور ۱۴ دسمبر کی درمیانی رات کو اپنی بھری ہوئی نفری کو تلاش کرتے پھر رہے تھے کہ ایک کتے مکان کے برآمدے میں سے گزرتے ہوئے ان کا پاؤں پھسلا۔ انہوں نے مارچ کی روشنی میں دیکھا، تو یہ تازہ انسانی خون تھا جو مکان کے دروازے سے بہتا ہوا برآمدے میں پھیل گیا تھا۔ انہوں نے دروازہ کھولا، تورات کے اندھیرے میں ڈھیر سارے زخمی جوان بے یار و مددگار گراہ رہے تھے۔ ابتدائی مرہم پٹی تو درکنار انہیں ہمدردی کے دو بول بھی میسر نہ تھے۔

ہماری فوج نے بوگرہ میں تین روز تک گولہ باری سی، لیکن اس عرصے میں سپاہیوں کا مورال بہت متاثر ہو چکا تھا۔ ان کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ یوں پڑے پڑے وہ کب تک مارستے رہیں گے اور ان میں سے جو زخمی ہو جائیں گے، وہ کس مکان کی تاریکی میں اپنا خون دیتے رہیں گے۔ جو شہید ہو جائیں گے، ان کی لاشیں کہاں جائیں گی۔

۱۴ دسمبر کا سورج طلوع ہوا، تو دشمن بوگرہ کے شمالی کنارے پر ریلوے کراسنگ تک پہنچ چکا تھا۔ وہاں سے وہ لاؤڈ اسپیکر پر بار بار اعلان کر رہا تھا کہ جنرل نیازی نے ہتھیار ڈال دیے ہیں، جنگ بند ہو چکی ہے۔ آؤ اپنے ہتھیار ڈال دو اور اپنی جان بچاؤ، ناحق خون بہانے کا کیا فائدہ؟ آؤ ہتھیار جمع کرو اور سلامتی کی گارنٹی لو، وغیرہ۔ تعجب کی بات کہ ہمارے سپاہی یہ اعلان سن کر اپنی اپنی رائفل بغل میں دبائے دشمن کی طرف بڑھنے لگے۔

بریگیڈیئر جمل کو خبر ملی، تو وہ ان کالی بھیڑوں کے کردار پر بہت برہم ہوئے۔ انہوں نے کہا کہ اس طرح ہتھیار ڈالنے کا کوئی جواز نہیں۔ اتنے میں ایک اسٹاف آفیسر ان کے پاس جنگ بندی کا پیغام لایا جو ایسٹرن کمانڈ کی طرف سے ابھی ابھی موصول ہوا تھا۔ اس پر بریگیڈیئر جمل نے سپاہیوں کو اپنے حال پر چھوڑا اور خود بوگرہ سے مغرب کی جانب نکل گئے۔ وہ تھوڑی ہی دور گئے تھے کہ کیتی باہنی کے پتھے چڑھ گئے۔ انہوں نے ان کی خوب خیر لی۔ جب وہ قیدی بن کر بھارتی افسروں کے سامنے لائے گئے، تو ان کے بازو کی ہڈی ٹوٹ کر گلے کا ہار بن چکی تھی۔



برہمن باڑیہ سیکٹر (۱۴ ڈویژن)

مشرقی سرحد کبڑے شخص کی طرح تھی۔ اوپر اور نیچے سے آگے کو ٹھکی ہوئی اور درمیان میں پیچھے کو مہٹی ہوئی۔ اوپر کا حصہ سلٹ سیکٹر کہلاتا تھا اور نیچے والا چٹا گانگ اور چٹا گانگ کا پہاڑی علاقہ۔ درمیانی حصے میں کومیلہ اور اس سے ملحق علاقے تھے۔ فوجی ذہنوں کی سوچ یہ تھی کہ اگر برما کی سرحد سے بلا ہوا چٹا گانگ کا پہاڑی علاقہ یا شمال میں سلٹ کا علاقہ ہاتھ سے چلا بھی جائے، تو سقوطِ مشرقی پاکستان کی نوبت نہیں آئے گی، لیکن اگر کوئی حملہ کومیلہ یا اس کے آس پاس سے ہوگا، تو اس کا اثر ڈھاکہ پر پڑے گا۔

زمانہ امن میں (اگر کوئی ایسا زمانہ تھا) مشرقی سرحد کے دفاع کی ذمہ داری میجر جنرل عبدالحمید قاضی کے ۱۴ ڈویژن کے سپرد تھی جس کا ہیڈ کوارٹر ڈھاکہ میں تھا۔ جنرل قاضی نے ایک بریگیڈ کومیلہ میں اور دوسرا اس کے شمال میں برہمن باڑیہ میں ڈال رکھا تھا اور ہنگامی طور پر کھڑے کیے گئے بریگیڈ ہیڈ کوارٹروں میں سے ایک سلٹ میں قائم کیا گیا تھا۔ نومبر کے آخر میں جب جی ایچ کیو نے ایسٹرن کمانڈ کو اطلاع دی کہ بھارت کا زور دار حملہ مشرقی جانب سے ہوگا، تو جنرل نیازی نے چاند پور میں ایک ہنگامی ڈویژنل ہیڈ کوارٹر (میجر جنرل رحیم) کھڑا کر کے کومیلہ والا بریگیڈ اس کے زیرِ کمان کر دیا اور ڈھاکہ میں متعین بریگیڈ بھی کومیلہ کے جنوب میں فیٹی کے مقام پر منتقل کر دیا۔ فیٹی سے پخلا حصہ یعنی چٹا گانگ اور چٹا گانگ کا پہاڑی علاقہ ایک علیحدہ بریگیڈ (مقیم چٹا گانگ) کے سپرد کیا گیا۔ گویا جنگ سے پہلے ہی مشرقی سرحد کے دفاع کی ذمہ داری میجر جنرل قاضی اور میجر جنرل رحیم کے درمیان بانٹ دی گئی۔ جنرل قاضی کے پاس برہمن باڑیہ اور اس کا شمالی علاقہ (مولوی بازار، سلٹ وغیرہ) رہ گیا اور جنرل رحیم کے ذمہ کومیلہ، فیٹی، بلوئیا، لکشم اور چاند پور کے علاقے آئے۔

جنرل رحیم اور ان کے ڈویژن کی کارکردگی کا احوال اگلے باب کا موضوع ہے۔ اس باب میں جنرل قاضی کی دفاعی صلاحیتوں کا ذکر آئے گا۔

جنرل قاضی کے ۱۴ ڈویژن میں تین بریگیڈ تھے۔ ایک مضبوط اور دو کمزور۔ طاقتور بریگیڈ (۲۷) میں ڈھائی پلٹنیں تھیں اور اس کا ہیڈ کوارٹر برہمن باڑیہ میں تھا۔ اس کے کمانڈر بریگیڈیئر سعد اللہ تھے۔ دوسرا بریگیڈ (۲۰۲) جو دو پلٹنوں پر مشتمل تھا، بریگیڈیئر افتخار رانا کی قیادت میں مولوی بازار میں تھا اور تیسرا (ہنگامی) بریگیڈ (۳۱۳) بریگیڈیئر سلیم اللہ کے ماتحت تھا جس کا ہیڈ کوارٹر سلٹ میں تھا۔ اس بریگیڈ میں ایک باقاعدہ انفنٹری پلٹن اور باقی نیم عسکری نفری تھی۔

۱۴ ڈویژن کے دفاعی خطے کے پیچھے غلیم دریائے میگنا بہتا تھا جو ڈھاکہ کے لیے مشرقی ضلع کا کام دیتا تھا جس کا مطلب یہ

تھا کہ دشمن کو پہلے ۱۴ ڈویژن کی دفاعی لائن کو توڑنا ہوگا اور پھر پورے جنگی ساز و سامان سمیت اس وسیع دریا کو پار کرنا ہوگا۔ پھر کہیں وہ ڈھاکہ پر دستک دینے کے قابل ہوگا۔ خیال تھا کہ وہ ڈھاکہ پر دستک دینے سے پہلے اگر تالا (تری پورہ) کی طرف پیش قدمی کر کے اکھوڑا برہمن ہاڑیہ آٹو گنچ اور بہراب بازار کاؤنچ کرے گا، لہذا جنرل قاضی نے نہ صرف بریگیڈیئر سعد اللہ اور ان کے ۲۷ بریگیڈ کو مذکورہ خطوط پر متعین کیا، بلکہ اپنا ٹیک ہیڈ کوارٹر (۱۴ ڈویژن) بھی وہیں منتقل کر دیا۔

۲۷ بریگیڈ کے زیر نگرانی سرحد کو میلا کے شمال میں سالہ ندی سے شروع ہو کر مولوی بازار کے جنوب میں اکھولا کے مقام پر ختم ہوتی تھی۔ یوں کل سرحدی لمبائی ۴۸ کلومیٹر بنتی تھی جس کے دفاع کے لیے بریگیڈیئر سعد اللہ کے پاس ڈھائی انفنٹری پلٹینیں، ۱۰ توپیں (فیلڈ) چارٹنک اور ایک پلاٹون (آر ایڈ ایس) تھی۔ انہوں نے انفنٹری پلٹنوں میں سے ۱۲ ایف ایف کو اکھوڑا میں متعین کیا اور ۲۳ پلوج اور (ناممکن) ۲۱ آزاد کشمیر رجمنٹ کو بالترتیب اس کے جنوب اور شمال میں لگا دیا۔

دوسرے سیکٹروں کی طرح یہاں بھی جنگ ۳ دسمبر سے پہلے شروع ہو چکی تھی۔ اس علاقے میں بھارت کی توجہ اکھوڑا پر مرکوز تھی جو پٹانگانگ سے سلٹ جانے والی ریلوے لائن پر واقع تھا۔ اس مقام کو منتخب کرنے کی شاید ایک وجہ یہ بھی تھی کہ یہاں سے اگر تالا تک چند کلومیٹر دور تھا۔ بھارت کی مسلسل جارحیت کے سبب اکھوڑا کا ذکر اکتوبر کے اوائل ہی میں اخباروں میں آنے لگا تھا۔ ریڈیو ایسٹن کئی بار ہمارے ہاتھوں سے گیا اور کئی بار واپس آیا۔ بار بار مالک بدلنے سے ریل کی پٹریاں اور ریلوے اسٹیشن کی کوٹھڑیاں خستہ ہو چکی تھیں۔

۲۱ نومبر کو بھارت نے سرحدی موٹروں اور اُبھاروں کو ہٹ کر کرنا (WAR OF SALIENTS) شروع کیا تو اس نے اکھوڑا اور اس کے ملحقہ علاقے پر خصوصی توجہ دی۔ اس نے اکھوڑا کو فائرنگ اور جوابی فائرنگ میں مصروف رکھا اور اس کے جنوب اور شمال سے سرحدی چوکیوں کو مکتی باہنی کی مدد سے گھیرے میں لے لیا۔ اکھوڑا کو آزاد کرانے میں دقت یہ تھی کہ اگر سامنے سے پیش قدمی کرتے تو مکتی باہنی اور ان کی اعانت کرنے والی توپوں کا سامنا کرنا پڑتا اور اگر پہلو سے ان کے پیچھے جانے کی کوشش کرتے، تو سرحدوں کی خلاف ورزی ہوتی جس کی اجازت نہ تھی (ہم ۳ دسمبر کی سپریم سیرٹیک کے سرحدوں کے تقدس کے قائل تھے)۔

جب دشمن کو یقین ہو گیا کہ ہم اس چوکی کو آزاد کرانا تو درکنار اسے کھک بھی نہیں پہنچا سکتے، تو اس نے ۳۰ نومبر کو اکھوڑا اور اس سے ملحقہ مورچوں پر تکرار دیا۔ ہماری ایک پلاٹون موچے چھوڑ کر جاگ آئی اور دشمن نے اس چوکی پر اور اس کی پشت پناہی کے لیے رکھی گئی ہماری اکلوتی توپ پر قبضہ کر لیا۔ ہمیں اس سانحے کا اندازہ تب ہوا جب اس چوکی سے ہمارا مواصلاتی رابطہ بھی ٹوٹ گیا۔ ایک لیفٹیننٹ کو ذاتی طور پر صورت حال کا جائزہ لینے کے لیے روانہ کیا گیا، تو اسے راستے میں پسا ہوتے ہوئے سپاہی ملے۔ اس نے انہیں دوبارہ اپنے مورچوں میں بھیج دیا اور خود واپس چلا آیا۔

اکھوڑا کے جنوب میں گنگا ساگر، ملک باری اور لانا سر کی چوکیاں تھیں۔ یکم دسمبر کو دشمن کی گولہ باری سے ان سرحدی چوکیوں سے ہمارے سپاہی اکھر گئے۔ اب ان سے بھی مواصلاتی رابطہ منقطع ہو گیا۔ اس مرتبہ ایک لیفٹیننٹ کے بجائے میجر جنرل قاضی نے انہیں واپس اپنے اپنے گونسلے میں بٹھایا۔

جب جنرل قاضی اور بریگیڈیئر سعد اللہ کی تمام تر توجہ اس بات پر مرکوز تھی کہ اکھوڑا اور گنگا ساگر کے گرد و نواح میں ہم کس طرح سرحدی چوکیوں کو مستحکم کریں، بھارتی سپاہی۔ مکتی باہنی کی رہنمائی میں۔ کیتوں سے ہوتے ہوئے اکھوڑا سے پیچھے ہمارے شاہین ہیڈ کوارٹر

کے پاس آنکے۔ اس نئی صورت حال سے نپٹنے کے لیے کوئی اضافی نفری دستیاب نہ تھی؛ چنانچہ ۱۴ ڈویژن ہیڈ کوارٹر کے کلکوں، ملٹری پولیس کے جوانوں اور اربوں اور چار ٹینکوں کی مدد سے اس بھارتی فوج پر حملہ کیا گیا۔ یہ بھارتی سپاہی جو چوروں کی طرح چھپتے چھپتے سرحد پار کر آئے تھے ابھی تک 'چور ذہنیت' سے نہیں نکلے تھے۔ انہوں نے جب دیکھا کہ ان کی چوری پکڑی گئی ہے اور ٹینکوں سمیت ان پر حملہ کر دیا گیا ہے، تو وہ بھاگ نکلے۔ دشمن بھاگ بھاگ میں اپنی چند لاشیں بھی چھوڑ گیا جن میں سے ایک بھارتی توپ خانے کے ایک نوجوان آبزور (دیدبان) کی لاش تھی جس کے قبضے سے نکلنے والے فوجی نقشوں سے پتہ چلتا تھا کہ دشمن اکھوڑا کے پیچھے واپس ٹیٹاس (TITAS) کے پل پر قبضہ کرنا چاہتا تھا تاکہ ہم اکھوڑا سے سپاہ ہوتے وقت اس پل کو اڑا کر دشمن کی راہ میں رکاوٹ نہ پیدا کریں۔

۳ دسمبر کو جب کھلی جگہ کا آغاز ہوا، تو بریگیڈیئر سعد اللہ نے اپنے جی اوسی کی منظوری سے اپنی دفاعی پوزیشنوں کو از سر نو ترتیب دیا۔ انہوں نے سرحدی چوکیوں سے نفری میٹ کر ٹیٹاس پل کے اس پار متعین کر دی اور یہ طے کیا کہ اگر ہمیں یہاں سے بھی سپاہ ہونا پڑا، تو اس پل کو اڑا کر پیچھے ہٹیں گے، لیکن دشمن نے جب یہاں بھی ہم پر بھر پور یلغار کی، تو ہم سپاہ تو ہونے، مگر جلدی میں پل تباہ نہ کر سکے نتیجہ یہ کہ دشمن ہمارے پیچھے بخیر و عافیت پل پار کر آیا۔ ہم وہاں سے جو ہٹے، تو ۱۴ کلومیٹر پیچھے برہمن بارڈر آکر رُکے جو اس سیکٹر میں مضبوط مقام (STRONG POINT) سمجھا جاتا تھا۔ یہاں پندرہ دن کے لیے راشن اور گولہ بارود موجود تھا۔

اب ہم برہمن بارڈر میں دشمن کے حملے کا انتظار کر رہے تھے، مگر اس نے ہماری توقعات پوری کرنے کے بجائے وہی لہر اپنایا جو وہ اب تک اپناتا آرہا تھا۔ اس نے کئی باہنی کی مدد سے پہلوؤں کی طرف پیش قدمی کر کے ہمارے عقب میں آنے کی کوشش کی۔ ہم نے اس چال کو ناکام بنانے کا علاج یہ سوچا کہ گھیرا مکمل ہونے سے پہلے ۱۳ کلومیٹر مزید پیچھے ہٹ گئے۔ اب ہم دیرائے میگنا کے مشرقی کنارے آشوگنج کے مقام پر تھے اور بھر پور جنگ کا پانچواں دن (۸ دسمبر) تھا۔ اس مرتبہ دشمن نے اُندھاؤندہ ہمارا تعاقب نہ کیا اور ہم آشوگنج میں مورچے وغیرہ کھودنے میں کامیاب ہو گئے۔

اس سپاہی کی وجہ سے جنرل قاضی (۱۴ ڈویژن) کا ٹیک ہیڈ کوارٹر برہمن بارڈر سے ہٹ کر دیرائے میگنا کے مغربی کنارے بہرا ب بازار میں منتقل ہو چکا تھا۔ سپاہیوں نے جب جنرل قاضی اور اس کے ہیڈ کوارٹر کو دیرائے میگنا کے پار جاتے دیکھا، تو انہوں نے سوچا کہ امان ہے تو دیرائے میگنا کے مغربی کنارے پر مشرقی جانب تو سامنے سے دشمن کا دباؤ پڑے گا اور پیچھے دریا ہو گا، ہم کہاں جائیں گے۔ گویا فرنٹ لائن میں ڈویژنل ہیڈ کوارٹر (ٹیک) سے جہاں سپاہیوں کے مورال پر اچھا اثر پڑتا ہے، وہاں اس کی سپاہی سے ان کے حوصلے پست بھی ہو جاتے ہیں۔

آشوگنج کا دفاع منظم کرتے وقت بریگیڈیئر سعد اللہ نے مشرقی اور جنوبی سمتوں پر خاص توجہ دی، کیونکہ دشمن کے حملے کی توقع انہی اطراف سے کی جاسکتی تھی۔ شمالی جانب دشمن کی کوئی ٹوٹ فوٹ موجود نہ تھی؛ چنانچہ اس طرف صرف نیم عسکری فورس (سول آرمڈ فورسز) کو متعین کیا گیا۔ ان کے ساتھ باقاعدہ فوج کے ٹھی بھر سپاہی لگائے گئے تاکہ انہیں حوصلہ رہے کہ فوج ہمارے ساتھ ہے۔

۹ دسمبر کی صبح کو خبر ملی کہ دشمن شمال مشرق سے پیش قدمی کر رہا ہے۔ یہ خبر سراسر خلاف توقع تھی، مگر احتیاطاً توپوں کا رخ ادھر موڑ دیا گیا تاکہ وہ ہماری نسبت کمزور نفری کی حمایت میں گولے برسائیں۔ خوش قسمتی سے ابھی ان توپوں کے دہانے نہیں کھلے تھے کہ دشمن پیدل چلتا ہوا سامنے آ گیا۔ دو درہن سے اُسے پہچاننے کی کوشش کی گئی، تو پتہ چلا کہ یہ اپنی سول آرمڈ فورسز کی نفری ہے جو بندوقیں کندھوں سے

نکلنے دیا کے کناے واپس آرہی ہے۔ ان کا کنا تھا کہ اُس طرف دشمن موجود ہے اور اُس کے پاس ہتھیار بھی ہیں۔ انہوں نے سوچا کہ وہ اپنی تھری ناٹ تھری کی رائفلوں سے اس کا کیا مقابلہ کریں گے، چلو واپس چلیں۔

اس نیم عسکری تھری کے پیچھے کئی فوج کا دستہ آنا دکھائی دیا۔ سوچا کہ جب یہ سپاہ ہونے لگی تو ہمارے ٹیپو بھڑی بھی ان کے نقش قدم پر واپس آئے ہوں گے، مگر دور میں ان کی وردیوں کا رنگ خاک کے بجائے سبز نظر آیا۔ سبز وردی بھارتی سپاہیوں کی تھی۔ جب تک ان کی شناخت ہوئی وہ ہمارے بریگیڈ ہیڈ کوارٹر سے بہت قریب پہنچ چکے تھے۔ جگہ میں ہیڈ کوارٹر سے بھارت بھارت کی تھری اکٹھی کر کے پیش قدمی روکنے کی کوشش کی اور مشرقی جانب متین فوج کو اطلاع دی گئی کہ وہ جلدی جلدی باقاعدہ فوج کے دستے بھیجیں، کیونکہ آٹو گن خطرے میں ہے۔ مگر ان دستوں کے آنے سے پہلے ہی بھارت بھارت کی تھری نے حملہ آوروں کو مار بھگایا نہ صرف مار بھگایا، بلکہ بہت دور تک ان کا تعاقب کیا۔ دشمن نے بھی پیچھے ہٹ کر، کھینے کی زحمت نہ کی کہ تعاقب کرنے والی تھری کتنی ہے۔ وہ اپنے پیچھے کئی لاشیں اور سات بیٹک صبح سالم حالت میں چھوڑ گیا۔ قدم قدم پر سپاہ ہونے والی پاک فوج کے لیے یہ پہلا معرکہ تھا جس میں اس نے دشمن کو اس افراتفری میں فرار ہونے پر مجبور کر دیا تھا۔ یہ واقعہ ہمارے سپاہیوں کے لیے نامک ثابت ہوا۔

۲۴ بریگیڈ اسی آٹو گن ہی میں تھا کہ جنرل قاضی نے ہر اب بازار میں بیٹھے بیٹھے دریائے میگنا پر عظیم آہنی پل کو اڑانے کا حکم دے دیا۔ حکم کی فوراً تعمیل کی گئی۔ دریا کے مشرقی کناے سپاہیوں نے شہیر دریا میں گرتے دیکھے، تو ان کے حوصلے بھی گرنے لگے۔ وہ اس میں اسٹیز نظر کو بے بسی سے دیکھتے رہے۔ وہ پل اڑانے کی حکمت سمجھنے سے قاصر تھے۔

جی اوسی کے اس حکم کی اب دو توجیہات پیش کی جاتی ہیں۔ ایک یہ کہ یہ طارقی کی کشتیاں جلانے کے مترادف تھا، یعنی مشرقی کناے پر متین ہمارے سپاہیوں کو پتہ چل جائے گا کہ اب مزید سپاہی کا کوئی امکان نہیں اس لیے اب یہیں آخری دم تک لڑنا ہے۔ دوسری وجہ یہ بتائی جاتی ہے کہ جی اوسی کو یہ اندیشہ تھا کہ دشمن کا وہ فوجی دستہ جو اپنا ہتھیار شمال کی جانب سے آٹھکھا اور حقیقت پل پر قبضہ کرنے آیا تھا جسے بروقت کارروائی سے پہلے کر دیا گیا تھا، لیکن عین ممکن ہے اگلا ریل اپنے مقصد میں کامیاب ہو جائے (افسوس!) دوسرے مفروضے کی کسی ذریعے سے تصدیق نہیں ہو سکتی۔

پل گرنے کے بعد ۲۴ بریگیڈ مشرقی کناے پر اپنے آپ کو غیر محفوظ محسوس کرنے لگا۔ اس نے سوچا اگر دشمن کے دباؤ کے تحت اسے سپاہ ہونا پڑا، تو دریا پار کرنا مشکل ہوگا، اس لیے بہتر یہ ہوگا کہ جو ہمت نصیب ہے، اُس سے فائدہ اٹھایا جائے اور غیر عافیت ہر اب بازار پہنچا جائے، لہذا ۱۱ اور ۱۱ دسمبر کی درمیانی رات کو اس نے جتنی اور جیسی بھی کشتیاں دستیاب ہو سکیں ان کے ذریعے دریا عبور کیا اور جنرل قاضی کے پاس پہنچ گیا۔

اگلے روز ہر اب بازار میں دفاعی انتظامات مکمل کیے گئے۔ یہاں دو ہفتوں کا راشن اور ایمونیشن موجود تھا۔ جنرل قاضی اور بریگیڈیئر سعد اللہ نے جنگ کے باقی دن پُر امن طریق پر یہیں بسر کیے۔ جنگ کے آخری دنوں میں دشمن نے ہر اب بازار سے کوئی ۱۵ کلومیٹر جنوب میں رٹے پور اور زنگدی کے علاقے میں پہلی کاپٹر کے ذریعے فوج اتارنا شروع کر دی جو ڈھاکہ کے لیے خطرے کا باعث بن سکتی تھی، مگر ہر اب بازار کے محافظوں نے اسے چھڑنا مناسب نہ سمجھا، کیونکہ یہ علاقہ اس سیکٹر میں شامل نہیں تھا۔ یہ جتنی ۲۴ بریگیڈ کی کارگزاری جو اس نے اپنے جی اوسی کی سرپرستی میں اس سیکٹر کے اہم ترین حصے میں انجام دی۔ اب آئیے اسی ڈویژن کے دوسرے دو بریگیڈوں کی طرف جو مولوی بازار اور سلٹ میں تھے۔

بریگیڈیئر سدا شدہ کے بریگیڈ کے شمالی جانب بریگیڈیئر افتخار رانا کا ۳۱۳ بریگیڈ تھا جس کے پاس ۳۰ ایف ایف اور ۲۲ بلوچ نامی دو پلٹنیں تھیں جن کی نفری سرحدی علاقے میں کمال گنج سے لائونٹیک پہلی ہوئی تھی۔ جس طرح ۲۴ بریگیڈ میں اکھوڑا پڑو دشمن نے خاص توجہ دی تھی، اسی طرح اس بریگیڈ میں دلانی کی سرحدی چوکی اس کی آنکھ میں کھسکتی تھی۔ اس چوکی کے دفاع کی ذمہ داری ۳۰ ایف ایف کے ایک دستے کے سپرد تھی۔ بھارت نے شروع اکتوبر ہی سے اس پر گولہ باری شروع کر دی تھی اور کئی باہمی نے بھارتی سپاہیوں کی مدد سے کئی بار اس پر قبضہ کرنے کی کوشش کی تھی، جس کے پیش نظر یہاں کی نفری ایک پلاٹون سے بڑھا کر ایک کمپنی کے برابر کر دی گئی تھی۔ دشمن کا طریقہ واردات یہاں بھی وہی تھا جو وہ کامیابی سے دوسرے سیکٹروں میں آزما چکا تھا، یعنی سلمنے سے فائرنگ کر کے چوکی کو مصروف رکھنا اور پہلوؤں سے پیش قدمی کر کے اسے گھیرے میں لے لیا۔ اس نے کوئی چار ہفتے یہ حربہ آزمایا، مگر اسے کامیابی نہ ہوئی، بالآخر ۳۰ اکتوبر کو وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہو گیا۔ دلانی پوسٹ سے ہمارا رابطہ ٹوٹ گیا۔ ہم نے اسے گنگ پہنچانے اور آزاد کرانے کی کوشش کی، مگر ناکام رہے۔ اس دوران میں ہمارے محصور سپاہی بڑی جرأت و جواںمردی سے اپنے مورچوں میں ڈٹے رہے۔ ۳۰ ایف ایف کے چوں سال اور جواں ہمت سیکنڈ ان کمانڈ (نائب سپہ سالار) میجر جاوید نے یہ حالت دیکھی، تو اس نے سوچا کہ یوں محصور سپاہیوں کو دشمن کے رحم و کرم پر چھوڑ دینا جو انہوں نے کے خلاف ہے۔ اس نے پلٹن کے چیدہ چیدہ ۸ سپاہی (جو رضا کارانہ طور پر میجر جاوید کا ساتھ دینے پر تیار ہو گئے تھے) اکٹھے کیے اور جنوبی سمت سے دلانی پوسٹ کی طرف پیش قدمی شروع کر دی۔ دشمن کا ایک دیدبان (OBSERVER) درخت پر بیٹھا اس جرأت مندانہ پیش قدمی کا نظارہ کر رہا تھا۔ جب یہ درختوں سے مکمل کر دلانی پوسٹ کے قریب پہنچے تو دشمن نے توپ کے گولے برسانے شروع کیے۔ ایک گولہ میجر جاوید کے پاس پھٹا اور اس کے ٹکڑے اس کے جسم میں بیوست ہو گئے۔ وہ منہ کے بل گرا اور وہیں شہید ہو گیا۔ اسی طرح اس کے ساتھی بھی کھیت ہے۔ دلانی پوسٹ کا مقدر پہلے کی طرح حلق رہا۔

یہ پہلا موقع نہ تھا کہ ۳۰ فرنٹیر فورس (ایف ایف) کو اتنے بہادروں کا نقصان اٹھانا پڑا۔ وہ اس سے پہلے اور بعد میں بھی بے دریغ قربانی دیتی رہی۔ سرکاری اعداد و شمار کے مطابق ۳ نومبر تک اس کے ۱۶ اہلکار قربان ہو چکے تھے جن میں دو افسر تین جو نیر کیشند افسر اور ۹ سپاہی شامل تھے۔ باقی شہیدوں کا تعلق رضا کاروں اور سول آرڈ فورسز سے تھا جو اسی پلٹن کے ساتھ فرائض انجام دے رہے تھے۔

بریگیڈیئر رانا نے اپنے جی اوسی (میجر جنرل قاضی) اور کمانڈر ایسٹرن کمانڈ (لیفٹیننٹ جنرل نیازی) کی خدمت میں عرض کیا کہ دلانی پوسٹ چھڑانے کا ایک ہی طریقہ ہے کہ سامنے سے حملہ کرنے کے بجائے اس سے چند کلومیٹر شمال یا جنوب میں بین الاقوامی سرحد پار کر کے پوسٹ کے پیچھے پہنچا جائے تاکہ دشمن ہمیں اپنا پٹ پر دیکھ کر دلانی سے پیچھے ہٹنے پر مجبور ہو جائے۔ انہوں نے اس مقصد کے لیے ۳۲ بلوچ، ۳۰ ایف ایف اور ۳۹ بلوچ سے تھوڑی تھوڑی نفری مستعار لے کر ایک جمعیت یا فورس کھڑی کر لی اور طحہ علاقوں سے دو توپیں (فیلڈ) اور چار مارٹریں (ہلکی توپیں) بھی جمع کر لیں۔

جنرل نیازی نومبر کے اوائل میں وہاں دورے پر گئے۔ جنرل قاضی کی موجودگی میں بریگیڈیئر رانا نے انہیں اپنی اسکیم کی تفصیلات بتائیں، مگر جنرل نیازی نے حکم دیا کہ بین الاقوامی سرحد کسی قیمت پر پار نہ کی جائے، البتہ اگر بریگیڈیئر رانا اپنی اضافی جمعیت کے زور پر یا کسی اور طریقے سے دلانی پوسٹ کو آزاد کر سکیں، تو انہیں اجازت ہے، چنانچہ اس فورس کو تین حصوں میں تقسیم کر کے سامنے اور پہلوؤں سے حملہ کیا گیا



جو ناکام رہا جس سے ڈلائی کے حساب میں ہمارے نقصانات میں مزید اضافہ ہو گیا۔

یہ دقیقیں ۳۰ ایف ایف کے علاقے میں پیش آرہی تھیں۔ اس کے شمال میں ۲۲ بلوچ تھی جو لاٹھ کھورا اور شمیر نگر کے سرحدی علاقوں میں پھیلی ہوئی تھی۔ یہاں دشمن نے ڈلائی کی طرح ایک پوسٹ پر توجہ مرکوز کرنے کے بجائے سرحد کے ساتھ ساتھ تمام ہیچ و خم کو زور بازو سیدھا کرنے کی کوشش کی۔ یکم دسمبر کو اس نے سرحدی علاقوں سے آگے بڑھ کر شمیر نگر کے مشرق میں ایک رکاوٹ کھڑی کر دی۔ اس کا پتہ اس طرح چلا کہ اس علاقے سے گزرتے ہوئے راج نگر کی چوکی سے بریگیڈیئر رانا پرنا نگر ہوئی۔ وہ بخیریت واپس آگئے۔ اگلے روز اطلاع ملی کہ دشمن نے شمیر نگر پر حملہ کر دیا ہے۔ اس سے بریگیڈیئر کمانڈر کو تشویش ہوئی، کیونکہ شمیر نگر اس علاقے کا نہ صرف اہم قصبہ اور مواصلاتی مرکز تھا، بلکہ اس کے ہاتھ سے نکل جانے کا مطلب یہ تھا کہ اس سے مشرق کا سارا علاقہ دشمن کے تسلط میں چلا جائے گا؛ چنانچہ قحاک سے فضائی مدد مانگی گئی۔ دو سیر پٹیارے فوراً آن پہنچے، مگر شمیر نگر اور اس کے مشرق میں انہیں دشمن کا کوئی نام و نشان نظر نہ آیا۔ جہاز کوئی گولی چلائے بغیر واپس چلے گئے۔

فضائیہ کی بے اثر پروازوں سے کم از کم اتنا تو پتہ چل گیا کہ ابھی تک دشمن نے شمیر نگر پر قبضہ نہیں کیا تھا، لیکن وہ اس کے مشرق میں ایک سرحدی پوسٹ کو روند چکا تھا جس کے بائے میں بتایا جاتا ہے کہ وہاں سینکڑوں ٹیلیفون ٹائمیر آخری وقت تک چلا چلا کر اپنے سپاہیوں سے کہ رہا تھا: دیکھو وہ واپس جا رہے ہیں۔ تم اپنی پوزیشن میں جمے رہو دشمن جا رہا ہے۔ اس کی آواز کا کوئی اثر نہ ہوا اور اس نے اپنی پوسٹ ہی میں جان دی۔

یہ بات عام طور پر کہی جاتی تھی کہ سرحدی چوکیوں سے ہمارے سپاہیوں کے قدم اکھڑنے کی بڑی وجہ یہ تھی کہ ان کے ساتھ نیم عمر کی تنظیموں کے افراد بھی متعین تھے۔ جب گولہ باری ہوتی یا دشمن کا دباؤ بڑھتا، تو سب سے پہلے یہ نفری بدکتی۔ ان کے ہٹنے سے نہ صرف مورچوں میں ہتھیار بند افراد کی تعداد کم ہو جاتی، بلکہ سپاہیوں پر بھی اس کا ناخوشگوار اثر پڑتا۔ ان میں بھی اپنی جان بچانے کا جذبہ عموماً آتا۔ فوجی مبصرین اس سے یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ اگلی صفوں میں نیم عمر کی تنظیموں کے افراد کو باقاعدہ فوج کی نفری کے دوش بدوش کبھی متعین نہیں کرنا چاہیے۔

یہ تھی بریگیڈیئر رانا کے زیر نگرانی سرحدی علاقے کی حالت جب ۳ دسمبر کو بھر پور جنگ شروع ہوئی۔ انہوں نے اعلان جنگ ہوتے ہی پہلا قدم یہ اٹھایا کہ دونوں پلٹنوں (۳۰ ایف ایف اور ۲۲ بلوچ) کو اپنے بریگیڈ ہیڈ کوارٹر اور ڈویژن کے مضبوط مقام (STRONG POINT) مولوی بازار میں طلب کر لیا۔ ۳۰ ایف ایف کی زیادہ تر نفری سرحدی علاقوں سے سمٹ کر مولوی بازار پہنچ گئی؛ البتہ اس کی ایک کمپنی جو استھان جنوب میں تھی اسے اپنے قریب ۲ بریگیڈ (بریگیڈیئر سدا اللہ) کے ساتھ بل جانے کی اجازت سے دی گئی۔ ۲۲ بلوچ تک جب مولوی بازار پہنچنے کے احکام پہنچانے کی کوشش کی گئی تو پتہ چلا کہ اس سے مواصلاتی رابطہ ہی منقطع ہو چکا ہے۔ قدرتی طور پر تشویش لاحق ہوئی کہ لاٹھ کھورا، کامت نگر، خوری، کھورا اور مرزا پور کے علاقوں میں بکھری ہوئی نفری کو کیا ہوا۔ کیا وہ سب نابود ہو گئے؟ اگر ان میں سے کچھ لوگ بچ گئے ہیں تو انہیں کس طرح محفوظ مقام پر لایا جاسکتا ہے؟

خاصی دیروائیس پڑھیلو، ہیلو کی مشق کی گئی۔ بڑی مشکل سے پلٹن کی ایک کمپنی سے رابطہ قائم ہوا وہ بھی اتنا قیہ طور پر۔ پتہ چلا اس کا ایک گروہ لاٹھ میں جمع ہے دوسرا فخر گنج میں اور تیسرا سلٹ روانہ ہو گیا ہے۔ آخر کار بٹالین ہیڈ کوارٹر سے بھی مواصلاتی رابطہ قائم ہو گیا جو کھورا سے ۱۶ کلومیٹر دور چائے کے ایک باغ میں تھا۔ بٹالین ہیڈ کوارٹر نے بتایا کہ ۶ دسمبر کے شدید حملے میں پلٹن اپنا اثنا و کھو بیٹھی اور اس کا شیرازہ بکھر گیا۔ بٹالین ہیڈ کوارٹر میں اور کپتیاں کہیں۔ بٹالین ہیڈ کوارٹر کو اپنی بچی کھچی نفری منظم کرنے کو کہا گیا۔



۶ دسمبر ہی کی بات ہے کہ میجر جنرل قاضی نے بریگیڈیئر رانا کو حکم دیا کہ وہ اپنا بریگیڈ لے کر بریگیڈیئر سہا لندہ (بریگیڈ) کے پاس آجائے (کیونکہ اکھوڑا، برہن باڑیہ اور بہراب بازار کی جنگ نازک مرحلے میں داخل ہو چکی تھی اور اس محاذ کو مضبوط کرنا اشد ضروری تھا) بریگیڈیئر رانا نے اس حکم کی تعمیل سے یہ کہہ کر معذوری ظاہر کر دی کہ رسل و رسال کے ذرائع اس کی اجازت نہیں دیتے۔ ان پر زور دیا گیا کہ بریگیڈ نہیں لاسکتے تو ایک پلٹن ہی بھیج دیجیے، چنانچہ بریگیڈیئر رانا نے ۳۰ ایف ایف کی جنوبی کمپنی بریگیڈیئر سہا لندہ کو بھیج دی تھی جس کا ذکر اوپر آیا ہے۔

۲۲ بلوچ ابھی تک اپنی شیرازہ بندی میں مصروف تھی کہ دشمن شمشیر نگر، مولوی بازار سڑک پر آ گیا۔ مولوی بازار کے دفاع کی ذمہ داری لا محالہ ۳۰ ایف ایف کے سپرد ہوئی جس کے پاس صرف ڈھائی کمپنیاں رہ گئی تھیں۔ کچھ شہید ہو گئے تھے اور ایک کمپنی ۲۴ بریگیڈ کو روانہ کر دی گئی تھی، البتہ نیم عسکری تنظیموں کی کچھ نفری اس کے علاوہ تھی۔ اس پلٹن نے اپنے وسائل کے مطابق مولوی بازار کے دفاع کا اہتمام کر لیا۔

مولوی بازار اور سلٹ کے درمیان ایک چھوٹا سا دریا بہتا تھا جس کا نام کسارہ (KUSIYARA) تھا۔ اس کے دو تین تھے شیر پور اور شادی پور۔ بریگیڈ ہیڈ کوارٹر اپنی گاڑیاں اور ساز و سامان لے کر مولوی بازار سے نکل کر دیا کے اُس پار شادی پور منتقل ہو گیا اور ۳۰ ایف ایف اور اس کی زیر نگرانی نیم عسکری نفری کو مولوی بازار میں متعین رہنے دیا۔ دشمن نے یہاں اس کے مورچوں پر فضا ئی اور توپ خانے سے راکٹ اور گولے برسائے شروع کیے۔ ۳۰ ایف ایف ایک دو دن آہرن بنی ہتھوڑے کی ضربیں سہتی رہی جس کے نتیجے میں اس کے پانچ افراد شہید اور بہت سے زخمی ہو گئے۔ ۶ دسمبر کو اسے حکم مل گیا کہ وہ گولہ بارود کے ذخائر جلا کر شادی پور تین پر پہنچ جائے۔

جب ۳۰ ایف ایف شادی پور کی طرف روانہ ہوئی، تو وہاں سے بریگیڈ ہیڈ کوارٹر سلٹ چل پڑا۔ یہ بریگیڈ اپنے وسائل کے لحاظ سے بمشکل ایک بنا لین کے برابر رہ گیا تھا، مگر اس کے کمانڈر اب ایک کے بجائے دو ہو چکے تھے۔ جنرل نیازی نے دوران جنگ بریگیڈیئر حسن کو ڈھاکہ سے بریگیڈیئر رانا کے پاس بھیج دیا تاکہ اگر ایک سے بوجھ نہ اٹھایا جاسکے تو دونوں مل کر اٹھالیں۔ وہ یہ بھول گئے کہ دوسری کمانڈر کمزور کمانڈ سے بدتر ہوتی ہے۔

جب یہ دونوں بریگیڈیئر سلٹ جا رہے تھے تو ان کے آگے آگے کیپٹن ظفر کی حفاظتی جیب تھی۔ شام کے وقت جب وہ سلٹ کے قریب پہنچا، تو اس نے دیکھا کہ شہر کی جنوبی سرحد پر چند سیلی کاپٹروں سے فوج اتر رہی ہے۔ اس نے وہیں رُک کر سیلی کاپٹر گنا شروع کر دیے۔ دس سیلی کاپٹر اپنا وزن ہلکا کر کے واپس چلے گئے۔ اتنے میں بریگیڈیئر رانا بھی پہنچ گئے۔ کیپٹن ظفر نے انہیں اپنے مشاہدے سے آگاہ کیا۔ بریگیڈیئر رانا نے اس سے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ دشمن شہر پر قابض ہو چکا ہے، کیونکہ ان کے قیاس کے مطابق دشمن اس وقت تک سیلی کاپٹر کے ذریعے لگ نہیں پہنچائے گا جب تک اس کے فوجی دستے شہر کو اپنے تسلط میں نہیں لے لیتے۔

اس دوران میں ۳۰ ایف ایف آرام سے شادی پور تین میں بیٹھی رہی۔ اسے دشمن نے نہ چھیڑا شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ اگر دشمن مولوی بازار کے راستے اس کا بیچا کرتا یا فضا ئیہ کے ذریعے اس کا ناک میں دم کر دیتا، تو یہ پلٹن فوراً سلٹ کا رخ کرتی جہاں بھارت کی سیلی کاپٹر سے اترنے والی فورس کو مزید مشکلوں کا سامنا کرنا پڑتا۔

بریگیڈیئر رانا نے ۸ اور ۹ دسمبر کی درمیانی رات کو ۳۰ ایف ایف کو سلٹ بلوایا۔ جو افسر اس پلٹن کے ہراول دستے کے ساتھ شہر میں داخل ہوا، اُس نے مجھے بتایا:

سلٹ ایک آسٹریلوی شہر معلوم ہوتا تھا جو اندھیرے کی کئی تہوں میں لپٹا ہوا تھا۔ ماحول پر پُر پُور خاموشی طاری تھی۔ اس

خاموشی میں کبھی کبھار غلغلہ کسی آوارہ کتے کے بھونکنے یا گولیوں کی تڑتڑ سے پڑتا تھا۔

مگر یہ شہر شہر خموشاں کیسے ہو سکتا تھا؟ اس میں بریگیڈ ۲۰۲ ہنگامی بریگیڈ بھی تو تھا اس پر کیا بیٹی؟

اس بریگیڈ میں صرف ایک ہی باقاعدہ پلٹن (۳۱ پنجاب) تھی۔ باقی نفری فزٹری کوزریں خور اور رضا کاروں پر مشتمل تھی بھاری ہتھیاروں میں آرٹری کی ایک بیڑی مینسرتھی۔ اس بریگیڈ کو یہ فرض سونپا گیا تھا کہ وہ سلٹ کی مشرقی سرحد پر لاٹھ سے لے کر (جہاں تک بریگیڈ پڑنا کا بریگیڈ تھا) شمالی سرحد پر طاہر پور تک (جہاں ضلع مین سنگھ کی حد شروع ہوتی تھی) دفاع کرے۔ اور دفاع بھی بھارت کی ۴ کور کے گھستانی ڈویژن (MOUNTAIN DIVISION) کے خلاف جو پوری طرح کیل کانٹے سے لیس تھا۔

بھارتی ڈویژن کے سامنے دو ٹکڑے تھے۔ ایک مشرق میں اور ایک شمال مشرق میں۔ جنہیں استعمال کر کے وہ سلٹ پر قبضہ کر سکتا تھا، لہذا مشرق میں انگرام، ذکی گنج اور چارکھائی کی چوکیاں قائم کی گئیں اور شمال مشرقی سمت سے دشمن کو روکنے کے لیے جینتی پور، ہیمو اور غلام میں دفاعی انتظامات کیے گئے۔ شمال مغربی حصے میں نیم عسکری نفری تعینات کی گئی جن کے مورچے چھانک اور گونین تک پھیلے ہوئے تھے۔

تھیں سے کچے راستے گزرتے تھے جنہیں بوقت ضرورت دشمن استعمال کر کے سلٹ کے لیے خطرے کا باعث بن سکتا تھا۔

بریگیڈ ۲۰۲ کے لیے مشکل یہ تھی کہ ان کے پاس سرحدی علاقہ بہت طویل اور وسائل بہت محدود تھے۔ ساری نفری میں صرف ۳۱ پنجاب ہی ایک قابل اعتماد پلٹن تھی۔ اسے ایک محاذ پر لگا دیا جاتا، تو دوسرا خالی رہ جاتا۔ دشمن کی مرضی کا کیا پتہ کہ وہ مشرق سے آتا ہے یا شمال سے لہذا اس پلٹن کو کسی ایک جگہ لگانے کے بجائے آٹھ دستوں میں تقسیم کر کے اسے انگرام (مشرق) سے نام گنج (مغرب) تک پھیلا دیا گیا۔ ہر دستے کے ساتھ نیم عسکری نفری لگا دی گئی تاکہ مورچے بھرے بھرے لگیں اور دشمن انہیں ترنوالہ بھو کہ ہٹ کر جائے۔

دوسرے محاذوں کی طرح اس سیکٹر میں بھی دشمن نے اپنی سرگرمیاں جنگ سے بہت پہلے شروع کر دی تھیں۔ ۱۵ اکتوبر کو بھارتی بارڈر سیکورٹی فورس (B.S.F.) کی ۸۵ بٹالین نمبر ۸۵ نے مکتی باہنی کی ایک پلٹن (سابق ۳ ایٹ بنگال) کے ساتھ مل کر چھانک پر حملہ کر دیا۔ یہاں حملہ کرنے کا ایک ہی مقصد ہو سکتا تھا کہ وہ اس قبضے اور اس سے ملحق سینٹ فیکٹری پر قبضہ کر لے۔ حملے کی گمن گرج سن کر بھاری نیم عسکری نفری سرحدی چوکیوں سے نکل کر قبضے میں آگئی۔ بریگیڈ ۲۰۲ کو اس پٹائی کا علم ہوا، تو انہیں سنبھالا دینے کے لیے سلٹ کے مشرق میں چارکھائی سے باقاعدہ فوج کی ایک کمپنی اور آرٹری کی دو توپیں بھجوا دیں۔ بعد ازاں ۳۰ ایف ایف کی ایک کمپنی بھی مستعار لے کر وہاں روانہ کی گئی۔ یہ فورس وہاں اکٹھی کرنے کا مقصد یہ تھا کہ جو ابی حملہ کر کے دشمن کو پاک سرزمین سے باہر پھینک دیا جائے، چنانچہ ۲۳ اکتوبر کو حملہ کیا گیا جو کامیاب رہا۔

اس کامیابی کا اثر یہ ہوا کہ دشمن نے یہ علاقہ چھوڑ کر سلٹ کے مشرق میں انگرام اور ذکی گنج کے علاقوں پر ایک مکمل بریگیڈ (۵۹) سے حملہ کر دیا۔ اس زوردار حملے کی وجہ سے وہاں سے ۳۱ پنجاب کی پلاٹون سمیت نیم عسکری نفری پیچھے ہٹ گئی۔ ہم نے پورے ادھر سے اجزا جمع کر کے دشمن کو واپس دھکیلنے کی کوشش کی، مگر ناکام رہے۔ ہمیں مجبوراً اپنی دفاعی لائن چارکھائی میں قائم کرنی پڑی جو سلٹ سے ۳۲ کلومیٹر مشرق میں واقع تھی۔

بریگیڈ ۲۰۲ کے لیے اسے اس کے ذریعے ایسٹرن کمانڈ تک یہ بات پہنچانی کہ اگر واقعی سلٹ کو بچانا ہے، تو مزید نفری ہتھیار کی بلے۔ آپ کو یاد ہو گا کہ نومبر کے وسط میں جنرل نیازی نے مجھ جنرل حبیب اور بریگیڈ ۲۰۲ باقر صدیقی کو راولپنڈی (جی ایچ کیو) بھیجا تھا جہاں سے وہ مزید آٹھ پلٹنوں کا وعدہ لے کر لوٹے تھے۔ ان پلٹنوں میں سے پانچ نومبر



کے آخر میں مشرقی پاکستان پہنچ گئی تھیں۔ ان پلٹنوں میں سے ایک ۱۲ آزاد کشمیر رجمنٹ تھی جس کی دو کمپنیاں بریگیڈیئر سلیم کوٹی تھیں۔ یہ پلٹن مشرقی پاکستان کے جزائیہ اور اس کی تازہ صورت حال سے بالکل بے خبر تھی۔ اس کی ٹریننگ کانورجی نڈی نالوں کے بجائے پہاڑی لڑائی پر رہا تھا۔ ان مجبوریوں کے باوجود یہ نفزی بڑی مفید تھی کہ کم از کم مورچوں میں بیٹھ کر دہشتی سے فائر تو کر کے گی؛ چنانچہ ایک کمپنی کو چار کھائی اور دوسری کو جینتی پور میں لگا دیا گیا۔

آزاد کشمیر رجمنٹ کی دو کمپنیوں کی آمد کا دشمن نے کوئی اثر نہ لیا۔ وہ حسب معمول اپنی اشتعال انگیز سرگرمیوں میں مصروف رہا۔ اس نے کئی باہنی کو آگے لگا کر ہمارے سرحدی علاقے میں دخل اندازی جاری رکھی جس کے نتیجے میں اس نے ۲ دسمبر تک انگرام سے طاہر پور تک بارڈر کے ساتھ ساتھ ۵ سے ۶ کلومیٹر لمبی پٹی اپنے قبضے میں کر لی۔ یہ پٹی سنام گنج کے پاس ۱۲ سے ۱۵ کلومیٹر تک اور ذکی گنج کے قریب ۳۰ کلومیٹر تک پھیل چکی تھی۔ گویا جنگ سے پہلے اس سیکٹر میں ہمارا کئی سو مربع کلومیٹر رقبہ دشمن کے قبضے میں جا چکا تھا۔

جب بھر پور جنگ کا آغاز ہوا، تو اس سیکٹر میں دشمن نے تین دفاعی مقامات پر خصوصی توجہ دی۔ مشرق میں چار کھائی، شمال میں سہو اور شمال مغرب میں چھانک۔ جنگ کے پہلے تین دن ان دفاعی مورچوں میں کوئی خم نہ آیا جس کی غالباً وجہ یہ تھی کہ اس عرصے میں دشمن کی توجہ برہمن پور اور ہر اب بازار کی طرف زیادہ رہی جو فوجی نقطہ نظر سے زیادہ اہم سیکٹر تھا۔ جب ادھر صورت حال واضح ہو گئی اور ۲۷ بریگیڈ (سعد اللہ) کے بعد ۳۱۳ جگامی بریگیڈ (رانا) کے قدم بھی اکٹھے گئے، تو اس نے سلٹ کی طرف رجوع کیا۔

۶ دسمبر کا واقعہ ہے کہ سلٹ سے دفاعی کابینہ کے ایک سابق وزیر جناب اجمل چودھری، بریگیڈیئر سلیم اللہ کے ہیڈ کوارٹر میں تشریف لائے اور اطلاع دی کہ انہوں نے شہر کے مشرقی کنارے پر میراں چک میں دشمن کے ہیلی کاپٹروں سے فوج اترتے دیکھی ہے (یہ محنت وطن پاکستانی بعد میں گئی تھی) کے سچے چڑھ گیا جنہوں نے اسے بڑی بے دردی سے قتل کر دیا، اسی روز بریگیڈیئر رانا کے آگے آگے سلٹ میں داخل ہونے والے کیپٹن ظفر بھی سات سپاہیوں کے ساتھ مقامی مارشل لا ہیڈ کوارٹر میں پہنچ گئے جہاں انہوں نے لیفٹیننٹ کرنل سر فزائز کوہیلی کاپٹر اترنے کا آنکھوں دیکھا حال سنایا۔ اس وقت سہ پہر کے ۲ بجے تھے۔ انہوں نے اندازہ لگایا کہ آٹھ دس ہیلی کاپٹروں سے اترنے والی نفزی کاسات سپاہیوں کی مدد سے صفایا نہیں کیا جاسکتا۔

اتنے میں بریگیڈیئر سلیم اللہ نے جینتی پور پوسٹ سے ۳۱ پنجاب کا ایک دستہ (۲۹ افراد) منگوا کر کیپٹن بشارت کی سرکردگی میں میراں چک روانہ کر دیا۔ جب کیپٹن بشارت وہاں پہنچا، تو ہیلی کاپٹروں کی ایک اور کیپٹن نفزی اُتار رہی تھی۔ اس نے سوچا کہ میں ۲۹ آدمیوں سے ان کا کیا بگاڑوں گا؛ چنانچہ اس نے فوراً اسے ان پر اگاؤ کا فائر کیا اور بس!

اسی اثناء میں ۲۲ بلوچ کے وہ پچاس سپاہی بھی پہنچ گئے جو لاٹو اور کلورا میں پلٹن سے پھڑک کر سلٹ روانہ ہو چکے تھے۔ اس دستے کو فوراً کیپٹن بشارت کے پاس بھیجا گیا تاکہ ۷۹ (۲۹ + ۵۰) آدمیوں کی مدد سے وہ دشمن کو واپس جانے پر مجبور کرے۔ یہ ملک پہنچتے پہنچتے ۸ دسمبر کا سونچ طلوع ہو گیا۔ دشمن اتنے میں اپنی قوت میں اضافہ کرتا رہا اور ہم خاموشی سے تماشا دیکھتے رہے۔

دوبیلی کاپٹر اپانک سلٹ شہر میں سرکٹ ہاؤس اور کیشن برج (KAEN BRIDGE) پر پرواز کرتے دکھائی دیے۔ خیال تھا کہ یہ شہر کا فضائی جائزہ لے رہے ہیں تاکہ میراں چک میں اترتی ہوئی فوج شہر میں داخل ہونے کا منصوبہ بنا سکے۔ یہ دیکھ کر سب حیران رہ گئے کہ ان ہیلی کاپٹروں نے دیدبانی کے ساتھ ساتھ سرکٹ ہاؤس میں ایک بم بھی پھینک دیا جس سے دفتر کا ایک کلرک اور پولیس کے تین سپاہی زخمی ہو گئے۔ زخمیوں کو اٹھانے کے لیے کچھ جوان باہر نکلے، تو ہیلی کاپٹروں نے ان پر گولیاں برسادیں جن سے مزید نقصان ہوا۔

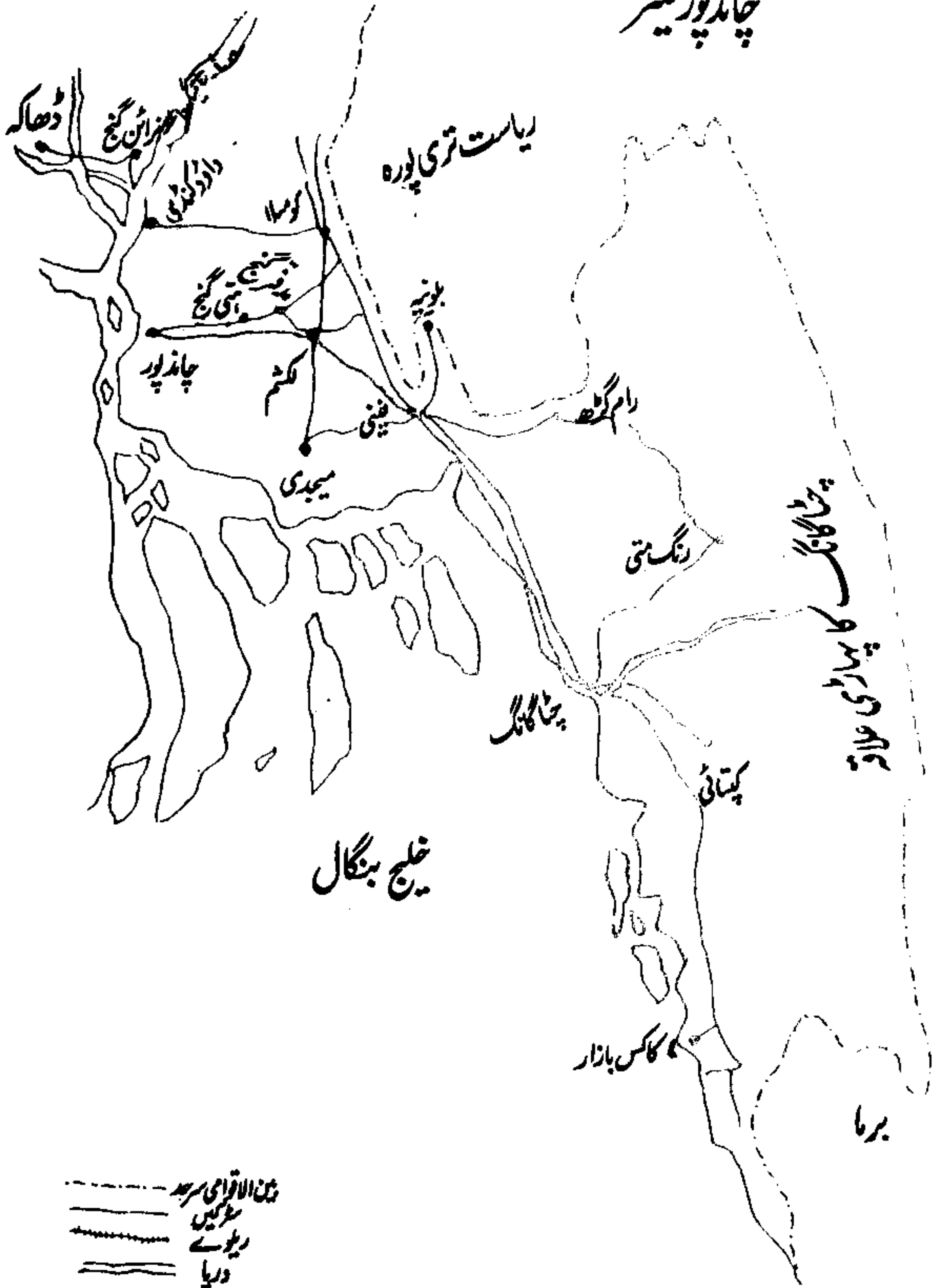
۸ دسمبر کو سلٹ چھاؤنی کے وسائل میں یوں کچھ اضافہ ہوا کہ بریگیڈیئر رانا کاٹھنا پھوٹا بریگیڈ (۳۰ ایف ایف اور ۲۲ بلوچ) جی وہاں پہنچ گیا۔ دو توہیں پہلے ہی سلٹ میں تھیں دو اور اس بریگیڈ کے ساتھ آگئیں۔ وسائل کے سلسلے میں شاید یہ ذکر غیر مناسب نہ ہو گا کہ اب سلٹ میں بیک وقت تین بریگیڈیں موجود تھیں۔ بریگیڈیئر سلیم، بریگیڈیئر رانا اور بریگیڈیئر حسن (جنہیں رانا کا ہاتھ بٹانے کے لیے ڈھا کہ سے بچا گیا تھا)۔

ان تین کمانڈروں کو جو سب سے اہم مسئلہ درپیش تھا یہ تھا کہ سلٹ کی نعل میں اتری ہوئی بھارتی فوج سے کس طرح نپٹا جائے انہوں نے طے کیا کہ ۲۲ بلوچ کے کمانڈنگ آفیسر کو پنجاب، بلوچ اور فرنٹیئر فورس کی مخلوط نفری اور چار توپوں سمیت دشمن کی سرکوبی کے لیے بجا جائے۔ کرنل صاحب نے اس حکم کو بجالانے میں یہ مجبوری ظاہر کی کہ میرے سپاہی تھکے ہوئے آئے ہیں وہ حملہ کرنے کے قابل نہیں۔ اگلے روز (۹ دسمبر) یہی کام ۳۰ ایف ایف کے کمانڈنگ آفیسر کو سونپا گیا۔ انہوں نے بھی تھکاوٹ کا بہانہ بنا کر معذوری ظاہر کر دی۔

۱۰ دسمبر کو دشمن سے نپٹنے کا ایک اور پلان تیار کیا گیا جو مختصر یہ تھا کہ ۳۰ ایف ایف اور ۳۱ پنجاب کی نفری پر مشتمل دو دستے ترتیب دیے جائیں۔ ایک دستہ شمال جانب سے خاموشی کے ساتھ دشمن کے قریب پہنچ جائے اور دوسرا دستہ سامنے سے پورے زور شور سے حملہ کرے۔ خیال تھا کہ دشمن کی توجہ سامنے والے حملے کی طرف ہوگی اور جب اچانک شمالی جانب سے اس پر لیٹا کر کے جائے گی، تو وہ ہڑتاً اٹھے گا۔ اس پلان کو حسب توقع عملی جامہ نہ پہنایا جاسکا، کیونکہ سامنے سے ۳۱ پنجاب کا دستہ کوئی کارروائی نہ کر سکا، دشمن وہیں کا وہیں یہ عجیب اتفاق ہے کہ جب ہم دشمن کے خوف سے اس کے قریب جانے سے ہچکچاہے تھے، دشمن خود ہائے خوف سے کانپ رہا تھا۔ اسے شدت سے یہ احساس تھا کہ میں غیر کے علاقے میں گھس آیا ہوں اور میرا اپنی فوج سے کوئی زمینی رابطہ نہیں رہا۔ اگر مجھ پر کوئی افتاد آن پڑی تو میں کہاں چھپوں گا اور کس کی مدد چاہوں گا؟ یہ باتیں ہمیں اس پلٹن (۵ گورنار انفلڈ) کے ایک افسر نے بعد میں بتائیں۔ اس نے انکشاف کیا کہ جب ۷ اور ۸ کی درمیانی رات کو (کیپٹن ظفر اور اس کے سات آدمیوں کی طرف سے) پہلی مرتبہ فارگیا گیا تو بھارتی کمانڈنگ آفیسر نے یہ خیال ظاہر کیا کہ امان اسی میں ہے کہ فوراً اپنے علاقے میں واپس چلے جائیں۔ وہ ساری رات اسی تذبذب میں رہے کہ واپس چلا جائے یا نہیں رہا جائے۔ ان کی قوت فیصلہ کا فقدان ان کے اٹے آگیا، کیونکہ اتنے میں بھارتی نفری پہنچ گئی۔ اور پاکستان نے بھی نہ چھیڑا!

اس پہلی کاپٹر فورس سے رابطہ قائم کرنے کے لیے بھارت نے ایک دستہ ذکی گنج کے راستے روانہ کیا۔ اسے سرحدی چوکیوں میں معمولی مدافعت کا سامنا کرنا پڑا، لیکن یہ آگے بڑھتا رہا اور ۱۲ دسمبر کو اس فورس کے ساتھ مل گیا۔ پہلی کاپٹر فورس پورے پانچ روز... (۷ دسمبر سے ۱۲ دسمبر تک) بے یار و مددگار پڑی رہی مگر اس کا کسی نے بال بیکانہ کیا۔ ہم نے بڑھ کر دشمن کا سر کھیلنے کے بجائے اپنی جان بچانے پر زیادہ توجہ دی اور ۱۳ دسمبر کو مزید پیچھے ہٹ کر سلٹ شہر اور اس سے باہر سلوچی ایئر فیلڈ (SALUCHI AIR FIELD) تک اپنے آپ کو محدود کر لیا۔ بقیہ علاقے پر دشمن کا قبضہ ہو گیا۔ تینوں بریگیڈیئر اور ان کے زیر کمان نفری انہی دو مقامات پر خاتمہ جنگ تک دہکی رہی۔

چاندپور سیکٹر



چاندپور سیکٹر (۳۹ ہنگامی ڈویژن)

جیسا کہ اوپر ذکر کیا گیا ہے مشرقی سرحد کا جنوبی حصہ (کومیلا سے فیننی تک) میجر جنرل رحیم کے پاس تھا جنہیں مارشل لا ڈیوٹی سے ہٹا کر ۳۹ ہنگامی ڈویژنل ہیڈ کوارٹر کا کمانڈر مقرر کیا گیا تھا۔ وہ نومبر کے دوسرے ہفتے میں چند اشاف آفیسر اور بہت سے جنگی نقشے لے کر ڈھاکہ سے چاندپور منتقل ہو گئے تھے۔ انہیں یہاں بچھنے کی ایک وجہ یہ تھی کہ وہ اپنی محنت، دیانت اور پیشہ ورانہ مہارت کے لیے مشہور تھے اور دوسری یہ کہ جنرل نیازی ان پر بہت اعتماد کرتے تھے۔ مجھے یاد ہے کہ جنگ سے پہلے ہی جنرل نیازی پیشہ ورانہ معاملات میں اکثر مشورہ لیتے رہتے تھے، حالانکہ ڈپٹی مارشل لا ایڈمنسٹریٹر کے طور پر دفاعی امور میں ان کا کوئی دخل نہیں تھا۔

جنرل رحیم کو اس سیکٹر کے دفاع کے لیے دو بریگیڈوں کی کمان دی گئی۔ ان کا ۱۱ بریگیڈ کومیلا میں تھا جس کی کمان بریگیڈیئر عاطف کر رہے تھے اور ۵۲ بریگیڈ جو ڈھاکہ سے منتقل ہو کر فیننی آیا تھا، بریگیڈیئر اسلم نیازی کے پاس تھا۔ بریگیڈیئر نیازی کا جنرل نیازی سے صرف ذہنی صلاحیت کا رشتہ تھا، یہ دونوں بریگیڈ چاندپور میں واقع ۳۹ ڈویژنل ہیڈ کوارٹر کے ماتحت تھے۔ چاندپور دریائے میگھنا کے مشرقی کنارے واقع تھا۔ کومیلا کے جنوب سے پھوٹنے والی سڑک مظفر گنج اور سیبی گنج سے ہوتی ہوئی چاندپور جاتی تھی۔

اس سیکٹر میں مذکورہ سڑک واحد راستہ تھا جس سے بھارتی فوج ٹینک اور توپیں باسانی مشرقی پاکستان میں داخل ہو سکتی تھیں۔ اس حملہ اور سپاہ کے پیش نظر دو مقاصد ہو سکتے تھے۔ یا تو وہ سرحد سے چند کلومیٹر اندر آ کر کومیلا کے پیچھے جا سکتی تھی یا وہ سیدھی چاندپور پہنچ کر دریائے میگھنا کے ذریعے ڈھاکہ کا رخ کر سکتی تھی۔ میجر جنرل رحیم اور ان کے کمانڈر جنرل نیازی کا خیال تھا کہ جوہنی دشمن سرحد پار کر کے مظفر گنج / چاندپور روڈ پر چڑھے گا، شمال سے ۱۱ بریگیڈ (کومیلا) اور جنوب سے ۵۳ بریگیڈ (فیننی) قبضی کے دوپروں کی طرح آپس میں ملیں گے اور دشمن کا بڑھا ہوا سر قلم کر دیں گے۔

۳۹ ہنگامی ڈویژن کے جنوب میں چٹاگانگ اور چٹاگانگ کا پہاڑی علاقہ تھا جہاں کسی بڑے جنگی معرکے کی توقع نہ تھی (سمند کے ذریعے دشمن کے چٹاگانگ ساحل پر اترنے کی بات دوسری تھی جس کا سبب موجودہ وسائل کے پیش نظر ناممکن تھا) کیونکہ فیننی سے نیچے جو سرحدی علاقہ بھارت سے ملتا تھا وہ ایک پہاڑی سلسلہ تھا جس میں قابل ذکر فوجی جمعیت کے گزرنے کا امکان نہ تھا۔ چٹاگانگ کے دفاع کے لیے چٹاگانگ ہی میں ایک بریگیڈ (۹۷) قائم تھا جس کی کمان بریگیڈیئر عطا ملک کے سپرد تھی۔ ان کے پاس ۲۴ ایف ایف اور ۲ کمانڈو بتالین تھی جنہیں انہوں نے بالترتیب چٹاگانگ اور کپتانی میں رکھا ہوا تھا۔

کومیلا کے جنوب میں اگر کہیں فیصلہ کن لڑائی لڑی جا سکتی تھی تو وہ فیننی اور کومیلا کا درمیانی علاقہ تھا۔ فیننی کے پاس بین الاقوامی سرحد۔ دم باہر نکل کر پھر سیدھی ہو جاتی تھی، یوں معلوم ہوتا تھا کہ ہاتھ کا انگوٹھا الگ اکڑا ہوا کھڑا ہے۔ اسے بلونیا بلج (BELONIA BULGE)

کہتے تھے۔ جنگ سے پہلے بھارت نے "بلج" یا "اُبھار کلٹن" کا تہیہ کر رکھا تھا۔ اس نے نومبر کے آغاز میں اس اُبھار کے نصف حصے پر خاموشی سے قبضہ کر لیا۔ جب ہمیں اس کا پتہ چلا، تو معلوم ہوا کہ سامنے کے مورچوں میں کتنی باہمی اور پچھلے مورچوں میں بھارتی سپاہی بیٹھے ہیں۔ بلونیا بلج (BELONIA BULGE) پر دشمن کا قبضہ ہونے سے اس سڑک یا ریل کی پٹری کو استعمال کرنا ممکن نہ تھا جو اس کے پاس سے شمالاً جنوباً گزرتی تھی۔ یہ اُبھار یا بلج (BULGE) دشمن کے پاس رہنے کا ایک اور نقصان یہ تھا کہ بھر پور جنگ چھڑتے ہی دشمن بیک جنبش چٹا گانگ کو جانے والی سڑک پر سوار ہو سکتا تھا یعنی چٹا گانگ کا سمندری دفاع تو اپنی جگہ پیچھے سے دشمن اس کی پشت میں پھرا گھونپ سکتا تھا۔ اس کے تدارک کے لیے جنرل نیازی نے نصف درجن ہنگامی بریگیڈ ہیڈ کوارٹروں میں سے ایک بریگیڈ ہیڈ کوارٹر (۹۱) بریگیڈیئر تسکین کی قیادت میں اس سڑک پر بٹھا دیا۔ بریگیڈیئر تسکین کے حصے میں جو نفری آئی، اس میں ۲۱ آزاد کشمیر رجمنٹ کی دو کمپنیاں مع بتالین ہیڈ کوارٹر، مغربی پاکستان پولیس اور ای پی سی اے ایف کے افراد تھے۔

۳ دسمبر کو بھر پور جنگ چھڑنے پر دشمن کا دباؤ کو میلا کے جنوبی پہلو پر پڑا جہاں، ۱۱ بریگیڈ کی ایک پلٹن (۲۵ ایف ایف) متعین تھی۔ جنرل نیازی کی پالیسی کے مطابق اس پلٹن کی دو کمپنیاں (بتالین ہیڈ کوارٹر سمیت) عین سرحد کے پاس مورچہ بند تھیں اور دوسری دو کمپنیاں چند کلومیٹر پیچھے لال مانی کی پہاڑیوں پر مقیم تھیں۔ اگلی کمپنیوں کے عقب میں ایک چھوٹا سا دریا بہتا تھا جسے پار ہتی پور کہتے تھے۔ ۳ اور ۴ دسمبر کی رات کو بھارت کے ۱۱ کوہستانی بریگیڈ (MOUNTAIN BRIGADE) نے ہماری اگلی کمپنی پر حملہ کر دیا۔ حملہ آور بریگیڈ کے ساتھ میڈیم توپوں کی ایک رجمنٹ اور ٹینکوں کا ایک اسکواڈرن بھی تھا۔ ہمارے جوانوں کے پاس صرف وہی ہتھیار تھے جو عموماً پیدل فوج کے پاس ہوتے ہیں۔ انہوں نے اپنے وسائل کے مطابق دشمن کو روکنے کی کوشش کی، مگر ناکام رہے۔

۲۵ ایف ایف کے کمانڈنگ آفیسر نے اجازت طلب کی کہ مجھے سپاہیوں کو پار ہتی پور کے کنارے پر مورچہ بند ہونے کی اجازت دی جائے تاکہ میں وہاں سے مؤثر طریق پر دفاع کر سکوں، مگر اس کی اجازت نہ دی گئی، بلکہ حکم ہوا کہ سرحد کے ساتھ ساتھ اپنے مورچوں میں ڈٹے رہو۔

دشمن نے سامنے سے انہیں جنگ میں مصروف رکھا اور ایک اور دستہ کتنی باہمی کی رہنمائی میں اس کے عقب میں بھیج دیا۔ انہوں نے دریائے پار ہتی پور کے مشرقی کنارے پر قبضہ کر لیا۔ اس سے کچھ دید بعد بتالین کا بریگیڈ ہیڈ کوارٹر (کو میلا) سے مواصلاتی رابطہ ٹوٹ گیا۔ اس سے بریگیڈیئر عاطف کو پریشانی ہوئی کہ آخر ہوا کیا ہے؟ کیا اس کا مطلب یہ ہے کہ ۲۵ ایف ایف نیست و نابود ہو گئی؟ اگر خدا نخواستہ اس پر کوئی افتاد آن پڑی تو اسے روندنے والے دشمن کی پیش قدمی کا رخ کس جانب ہو سکتا ہے؟ کیا وہ گھوم کر کو میلا کے عقب میں آ رہا ہے یا اس کا رخ چاند پور کی طرف ہے؟

بریگیڈیئر عاطف نے کو میلا چھاؤنی سے ۳۰ پنجاب کا ایک دستہ حالات کی ٹوہ لگانے کے لیے گشت پر روانہ کیا۔ یہ دستہ کو میلا کے ملحقہ علاقے میں چکر کاٹ کر واپس آ گیا۔ اس نے اطلاع دی کہ اس علاقے میں دشمن کے کیمپس آثار نہیں ہیں۔ اس کے باوجود تشویش اپنی جگہ برقرار رہی کہ آخر ۲۵ ایف ایف کو ہوا کیا ہے، کیا وہ دشمن کے دباؤ سے جنوب کی طرف پسا ہو گئی ہے؟ اس امکان کے پیش نظر جنوبی طرف متعین ۲۳ پنجاب کوڈر لیس پر کمانڈ کیا کہ ۲۵ ایف ایف کو وصول کرنے کے لیے تیار رہے، مگر ۲۵ ایف ایف اُدھر ہی نمودار نہ ہوئی۔

عقدہ اس وقت کھلا جب ۴ دسمبر کو انہی کے قریب ۲۵ ایف ایف کے ایک حوالدار نے بریگیڈ ہیڈ کوارٹر میں یہ خوش خبر سنائی

کہ اس کی پلٹن کی دو کمپنیاں بنالین ہیڈ کوارٹر اور بنالین کمانڈر سمیت دشمن کے سامنے ہتھیار ڈال چکی ہیں۔ اس خبر کی تصدیق سپر کوارٹر انڈیا ریڈیو سے بھی ہو گئی جب اس نے بڑے فخر سے اعلان کیا کہ پاکستان کے ایک لیفٹیننٹ کرنل، چھ دوسرے افسروں اور دو سو سپاہیوں کو قیدی بنا لیا گیا ہے۔

جنگ کے ابتدائی مرحلے ہی میں ایسے واقعہ کا پیش آنا انتہائی افسوسناک تھا۔ اب مسئلہ یہ درپیش تھا کہ ۲۵ ایف ایف کے ہٹنے سے دفاعی لائن میں جو شکاف پڑ گیا ہے اسے کیسے پُر کیا جائے۔ ۲۳ پنجاب کو حکم دیا گیا کہ وہ ذرا شمال میں پھیل کر اس خلا کو پُر کرنے مگر یہ پلٹن ایسا نہ کر سکی، کیونکہ خود اس پر بھارت کے ۳۰۲ بریگیڈ نے حملہ کر دیا تھا جس کے ساتھ تو پختا نے (فیلڈ) کی ایک رجمنٹ بھی تھی۔ جنگ کی پہلی رات، حملے کی شدت کے پیش نظر ۲۵ ایف ایف کی طرح ۲۳ پنجاب نے بھی اجازت چاہی کہ یہ اپنے سرحدی مورچوں سے پسپا ہو کر اپنے عقب میں بسنے والے دریائے ڈکائیٹ پر پوزیشن بنھالے۔ اُسے بھی اپنی جگہ ڈٹے رہنے کا حکم دیا گیا۔ اگلی صبح حالات بدتر ہوئے تو حکام بالانے کما اب بیشک پیچھے ہٹ آؤ، مگر کمانڈنگ آفیسر لیفٹیننٹ کرنل اشفاق سید کے خیال میں دن کی روشنی میں پیچھے ہٹنا موت کو دعوت دینا تھا۔ ان کا اندازہ تھا کہ اگر وہ اپنے سرحدی مورچوں میں دن گزاریں تو رات کو پسپا ہونا آسان ہوگا، مگر دن کے وقت جب کرنل سید کے نائب میجر ظفر اقبال لکشم سے ایک فوجی دستے کے ساتھ کرنل سید کے پاس جا رہے تھے تو ڈکائیٹ کے قریب ان پر گولیاں برسنی شروع ہو گئیں۔ اس سے اندازہ ہوا کہ اگرچہ ۲۳ پنجاب کے سپاہی ابھی سرحد پر ہیں دشمن کتنی باہمی کی مدد سے ان کے عقب میں پہنچ گیا ہے۔ اس کا مطلب تھا کہ ۲۳ پنجاب کی سپاہی کا راستہ بھی مسدود ہو چکا ہے۔ میجر ظفر نے واپس لکشم آکر بریگیڈیئر اسلم نیازی کو دریائے ڈکائیٹ کے قریب دشمن کی موجودگی کی اطلاع دی۔ انہوں نے یہ کہہ کر بات گنوا دی کہ تم نے کتنی باہمی دیکھی ہو گی؟

اُدھر جب لیفٹیننٹ کرنل اشفاق سید کو معلوم ہوا کہ دشمن ان کے عقب میں پہنچ چکا ہے تو انہوں نے رات ہونے کا انتظار کیے بغیر بلا تاخیر پسپا ہونے کا فیصلہ کیا۔ ڈکائیٹ کا راستہ نزدیک ترین، مگر پُرخطر تھا۔ انہوں نے لکشم پہنچنے کے لیے جنوبی سمت کو (جہاں ان کی اپنی کمپنی لگی ہوئی تھی) محفوظ جانا۔ وہ بنالین ہیڈ کوارٹر میں زخمیوں کو ڈاکٹر کے سپرد کر کے سپر کوارٹر روانہ ہو گئے۔ راستے میں جو کمپنی پڑتی تھی اسے بھی واپسی کے احکام دیتے آئے اور وارڈن کے ذریعے سرحدی مورچوں میں متعین نفری کو بھی نئی منزل لکشم کی اطلاع دے دی۔ تمام کمپنیاں بحیریت نکل آئیں سوائے ایک کے جو چود گرام کے سرحدی مورچوں میں دشمن سے برسر پیکار تھی۔ فائرنگ ختم ہونے سے پہلے وہاں سے نکلنا ممکن نہ تھا؛ چنانچہ میجر اکرم نے غروب آفتاب تک لڑائی جاری رکھنے اور تاریکی میں مناسب وقفے طے پورا کر کے پسپا ہونے کا فیصلہ کیا۔ میجر اکرم کو کسی نے نہیں بتایا تھا کہ دریائے ڈکائیٹ تک دشمن پہنچ چکا ہے۔ وہ ابھی تک یہی سمجھے بیٹھے تھے کہ اس دریا کے پل کے پاس ہماری تو پل نہیں نصب ہیں۔ پسپا ہو کر وہاں پہنچا سو دمنہ رہے گا، کیونکہ وہاں سے آگے لکشم تک راستہ صاف تھا۔ چنانچہ وہ اپنی گن پوزیشن کی سیدھ میں آتے ہوئے اچانک دشمن کے کچھار میں جا گئے۔ دشمن نے جو نئی نئی جگہ پہنچ کر بہت چوکتا بنا تھا، فوراً فائر کھول دیا۔ ہمارے بہت سے جوان شہید اور زخمی ہو گئے۔ خود میجر اکرم کے پیٹ میں گولیوں کی بوچھاڑ پیوست ہو گئی۔ وہ زخم زدہ حالت میں رات کو کھیت ہی میں پڑے رہے۔ صبح کو جب دشمن جنگی نقشوں کے لالچ میں ان کی تلاشی لینے آیا، تو اس نے دیکھا کہ میجر اکرم اور ان کے بعض ساتھیوں میں ابھی سانس باقی ہے۔ وہ انہیں اٹھا کر اپنے طبی مرکز میں لے گیا جہاں ان کی مرہم پٹی کی گئی۔ میجر اکرم اب ماشاء اللہ لیفٹیننٹ کرنل ہیں ان کے پیٹ پر گولیوں کے داغ اور ذہن پر اس سپاہی کے زخم تازہ ہیں۔

سرحد سے ۲۵ ایف ایف اور ۲۳ پنجاب کے ہٹنے سے اتنا شکاف پڑ چکا تھا کہ دشمن اپنی خاصی فوج چاند پور جانے والی سڑک

پر ڈال سکتا تھا؛ چنانچہ بریگیڈیئر اسلم نیازی کو حکم دیا گیا کہ وہ اپنا بریگیڈ (۱۵ بلوچ اور ۳۹ بلوچ) جو فینی کے علاقے میں تعین تھا، لکشم میں اکٹھا کر لیں۔ لکشم، چاند پور روڈ سے کوئی دس کلومیٹر جنوب میں تھا۔ اس کے سامنے چاند پور روڈ پر مظفر گنج پڑتا تھا۔ لکشم میں دفاعی قلعے کی حیثیت سے وافر مقدار میں راشن اور ایمونیشن جمع کیا گیا تھا جب فینی سے بلوچ رجمنٹ کی دونوں بٹلیئیں واپس بلائی گئیں، تو اس علاقے سے ۲۱ آزاد کشمیر رجمنٹ کی دو کمپنیاں اور بٹالین ہیڈ کوارٹر بھی لکشم منتقل کر دیا گیا۔ آزاد کشمیر کی نفری کے انچارج لیفٹیننٹ کرنل زیدی تھے۔ یہ ساری نفری ۵ اور ۶ دسمبر کی درمیانی رات کو لکشم میں اکٹھی ہو گئی۔ یہ وقت اس لحاظ سے بڑا نازک تھا کہ اس دوران میں دشمن سرحد سے مظفر گنج کی طرف پیش قدمی کر رہا تھا۔ مگر اس پہلو پر پوری توجہ نہ دی گئی اور ۵۳ بریگیڈ کو کہا گیا کہ آپ لوگ تھکے ہوئے آئے ہیں آج رات آرام کریں صبح کو جنرل رحیم لکشم تشریف لائیں گے اور نئے احکام دیں گے۔

۶ دسمبر کی صبح کو حسب وعدہ جنرل رحیم لکشم روانہ ہوئے۔ ان کے آگے آگے طہری پولیس کی جیب تھی جو حفاظتی دستے کا کام بھی دیتی تھی۔ جب یہ جیب مظفر گنج کے قریب پہنچی تو اس پر اچانک فائرنگ ہوئی، یوں جنرل رحیم کو وہاں دشمن کی موجودگی کا احساس ہوا اور وہ اپنا فورہ منسوخ کر کے واپس چاند پور تشریف لے گئے۔

اب اس سیکٹر کی قسمت کے فیصلے کی گھڑی آہلی تھی۔ دشمن اپنی پوری طاقت سے چاند پور کی طرف پیش قدمی کر رہا تھا۔ ہمارے دو بریگیڈ چاند پور روڈ کے شمال (۱۱ بریگیڈ کومیل) اور جنوب (۵۳ بریگیڈ لکشم) میں بیٹھے تھے۔ خود جنرل رحیم اپنی تمام تر ذہانت اور پیشہ ورانہ مہارت کے ساتھ چاند پور میں تشریف رکھتے تھے۔ ضرورت اس بات کی تھی کہ پلان کے مطابق دونوں بریگیڈ پہنچی کے پروں کی طرح آپس میں ملتے اور چاند پور روڈ پر دشمن کا سر بڑھا ہوتا، تو سر قلم کر دیتے اور اگر دھڑ آگے ہوتا، تو دھڑ کاٹ دیتے۔ لیکن افسوس کہ قیمتی گھنٹے کسی کارروائی کے بغیر گزر گئے۔ بریگیڈیئر اسلم نیازی لکشم میں بیٹھے دفاعی قلعہ بندی مضبوط کرتے رہے اور بریگیڈیئر عاطف خود کو اپنے مورچوں میں محفوظ عسوس کرتے رہے۔ ہمارے اس تسلسل کے دوران میں دشمن اپنی بھاری جمعیت مظفر گنج/چاند پور روڈ پر لے آیا۔

بالآخر، ۶ دسمبر کو لکشم میں کچھ حرکت ہوئی۔ بریگیڈیئر نیازی نے ۳۹ بلوچ کو لیفٹیننٹ کرنل نعیم کی نگرانی میں لکشم میں رہنے دیا اور باقی نفری ۵ بلوچ اور ۲۳ پنجاب کی دو کمپنیاں اور ۲۱ آزاد کشمیر رجمنٹ کی ایک کمپنی کو مضبوط دستوں میں بانٹ کر مظفر گنج کی طرف روانہ کیا۔ ایک دستہ سیدھا مظفر گنج بھیجا گیا اور دوسرے کو جنوب مغرب سے ہو کر اس پر حملہ کرنے کی ہدایت کی گئی۔ ارادہ یہ تھا کہ سامنے سے جانے والا دستہ دشمن کو فائرنگ میں مصروف رکھے اور دوسرا دستہ پہلو سے اس پر حملہ کرے۔ جب لڑتے لڑتے دونوں دستے مل جائیں گے تو دشمن کا خود بخود قلعہ قمع ہو جائے گا۔

پہلا دستہ مظفر گنج کے قریب پہنچا، تو سامنے سے دشمن نے اس پر حملہ کر دیا۔ اس نے بھی جوابی فائر کیا۔ گویا منصوبے کا ایک حصہ تو باسانی پورا ہو گیا، مگر دوسرے حصے کی تکمیل کے لیے ضروری تھا کہ دوسرا دستہ جنوب مغربی سمت سے حملہ آور ہو۔ یہ دستہ اپنے مقصد میں کامیاب نہ ہو سکا، کیونکہ راستے ہی میں اس کا واسطہ ملتی باہنی سے پڑ گیا تھا۔ اس دستے کے پیچھے رہ جانے سے مظفر گنج میں دشمن سے نپٹنے کا منصوبہ ناکام ہو گیا؛ چنانچہ ۱۵ بلوچ کی نفری کو واپس بلا لیا گیا۔

دوسرے دستے کو جو ۲۳ پنجاب اور ۲۱ آزاد کشمیر رجمنٹ کے سپاہیوں پر مشتمل تھا، مظفر گنج کے مغرب میں بھی گنج کی طرف جانے کو کہا گیا۔ اس حکم کا مقصد یہ تھا کہ اگر دشمن مظفر گنج میں اپنے پاؤں جما چکا ہے تو مزید آگے بڑھ کر اس سے بلا جائے تاکہ وہاں قدم جلانے سے پہلے اس سے پٹا جا سکے۔

یہ پیش قدمی کھیتوں کے بیچوں بیچ پیدل ہو رہی تھی کیونکہ چاند پور روڈ پر چڑھنے کا مطلب کھلے عام دشمن سے تصادم مول لینا تھا جو اس سپاہ کے مقامی کمانڈروں کے خیال میں موزوں نہ تھا۔ ان کے خیال میں یہ طریقہ بہتر تھا کہ دشمن سے دُور دُور رہ کر اپنی منزل پر پہنچا جائے اور پھر وہاں منظم ہو کر اس پر دھاوا بولا جائے۔ وہ یہ بھول گئے کہ دشمن کئی سڑک استعمال کر رہا ہے اور یہ کچھ کھیتوں میں پاؤں گھسیٹ رہے ہیں تو اس کا فائدہ کس کو زیادہ پہنچے گا۔ لیفٹیننٹ کرنل اشفاق سید اور لیفٹیننٹ کرنل زیدی بالترتیب ۲۳ پنجاب اور ۲۱ آزاد کشمیر کی نفری کی کمان کر رہے تھے۔

جب یہ لوگ ۷ دسمبر کی صبح لکشم سے (مظفر گنج کے لیے) روانہ ہوئے تھے تو ان کا خیال تھا کہ ایک آدھ دن کا کام ہے جسے پورا کر کے وہ واپس لکشم آجائیں گے۔ بجاری ہتھیار، فالتو راشن اور کھانا پکانے کے برتن ساتھ لے جانے کا کیا فائدہ؟ مگر اب انہیں جو سفر درپیش تھا اس کے تقاضے کچھ اور تھے۔ اب انہیں کھانا پکانے کے علاوہ فالتو ایمونیشن وغیرہ بھی درکار تھا تاکہ وہ راستے میں کئی باہنی سے نپٹتے جائیں اور متواتر پیدل چل کر سپاہیوں کا یہ حال ہو گیا تھا کہ فالتو اشیاء تو درکنار ان کو اپنا ذاتی اسلحہ اور بیگے ہوئے بوٹ بھی بجاری لگ رہے تھے۔ کئی سپاہیوں نے بوجھ ہلکا کرنے کے لیے بوٹ اتار پھینکے اور بعض نے فالتو گولیوں کے پٹے ضائع کر دیے۔ اسی طرح اس دستے کے ساتھ جو فالتو ڈرائیس سیٹ تھے انہیں بھی غیر ضروری بوجھ سمجھ کر پھینک دیا گیا۔ اب لڑنا تو درکنار اس دستے کے لیے پیدل بھی گنج پہنچنا بھی دشوار ہو گیا تھا۔

لیفٹیننٹ کرنل اشفاق سید اور لیفٹیننٹ کرنل زیدی نے ۹ دسمبر کو کھیتوں میں بیٹھ کر ایک غیر رسمی کانفرنس میں یہ فیصلہ کیا کہ وہ اپنی اپنی نفری کو دو الگ الگ دستوں میں تقسیم کر لیں تاکہ چھوٹے دستوں کی نقل و حرکت کئی باہنی سے پوشیدہ رہ سکے۔ انہوں نے اگلی رات الگ الگ سفر کیا اور ۱۰ دسمبر کو مختلف مقامات پر دشمن کے سامنے ہتھیار ڈال دیے۔ ایک ہفتے کے اندر اندر یہ دوسرا واقعہ تھا کہ جنرل رحیم کی زیر کمان پلٹنوں نے ہتھیار ڈالے تھے۔

میجر جنرل رحیم بڑے زیرک جی اوسی تھے۔ ان کی دُور اندیش نگاہوں نے بھی گنج کے واقعے سے پہلے ہی اندازہ لگا لیا تھا کہ جب ہم مظفر گنج سے دشمن کو نہیں ہٹا سکتے تو چاند پور کی طرف اس کی پیش قدمی کیونکر روک سکیں گے؛ چنانچہ انہوں نے ۸ دسمبر کی رات ایسٹرن کمانڈ کو اطلاع دی کہ دشمن کے ہراول دستے کا ریلا چاند پور کی طرف بڑھ رہا ہے۔ اب میں کیا کروں؟ جب یہ اطلاع پہنچی تو میں ایسٹرن کمانڈ کے آپریشن روم میں تھا۔ رات خاصی بیت چکی تھی اور جنرل نیازی آپریشن روم سے ملحقہ تہ خانے میں آرام فرما رہے تھے۔ انہوں نے جب اپنے قابل اعتماد جرنیل کی پریشانی کی خبر سنی تو وہ اپنی آرام گاہ سے نکل کر آپریشن روم تشریف لائے تاکہ جگہی نقشے پر ایک نظر ڈال کر فیصلہ لے سکیں۔ انہوں نے اس وقت سُرخ رنگ کا ریٹی ڈرینگ گاؤں پناہ ہوا تھا اور ان کی آنکھوں میں نیند کے سُرخ ڈورے نظر آ رہے تھے۔ وہ اپنے کمرے سے نکل کر سیدھے نقشے کے پاس گئے۔ ہم سب آس پاس کھڑے تھے مگر وہ کسی سے نہ بولے۔ ان کے پیچھے پیچھے ایک دو سینئر افسر بھی آپریشن روم میں آگئے۔ جنرل نیازی نے چاند پور پر شہادت کی اٹھلی نصب کرتے ہوئے تاریخی فیصلہ صادر فرمایا کہ رحیم سے کہہ دو کہ ڈھا کہ واپس آجائے۔ دیا نے میگنا سے ٹیک لگا کر وہ چاند پور میں کیسے ٹھہر سکتا ہے۔ اپنے ہیڈ کوارٹر کی حفاظت کے لیے ہے بھی تو اس کے پاس صرف ایک کمپنی ہے۔

جنرل رحیم کے لیے پاپائی کا راستہ درپائے میگنا تھا۔ ان کے پاس لڑاکا سپاہیوں کی کل نفری ڈیڑھ سو کے لگ بھگ تھی جس میں فریئرز ڈس کی ۵۵ پلاٹون، ۲۳ پنجاب کی ایک پلاٹون اور کمانڈو بٹالین کے کچھ پھین افراد تھے۔ اس کے علاوہ ان کے پاس آرڈیننس، سگنلز،

پلانی اور اسی طرح کے دوسرے خدمت گزار محکموں کے لوگ تھے۔ انہوں نے ۹ دسمبر کو یہ نفری اکٹھی کرنے اور اگلی رات ڈھاکہ روانہ ہونے کا فیصلہ کیا اور ایسٹرن کمانڈ سے کہا کہ وہ نیوی کی ایک گن بوٹ (GUN BOAT) اس بحری قافلے کی حفاظت کے لیے بھیج دے۔ اس قافلے کو لانے کے لیے انہوں نے مقامی طور پر کشتیاں اور لاناچز (LAUNCHES) اکٹھی کر لیں۔

زائن گنج (ڈھاکہ) سے جو گن بوٹ روانہ ہوئی وہ تقریباً آدھی رات کو چاند پور پہنچی۔ عموماً دریائی راستے سے چاند پور سے ڈھاکہ جا رکھنے کا سفر تھا اور بھارت بھارت کی کشتیوں پر مشتمل یہ قافلہ زیادہ سے زیادہ پانچ گھنٹے میں ڈھاکہ پہنچ سکتا تھا۔ گویا راتوں رات سفر کرنے کے لیے ضروری تھا کہ جنرل رحیم کا قافلہ بلا تاخیر چاند پور سے روانہ ہو جائے مگر وہاں ہر چیز ایسی غیر منظم تھی کہ ۳۹ ڈویژنل ہیڈ کوارٹر کا عملہ اور حفاظتی سپاہی ۱۰ دسمبر کو صبح ۴ بجے روانہ ہوئے۔ روانہ ہونے سے پیشتر جنرل رحیم نے ایسٹرن کمانڈ کو ایک تار (سگنل) روانہ کر دیا کہ دیر سے روانگی کی وجہ سے آدھا سفر طلوع آفتاب کے بعد کرنا پڑے گا، اس لیے ہماری حفاظت کے لیے فضا ئیہ کوجھا جائے۔ اگر فضا ئیہ میسر نہ ہو تو ایک اور گن بوٹ روانہ کی جائے (انہیں پتہ نہیں تھا کہ ہماری فضا ئیہ ۴ دسمبر سے طاقت پر واز کھو چکی ہے)۔ اضافی گن بوٹ والی خبر جب ریڈیو مرل شریف تک پہنچی تو انہوں نے کہا اگر ایک گن بوٹ کا لوائے (CONVOY) کی حفاظت نہیں کر سکتی تو دوسرے کیا فرق پڑے گا۔ دوسری گن بوٹ کو خواہ مخواہ خطرے میں کیوں جھونکا جائے۔

بحارتی طیارے عموماً صبح ناشتے کے وقت حملہ کیا کرتے تھے۔ ۱۰ دسمبر کو بھی انہوں نے ناعذ نہ کیا۔ اس روز ناشتے کے وقت جو ٹارگٹ ان کے سامنے تھا وہ یہی بد قسمت کالوائے تھا جو اب زائن گنج پہنچنے والا تھا۔ دشمن کے جیٹ طیارے چیلوں کی طرح جھپٹ پڑے۔ گن بوٹ نے طیارہ شکن توپ سے مدافعت کی، مگر ۲۱ طیاروں کے سامنے اس کی کوششیں بے اثر ثابت ہوئیں۔ ایک دھماکے سے گن بوٹ کا بالائی حصہ اڑ گیا، مگر اس کا کپتان اپنی جگہ پر ڈٹا رہا۔ وہ بڑی مہارت سے اسے چلاتا ہوا کمانڈے پر لے گیا۔

ایک دوسری کشتیوں اور لاناچوں پر بھی پڑیں جس سے جگہ ڈرچ گئی۔ لوگوں نے چھلانگیں لگا کر اپنی جان بچانا شروع کی۔ جہاز بدستور حملے کرتے رہے۔ ہمارے چار افسر موقع پر ہی شہید ہو گئے جن میں کمانڈو بنالین کے میجر بلال بھی تھے (جو ۲۵ مارچ کو شیخ مجیب کو گھر سے گرفتار کر کے لائے تھے) زخمیوں میں میجر جنرل رحیم بھی شامل تھے جن کی ٹانگوں پر خراشیں آئی تھیں۔ انہیں فوراً ڈھاکہ لایا گیا۔ یوں چاند پور اور ۳۹ ڈویژنل ہیڈ کوارٹر جنگی نقصان سے معدوم ہو گیا۔

ادھر پیچھے لکشم میں بھی حالات دگرگوں ہو گئے۔ بریگیڈیئر اسلم نیازی کو پانچ کمپنیوں سے اس دفاعی قلعہ کا دفاع کرنا مشکل نظر آنے لگا۔ انہوں نے ۹ دسمبر کو ڈھاکہ سے پوچھا کہ میرے لیے کیا حکم ہے؟ جواب ملا کہ کو میلا بریگیڈ (۱۱۷) سے مل جاؤ۔ اس حکم کی ایک توضیح یہ تھی کہ تم الگ تھلگ پڑے کیا کرو گے، قریب ترین بریگیڈ کے ساتھ مل کر اپنی جان بچاؤ، مگر اس کا دوسرا مطلب یہ ہو سکتا تھا کہ دیکھتے کیا ہو کو میلا میں ایک بریگیڈیئر (عاطف) بیٹھا ہے پیچھے تم ہو۔ دونوں کے درمیان چاند پور روڈ پر دشمن ہے، آپس میں ملو گے تو دشمن کی آمد و رفت خود بخود ختم ہو جائے گی۔ ایسٹرن کمانڈ کا اصرار ہے کہ اس کا مطلب مؤخر الذکر طریقہ کار تھا، جبکہ بریگیڈیئر نیازی کہتے ہیں کہ اس حکم کا مطلب صرف کو میلا سے جا ملنا تھا جس پر انہوں نے فی الفور عمل کیا۔

لکشم چھوڑ کر کو میلا جانے میں ایک غور طلب بات یہ بھی تھی کہ وہاں پڑے ہوئے ۱۲۸ زخمیوں کا کیا بنے گا جنہیں مقامی ہول ہسپتال میں جمع کیا گیا تھا۔ ۸ دسمبر کو جب ہم دشمن کو مظفر گنج سے نکلنے میں ناکام رہے تو ان زخمیوں کو چاند پور منتقل کرنے کے لیے ایک ریل گاڑی میں ڈالا گیا۔ وہ ساری رات تھر ڈکلاس کے ڈبوں میں پڑے کراہتے رہے۔ ان میں سے بعض کی حالت تشویشناک تھی۔ ڈاکٹر کے پاس

دو ایس تھیں نہ عملہ۔ وہ بے چارہ رات کو درد رفع کرنے کے کپھر سے ایک کتلی بھر کر گاڑی میں لے گیا اور رات کی تاریکی میں شدید زخمیوں کے منہ میں اندازے کے مطابق دوا انڈیلتا رہا۔ اگلے روز خود چاند پور کا مقدر ڈالواں ڈول نظر آنے لگا تو زخمیوں کو اتار کر واپس ہسپتال بھیج دیا گیا۔

لکشم سے ۵۳ بریگیڈ روانہ ہونے لگا تو اس نے زخمیوں اور ان کی تیمارداری کرنے والے ڈاکٹروں کو اطلاع دی۔ انہیں اللہ تعالیٰ کے رحم و کرم پر چھوڑ کر بریگیڈیئر اسلم نیازی نے ساری نفری کو دو حصوں میں تقسیم کیا۔ پہلے حصے میں سول آرڈ فورسز، مجاہد اور رما کار وغیرہ تھے جن کی کمان میجر ریشم کے سپرد تھی۔ دوسرا حصہ جس کے سربراہ لیفٹیننٹ کرنل نعیم تھے زیادہ تر ۳۵ بلوچ کی نفری پر مشتمل تھا۔ لکشم سے پہلے میجر ریشم والا قافلہ روانہ ہوا اور اس کے بعد لیفٹیننٹ کرنل نعیم والا۔ بریگیڈیئر اسلم نیازی اپنے ذاتی حفاظتی دستے سمیت الگ طور پر کو میلا چلے۔ کو میلا لکشم سے کوئی ۲۸ کلومیٹر دور تھا۔ عام حالات میں یہ مسافت طے کرنے میں چند گھنٹوں سے زیادہ نہیں لگتے تھے لیکن آج مکتی باہنی اور بھارتی سپاہیوں کی متوقع مدافعت کے پیش نظر تین گنا وقت رکھا گیا تھا۔ ۱۰ دسمبر کی رات کو روانگی غروب آفتاب کے چند گھنٹے بعد رکھی گئی تاکہ صبح ہونے سے پہلے تینوں قافلے (بریگیڈیئر اسلم، لیفٹیننٹ کرنل نعیم اور میجر ریشم) کو میلا پہنچ جائیں۔ ۵۳ بریگیڈ نے لکشم سے روانگی سے قبل اپنا بھاری جنگی سامان اور فالتو ایمونیشن وغیرہ تالابوں میں پھینک دیا یا نذر آتش کر دیا۔ سپاہیوں نے صرف اپنے ذاتی ہتھیار اور تھوڑا تھوڑا ایمونیشن اپنے پاس رکھا۔ اتفاق کی بات ہے بریگیڈیئر اسلم نیازی اور میجر ریشم والے فوجی دستے تو بخیر و عافیت راتوں رات کو میلا چھاؤنی پہنچ گئے، مگر لیفٹیننٹ کرنل نعیم والا قافلہ بعض مشکلات میں الجھ کر رہ گیا۔

کرنل نعیم کسی جانے پہچانے راستے کے بجائے ایسی راہ کی تلاش میں تھے جہاں انہیں دشمن سے واسطہ نہ پڑے؛ چنانچہ وہ پتھتے پتھتے پیچ و خم کھاتے آگے بڑھتے رہے۔ جہاں انہیں کوئی گاؤں نظر آتا یا کسی جھاڑی پر مکتی باہنی ہونے کا شبہ ہوتا تو وہ کتر کتر دوسری طرف نکل جاتے۔ یوں چلتے چلاتے وہ اگلے روز کو میلا سے ۱۱ کلومیٹر جنوب مغرب میں جانگلیہ کے مقام پر جانکلے۔ انہوں نے سوچا کہ بہت مسافت طے کر لی، اب یہاں آرام کر لیا جائے اور پھر اگلے روز تازہ دم ہو کر کو میلا چھاؤنی میں داخل ہونے کی کوشش کریں گے لہذا انہوں نے وہیں پڑاؤ ڈال لیا۔ رات بخیر و خوبی گزری۔ اگلی صبح وہ کو میلا کی طرف جاتے ہوئے جیسپور پہنچے تو وہاں سے ان پر فائرنگ ہوئی۔ انہوں نے بھی جوابی فائرنگ کی۔ اس مختصر مگر تند و تیز جھڑپ میں چند قیمتی جانیں ضائع ہو گئیں جن میں کمپنی کمانڈر میجر تیمور بھی شامل تھے۔ کرنل نعیم اس قربانی کے بعد پھر اپنے جانوں کو جانگلیہ لے آئے جہاں انہوں نے اپنے افسروں کی ایک چھوٹی سی میٹنگ کی تاکہ یہ فیصلہ کیا جائے کہ کو میلا میں داخل ہونے کی آئندہ کوشش کس طرف سے کی جائے۔ کسی نے کہا کہ پھر جیسپور کی طرف جا کر زوردار حملہ کر کے دشمن کا حصار توڑ دیا جائے۔ کسی نے مشورہ دیا کہ کو میلا داخل ہونے سے بجائے ڈھاکہ کا رخ کیا جائے خواہ مخواہ مزید جانیں قربان کرنے کا کیا فائدہ؟ فیصلہ یہی ہوا کہ ایک رات جانگلیہ میں بسر کر کے اگلے روز کو میلا / ڈھاکہ روڈ کی طرف پیش قدمی کی جائے۔ اگر ادھر سے کو میلا چھاؤنی میں داخل ہونے کا موقع مل جائے تو بہتر ورنہ ڈھاکہ کا رخ کیا جائے۔

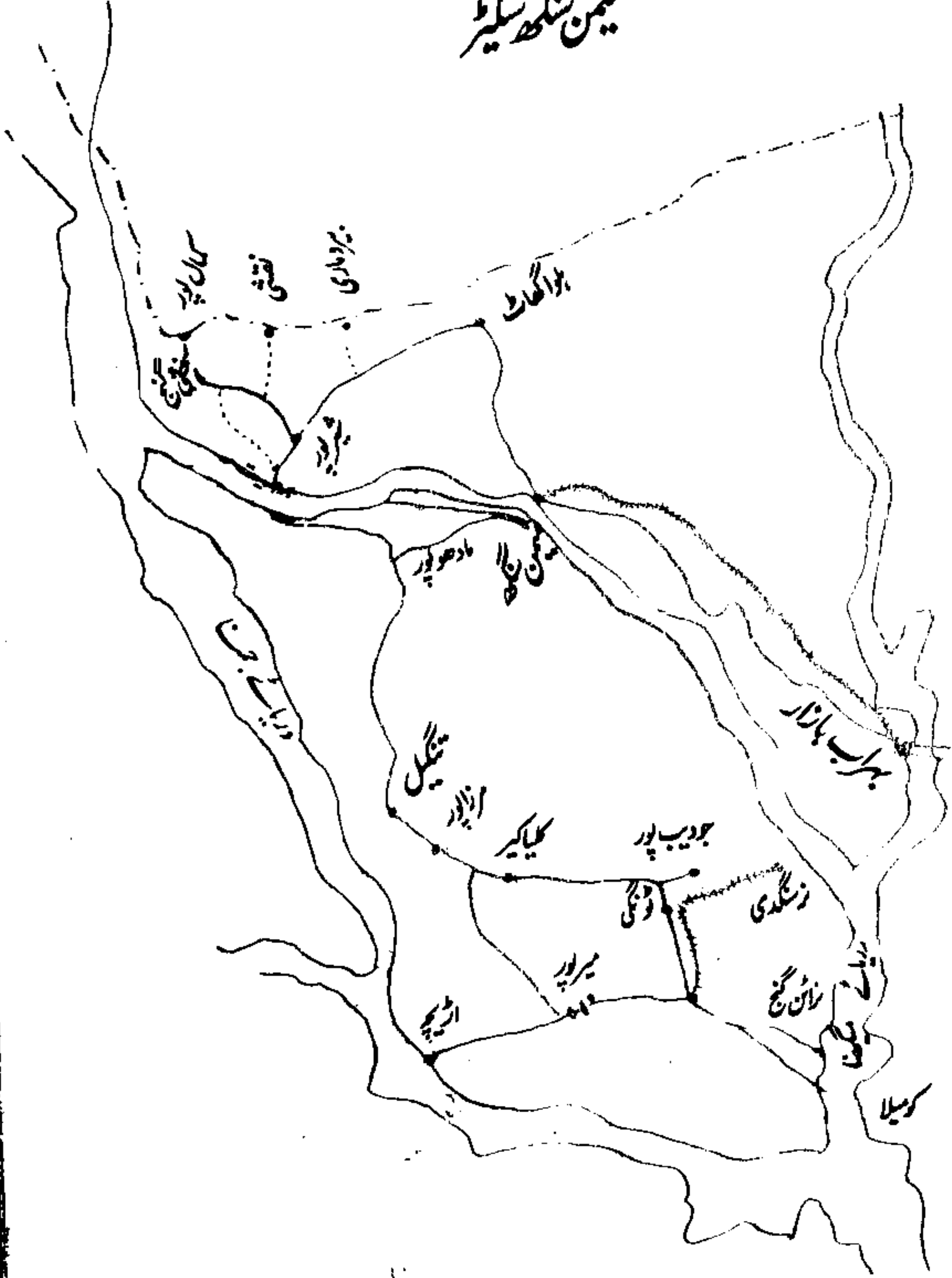
۱۲ دسمبر کا سوج طلوع ہوا، تو کرنل نعیم اپنی متاع لے کر روانہ ہوئے، ابھی چند کلومیٹر گئے ہوں گے کہ ان کے ہراول دستے کو رام موہن اور چندینا کے درمیان بھارتی سپاہی نظر آئے۔ وہ پہلے کچھ ٹھنکے۔ پھر انہوں نے پیچھے اپنے کمانڈنگ آفیسر کی طرف دیکھا اور چند ثانیے بعد وہ اپنے سفید رومال لہراتے ہوئے دشمن کے پاس چلے گئے۔ کرنل نعیم سمیت باقی قافلہ بھی ان کے پیچھے پیچھے دیکھنے کی خدمت میں حاضر ہو گیا۔ یہ اس ڈوئیرن کی میسر ہی سپر اندازی تھی!

کومیلہ کا قلعہ ابھی باقی تھا۔ اس میں دو بریگیڈیں (عاطف اور اسلم نیازی)، انقستری کی دو پٹنیں اور دو ٹینک موجود تھے۔ ان کا دائرہ اثر صرف چھاؤنی کے علاقے تک محدود تھا۔ کومیلہ شہر ہنگویش کا جمنڈا ہرا رہا تھا۔ بلیک آؤٹ کی قدامت بھی چھاؤنی تک ہی تھی۔ شہر بجلی کے تقوں سے جگمگا رہا تھا۔

کومیلہ چھاؤنی کا دفاعی قلعہ ابھی ہمارے پاس ہی تھا کہ ۱۶ دسمبر کو ڈھاکہ ہمارے ہاتھ سے نکل گیا۔



میمن سنگھ سکیٹر



- بین الاقوامی سرحد
- سرحدیں
- ~~~~~ ریوسہ
- ===== دریا

مہمن سنگھ سیکر (۳۶ ہنگامی ڈویژن)

میجر جنرل جمشید جنہوں نے دوسری جنگ عظیم میں "طرپی کر اس" کا اعزاز حاصل کیا تھا، ٹھنڈے مزاج اور خاموش طبع آدمی سمجھے جاتے تھے۔ وہ ایسٹ پاکستان سول آرڈ فورسز کے ڈائریکٹر جنرل تھے، مگر جب جنرل نیازی نے ہنگامی بریگیڈ ہیڈ کوارٹر اور ڈویژنل ہیڈ کوارٹر کھڑے کرنے شروع کیے، تو ایک ہنگامی ڈویژنل ہیڈ کوارٹر (۳۶) جنرل جمشید کے حوالے کر دیا۔ کہنے کو تو یہ ڈویژن تھا، مگر اس کی نفری صرف دو باقاعدہ پلٹنیں تھیں جو بریگیڈیر قادر کے ماتحت تھیں۔ اس ڈویژن کے ذمہ ڈھاکہ اور اس کے عین شمال میں تنگیں اور مہمن سنگھ کا علاقہ تھا۔

ہم نے ایک گزشتہ باب میں شمالی بنگال کا ذکر کرتے ہوئے دریائے جمناسے مغربی جانب جنگ کا احوال بیان کیا ہے۔ اس باب میں دریائے جمناسے مشرق میں جو سرحد سلٹ کے بارڈر تک پہلی ہوئی تھی، اس کا تذکرہ مفقود ہے۔ یہ سرحد کوئی ۸۵ کلومیٹر لمبی تھی جس میں سے دو راستے جنوب کو بچھوٹے تھے۔ ایک ہلوگھاٹ مہمن سنگھ کا راستہ اور دوسرا کمال پور سے جمال پور کا راستہ، بریگیڈیئر قادر (۹۳ بریگیڈ) نے ۳۳ پنجاب کو ہلوگھاٹ اور ۳۱ بلوچ کو کمال پور والے راستے پر متعین کر دیا۔ خود اپنا ہیڈ کوارٹر انہوں نے مہمن سنگھ میں رکھا۔

مذکورہ پلٹنوں کو پلان کے مطابق حکم یہ تھا کہ جب تک ممکن ہو وہ دشمن کو سرحد پر روکے رکھیں اور پھر زیادہ سے زیادہ عرصے میں تھوڑے سے تھوڑا علاقہ چھوڑتے ہوئے واپس مہمن سنگھ اور جمال پور پہنچ جائیں جنہیں "دفاعی قلعوں" کی حیثیت دی گئی تھی۔ یہ دونوں قلعے دریائے برہم پتر کے جنوبی کنارے پر واقع تھے اور خیال تھا کہ یہ وہ دفاعی خطہ ہے جس سے دشمن کو کسی قیمت پر گزرنے نہیں دیا جائے گا۔

ان دو پلٹنوں کا مقابلہ دشمن کے ۱۰ اکیونٹی کیشن زون (101 COMMUNICATION ZONE) سے تھا جس کی کمان ایک میجر جنرل کے سپرد تھی۔ یہ زون ایک باقاعدہ ڈویژن کی حیثیت سے لڑنے کی صلاحیت رکھتا تھا۔ جنگ سے ذرا پہلے دشمن نے یہاں ایک اور بریگیڈ (۹۵) بھیج دیا تھا۔ اس کے علاوہ اس کے پاس اپنی ضرورت سے کہیں زیادہ توپ خانہ تھا۔ توپ خانے کی جگہ ہمارے پاس صرف ۱۲۰ ملی میٹر مارٹروں کی ایک بیٹری تھی۔

اس سیکٹر میں تین یادگار واقعات پیش آئے۔ کمال پوسٹ کا دفاع، ۹۳ بریگیڈ کی پسپائی اور تنگیں کے قریب بھارتی چھاتہ برداروں کی آمد! آئیے ان کا ذکر ذرا تفصیل سے کریں کیونکہ اس سیکٹر کی ساری جنگی کارروائی انہی تین واقعات پر مبنی ہے۔ اس سیکٹر میں دشمن نے زیادہ توجہ کمال پور/جمال پور کی طرف دی کیونکہ اس طرف کئی سڑک تھی جو تنگیں سے ہوتی ہوئی سیدھی ڈھاکہ

چلی جاتی تھی۔ اس کے برعکس ہواگھاٹ والا راستہ کچھ کچا اور کچھ لپکا تھا۔ پھر اس میں اتنے بل آتے تھے کہ (براستہ میں سنگھ) مسافت ذرا طویل ہو جاتی تھی۔ کمال پور والا راستہ کھولنے کے لیے دشمن کے لیے اس سرحدی چوکی کو ٹھکانے لگانا ضروری تھا جو کمال پور میں واقع تھی۔ اسے ٹھکانے لگانے کے لیے دشمن کو ایڑی چوٹی کا زور لگانا پڑا۔ آئیے ذرا دیکھیں کیسے؟

دشمن نے کمال پور کو ۱۲ جون کو چھبھڑا جب مکتی باہنی کی کارروائیاں نئے نئے ولولے کے ساتھ شروع ہوئی تھیں اور بھارتی توپیں سرحدی علاقوں میں ان کی امداد کے لیے گولے برسائے لگی تھیں۔ چند گولے کمال پور پوسٹ کے ارد گرد گرنے لگے مگر کوئی جانی یا مالی نقصان نہ ہوا۔ ۳۱ جولائی کو اس نے پھر اس 'چھپر خانی' کا اعادہ کیا اور گولہ باری کے ساتھ مکتی باہنی کو حملہ کرنے بھیجا، مگر یہ حرکت اسے منگلی پڑی۔ مکتی باہنی جس میں باغی ایٹ پاکستان رائلٹ اور ایٹ بنگال رجمنٹ کے سپاہی شامل تھے، کئی لاشیں پیچھے چھوڑ کر بھاگ گئی۔ اس حملے کے دوران پاکستان کے ہاتھ جو اسلحہ لگا اس میں ایک بھاری مشین گن، دو ہلکی مشین گنیں، چار مشین گنیں، تیس رائفلیں اور ایک راکٹ لاسچر شامل تھا یہ تجربہ تخریب کاروں اور ان کے آقاؤں کو اتنا منگنا پڑا کہ وہ دو اڑھائی ماہ تک سر نہ اٹھا سکے۔

۲۲ اکتوبر کو اس پوسٹ پر ایک اور دھاوا ہوا لگیا۔ اب مکتی باہنی کے ساتھ بھارت کی باقاعدہ فوج بھی حملے میں شریک تھی۔ یہ حملہ بھی ناکام رہا جس میں ایک افسر سمیت دشمن کے ۹ آدمیوں کو نقصان پہنچا۔

۱۴ نومبر کو دشمن نے ایک اور بھر پور کوشش کی جو کامیاب رہی۔ اس روز اس نے ۳ اگا رڈز ٹیلین اور مکتی باہنی سے حملہ کیا۔ اس دفعہ اس نے سامنے سے سر کرانے کے بجائے پہلوؤں سے پیش قدمی کی۔ اس آٹنا میں دشمن کا توپ خانہ کمال پور پوسٹ پر گولہ باری کرتا رہا۔ وہ اس سرحدی چوکی کے گرد گھیر ڈالنے میں کامیاب ہو گیا۔ کمال پور میں ہماری کل نفری ستر باقاعدہ فوجیوں اور چند ریجنز اور رضا کاروں پر مشتمل تھی جن کی قیادت کیپٹن احسن ملک کے سپرد تھی۔ اس نفری کے علاوہ احسن کے پاس ۱۰ ملی میٹر کی تین مارٹر توپیں بھی تھیں۔

جب دشمن نے اس چوکی کو چاروں طرف سے کاٹ دیا، تو ٹیلین ہیڈ کوارٹر بجھتی گنج سے ایک دستہ روانہ کیا گیا تاکہ وہ دشمن کے حصار کو توڑ کر چوکی کو آزاد کر سکے۔ اس دستے کے ساتھ دو مارٹر توپیں بھی روانہ کی گئیں تاکہ وہ توپ خانے کا کام دے سکیں۔ یہ ملک اپنی منزل کی طرف روانہ ہو گئی، مگر اسے قطعاً علم نہ تھا کہ دشمن کا گھیر لگنا وسیع ہے۔ یہ ابھی ٹوکوں پر سوار جا رہے تھے کہ دشمن نے سڑک کے دونوں طرف سے ان پر فائر کر دیا۔ فوجی جو ان کو دیکھ کر نیچے اترے اور جوابی فائر کرنے لگے، مگر دشمن کا پتہ بھاری رہا۔ ہمارے دس آدمی ہلاک اور سات زخمی ہوئے جن میں ایک افسر بھی تھا۔ ہماری چاروں گاڑیاں (جن پر یہ نفری گئی تھی) دونوں مارٹر توپیں اور ایک ہلکی مشین گن دشمن کے ہاتھ لگی۔

سرحدی چوکی سے رابطے کی یہ کوشش بہت منگلی پڑی۔ اب ہمارے لیے دو ہی راستے تھے۔ ایک یہ کہ کمال پور والوں سے کہتے کہ میاں جیسے بھی ہو، اجتماعی یا انفرادی طور پر وہاں سے نکل آؤ یا پھر انہیں وہیں رکھ کر پیچھے سے بھاری ملک روانہ کرتے تاکہ دشمن محاصرہ اٹھا کر پسپا ہونے پر مجبور ہو جائے۔ اول الذکر طریق کار سرکاری پالیسی کے خلاف تھا، اس کے علاوہ کمال پور پوسٹ خالی کرنے کا یہ بھی نقصان ہو سکتا تھا کہ ہمیں اس کی سیدھ میں باقی سرحدی چوکیوں یعنی نقشبئی، اور باروماری کو خالی کرنا پڑتا تھا جس سے مشرقی جانب ۳۳ پنجاب کا بائیں پہلو ننگا ہو جاتا تھا۔ دوسرے لفظوں میں کمال پور پوسٹ خالی کرنے سے پورے بریگیڈ کی دفاعی لائن کو پیچھے لانا پڑتا تھا۔

اگرچہ دشمن نے وسط نومبر سے کمال پور پوسٹ کو بٹالین سے کاٹ دیا تھا، مگر وہ اس کو ہڑپ نہ کر سکا تھا۔ یہ چوکی اب بھی اُس کے گلے میں ہڈی کی طرح اٹکی ہوئی تھی، کیونکہ اس کے جیلے محافظوں نے تہیہ کر رکھا تھا کہ جب تک راشن اور ایموشن ساتھ دیتے ہیں، یہ پیچھے نہیں ہٹیں گے، چنانچہ یہ اپنی جگہ ڈٹے رہے۔ کیپٹن احسن نے ۲۲ نومبر کو ایک چھوٹی سی گشت پارٹی پوسٹ سے باہر بھیجی تاکہ پتہ کرے دشمن کہاں کہاں اور کتنی تعداد میں ہے۔ یہ گشت پارٹی واپس نہ آئی۔ اُس نے اس کی تلاش میں ایک اور پارٹی روانہ کی، مگر وہ بھی غائب ہو گئی۔ اس کا مطلب یہی ہو سکتا تھا کہ دشمن بھاری تعداد میں چوکی کے باہر بیٹھا ہے اور یہاں سے جو کوئی نکلتا ہے، اُسے ہڑپ کر جاتا ہے۔ تیسری پارٹی بھی جیسا سرسرقاقت تھی، لہذا کیپٹن احسن نے وائس پریٹلین میڈیکو آرٹرز سے درخواست کی کہ وہ اپنے بہتر وسائل کو بروئے کار لاتے ہوئے ان گمشدہ پارٹیوں کو تلاش کرنے کی کوشش کریں۔

بٹالین میڈیکو آرٹرز نے ایک فوجی دستہ فوراً اس کام کے لیے روانہ کیا۔ بلکہ اس کے ساتھ ایک ٹرک فالتو بھیج دیا تاکہ اگر وہ اپنی زخمی (یا مردہ حالت) میں ملیں تو اٹھا کر لے آئیں۔ دشمن جو ہر ملک پر نظر رکھے ہوئے تھا، اس دستے پر بھی ٹوٹ پڑا، ہمارے کئی آدمی زخمی ہو گئے۔ فالتو گاڑی بھی چھین گئی، البتہ چند سپاہی واپس بٹالین میڈیکو آرٹرز (بخشی گنج) پہنچنے میں کامیاب ہو گئے۔

اگلے تین روز برابر اسی قسم کی کوششیں ہوتی رہیں، مگر کوئی کامیاب نہ ہوئی۔ آخر کار ۲۴ نومبر کو بٹالین کے کمانڈنگ آفیسر فیٹن کرنل سلطان کو خیال آیا کہ اس طرح کام نہیں چلے گا۔ انہوں نے ایک فیصلہ کن حملے میں حصار توڑ ڈالنے کا فیصلہ کیا۔ جس کے لیے انہوں نے اپنی ساری پلٹن کو تین دستوں میں بانٹا۔ ایک دستے کو حکم دیا کہ وہ سیدھا سڑک پر چلتے ہوئے کمال پور کی طرف پیش قدمی کرے اور باقی دو دستوں کو تاکید کی کہ وہ سڑک کے دونوں جانب پھیل کر سرحدی چوکی کی جانب روانہ ہوں۔ تینوں دستوں سے کہا گیا کہ ان کا کام دشمن کو بھگانا نہیں، بلکہ گھیرے میں لے کر اُسے نیست و نابود کرنا ہے۔

جونہی یہ تینوں دستے کمال پور کی طرف بڑھنے لگے، بھارتی توپخانے کے دیدبان (OBSERVER) نے ان پر توپوں کے گولے برسائے شروع کیے۔ ہمارا ہر اول دستہ گولہ باری سے پھینکنے کے لیے زمین پر لیٹ گیا۔ اب ان پر چھوٹے ہتھیاروں سے فائرنگ شروع ہو گئی۔ اوپر دشمن کے جیٹ طیارے منڈلانے لگے۔ گویا کہہ رہے ہوں کہ اگر کچھ کسر باقی ہے تو پوری کر دیں۔ اس شدید مزاحمت کی وجہ سے رابطے کی یہ کوشش ناکام ہو گئی۔

۲۴ اور ۲۸ نومبر کی درمیانی رات کو دشمن نے کمال پور پوسٹ پر ایسا زبردست حملہ کیا جس سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ اس کا نفاذ ختم کرنے کا تہیہ کر چکا ہے۔ حملہ نصف شب کو شروع ہوا۔ سب سے آگے اس کی ۱۳ گارڈز بٹالین کی سی کمپنی تھی، ہمارے جوان سینٹ کے مورچوں میں بیٹھے تھے اور ان کے غورائیم سینٹ سے بھی زیادہ سخت تھے۔ انہوں نے کمال تحمل سے دشمن کو آگے بڑھنے دیا۔ جب وہ ان کے ہتھیاروں کی موثر زد میں آگیا، تو انہوں نے اپنے تمام ہتھیاروں سے اُس پر فائر کھول دیا۔ دشمن اس اچانک بوچھاڑ کی تاب نہ لا کر پیچھے ہٹ گیا۔ اگلی صبح جب کیپٹن احسن کے جوان اپنی رات کی "کمانی" دیکھنے کے لیے نکلے تو انہیں دشمن کی ۳۰ لاشیں ملیں جن میں سے ایک تو پخانے کے دیدبان کی تھی۔ ایک جوان رینگتا ہوا اُس کی لاش تک گیا اور اس کے قبضے سے گولہ باری کا تمام پلان برآمد کر لایا۔

ماہ نومبر کے آخری دو مہینوں کی مسلسل جنگ سے دو باتیں ثابت ہو گئیں۔ اول یہ کہ ہم چوکی تک کسی قسم کی کمک پہنچانے میں ناکام ہو گئے تھے۔ دوئم یہ کہ دشمن بھی اس الگ تھلگ چوکی کو ہڑپ کرنے میں کامیاب نہ ہو سکا تھا۔ ہمارے لیے باعث اطمینان



بات یہ تھی کہ شدید مشکلات کے باوجود محصور جوانوں کے حوصلے بہت بلند تھے۔ مگر جنگ لڑنے کے لیے حوصلے کے علاوہ ایمونیشن اور راشن وغیرہ کی بھی ضرورت ہوتی ہے جو اس پوسٹ پر قائم ہونے کو تھا، چنانچہ کیپٹن آسن نے مزاحمت کو طول دینے کے لیے راشن اور ایمونیشن کا "کوٹہ" مقرر کر دیا اس نے کہا کہ ہر جوان روزانہ ایک چپاتی کم کھائے گا اور صرف اشد ضرورت کے تحت فائر کھولے گا۔ اپنے پیٹ پر پتھر باندھنا آسان، مگر ایمونیشن پر کنٹرول کرنا مشکل تھا، کیونکہ جب بھی دشمن شہرت کرتا، اسے سبق سکھانے کے لیے فائر کرنا پڑتا۔ بعض سپاہی تو اتنے حساس ہو گئے تھے کہ رات کو اگر کوئی جھاڑی بھی ہتی، گیدڑ کھالتا یا مینڈک ٹرتا، تو وہ رائفل کی لیبی دبا دیتے۔

سب سے اہم حالات ان پانچ جوانوں کی تھی جو زخمی ہو کر چوکی میں پڑے تھے، انہیں پیچھے لانے کی کوئی صورت نہ تھی۔ وہاں رکھ کر ان کا علاج معالجہ مشکل تھا۔ چوکی میں صرف ایک نرسنگ اسٹنٹ تھا جو صرف مرہم بھی کر سکتا تھا اور بوقت ضرورت درد دور کرنے والی گولی دے سکتا تھا۔ دو اؤں کے ساتھ ساتھ خوراک کی حالت بھی تلی تھی۔ گوشت بڑی کا تصور ختم ہو چکا تھا، صرف خشک راشن یعنی دال روٹی پر گزارہ تھا جو روز بروز کم ہوتی جا رہی تھی شروع شروع میں زخمیوں کو گھونٹ بھر شوربا دینے کے لیے فاختائیں اور جنگلی کبوتر مل جاتے تھے، اب دن رات کی ترتر کے بعد وہ بھی کوچ کر چکے تھے۔

اس کے باوجود عزم و استقامت کی علامت کمال پور پوسٹ اپنی جگہ پر قائم تھی۔

۲۹ نومبر کا ذکر ہے کہ ۳۱ بلوچ کے باہمت کمپنی کمانڈر میجر ایوب نے فیصلہ کیا کہ خواہ اس کی جان چلی جائے وہ ضرور چوکی تک لے گیا۔ پہنچا کر انہیں گے۔ انہوں نے اپنے ساتھ چند جانثار اور رضا کار لیے۔ رضا کاروں نے اپنے سروں پر ایمونیشن کے ڈبے اور راشن کے تھیلے اٹھائے ہوئے تھے۔ میجر ایوب اور ان کے ساتھی سڑک سے دور ہٹ کر کھیتوں میں سے ہوتے ہوئے آگے بڑھنے لگے۔ کبھی کوئی پگڈنڈی سامنے آجاتی، تو اس پر ہولیتے، مگر جب خیال آتا کہ یہ پگڈنڈی کہیں انہیں سیدھی دشمن کی پوزیشن میں نہ لیجائے، اسے چھوڑ دیتے۔ یوں بچتے بچاتے وہ کمال پور پوسٹ کے قریب پہنچ گئے۔ اتنے میں دشمن نے فائر کرنا شروع کر دیا۔ میجر ایوب تو بہت کر کے آگے بڑھ گئے اور چوکی میں پہنچ گئے، مگر رضا کار وہیں سامان پھینک کر لیٹ گئے۔ اور جب فائر کم ہوا، تو رینگتے ہوئے واپس سبھی گنج آ گئے۔

میجر ایوب کی آمد سے اگرچہ کمال پور والوں کو ایمونیشن کی کوئی اضافی گولی دستیاب نہ ہوئی، نہ ایک وقت کا آٹا، مگر وہ خوش تھے کہ کوئی ان کی خبر لینے کے لیے اپنی جان جو کھوں میں ڈال کر آیا ہے۔ میجر ایوب نے ایمونیشن کی حالت پوچھی، تو انہیں بتایا گیا کہ ہلکی مشین گن کی دو سو گولیاں تین انچ دہانے والی مارٹر کے بارہ گولے اور دو انچ دہانے والی مارٹر کے دس گولے باقی ہیں۔ اس کے علاوہ اوسطاً ہر سپاہی کے پاس رائفل کی ۵ گولیاں ہیں۔ میجر ایوب نے واپس آ کر یہ صورت حال اپنے کمانڈنگ آفسیر کے گوش گزار کر دی۔

میجر ایوب کے بعد کوئی کمال پور پوسٹ نہ پہنچا۔ خالی ہاتھ نہ راشن اور ایمونیشن سمیت۔ جب تک گولیاں ان کے پاس رہیں ہمارے جوان وہاں پڑے دشمن کا مقابلہ کرتے رہے، حتیٰ کہ ۳۰ دسمبر کو کھلی جنگ چھڑ گئی۔ اب دشمن نے پوری قوت سے اس روڑے کو اپنے راستے سے ہٹانے کا فیصلہ کیا۔ ۳۱ دسمبر کی صبح کو چند ہیلی کاپٹر کمال پور پوسٹ کے اوپر چکر کاٹتے دکھائی دیے۔ ہمارے سپاہیوں کے چہرے تمنا اٹھے کہ شاید ڈھاکہ سے انہیں نکالنے کے لیے آئے ہیں۔ یہ درحقیقت دشمن کی چلیں تھیں جو اس تلاش

کر رہی تھیں۔ اُوپر یہ حالت تھی اور نیچے دشمن اپنا گھیرا تنگ کرتا جا رہا تھا۔
 میجر ایوب جو کمال پور پوسٹ کی حالت خود دیکھ کر آئے تھے، کمال پور پہنچنے کے لیے بے چین تھے۔ انہوں نے ۲۴ دسمبر کو وہاں
 لکک پہنچانے کی ایک اور کوشش کی مگر راستے میں ہی شہید ہو گئے۔ یہ پلٹن کے لیے بہت بڑا نقصان تھا جس کی اطلاع پاکر سرحدی
 پوسٹ اور پیچھے بٹالین ہیڈ کوارٹر میں یاس کی لہر دوڑ گئی۔

اسی سہ پہر (۲۴ دسمبر) کو ایک بنگالی سویلین سفیر رومال ہلا تا ہوا کمال پور پوسٹ پہنچا۔ اس نے کیپٹن احسن کو بھارتی کمانڈر کا یہ
 پیغام دیا کہ کیوں بیکار اپنی اور اپنے ساتھیوں کی جان گنواتے ہو۔ چھوڑو بہت ہو گئی اب ہتھیار ڈال دو۔ کیپٹن احسن نے تندوتیز
 جواب دے کر اسے ٹوٹا دیا۔ مگر بعد میں سوچنے لگا کہ اگر میں اپنے سپاہیوں کو جنگ جاری رکھنے کے لیے مزید ایمنیشن نہیں
 مہیا کر سکتا، تو کیا انہیں یوں موت کے مُنہ میں جھونکنا سراسر زیادتی نہیں۔ اس نے اپنے تجربہ کار جے سی او اور چند دیگر
 حضرات سے مشورہ کیا۔ وہ اس نتیجے پر پہنچے کہ مزید مدافعت بیکار ہے۔

اسی رات کمال پور چوکی دم توڑ گئی!

اس کے فوراً بعد دوسری سرحدی چوکیوں یعنی نقشی اور بیروماری کو بھی خالی کرنا پڑا، کیونکہ تینوں چوکیاں سرحد کے ساتھ ساتھ
 ایک لائن میں تھیں اور اس طرح کی دفاعی ترتیب کا نقصان یہی ہوتا ہے کہ جب ایک کڑی ہٹالی جائے تو سارا سلسلہ پیچھے ہٹنا
 پڑتا ہے، چنانچہ ۳۱ بلوچ نے دریائے برہم پتر کے شمال میں شیر پور کو اپنا نیا دفاعی مرکز بنایا اور اس کے مشرق و مغرب میں نئی
 چوکیاں جینیہ گتی، کوریہ اور جلگن چار کے مقامات پر بنائیں۔ ۳۱ بلوچ کی نئی دفاعی لائن کے پیش نظر ۳۳ پنجاب کو سرحد سے پیچھے
 ہٹنا پڑا۔ اس نے اپنا نیا دفاعی مرکز سرچ گھاٹ میں بنایا جو شیر پور کی سیدھ میں پڑتا تھا۔ گویا اس سیکٹر میں نیا دفاعی خط دریائے
 برہم پتر کے شمال میں شیر پور اور سرچ کے درمیان سے گزرتا تھا۔

۵ دسمبر کی سبج کو دشمن نے شیر پور کے مغربی جانب دباؤ ڈالنا شروع کیا۔ وہاں ہماری ایک چھوٹی سی پوسٹ تھی جو جلگن چار کے مقام
 پر واقع تھی۔ وہ بارڈر سے شیر پور کو آنے والی پٹی سڑک سے ہٹ کر تھی۔ اس کی طرف ایک کچا راستہ جاتا تھا۔ جہاں تھا کہ دشمن اس کچے
 راستے کے بجائے پٹی سڑک پر بڑھتا ہوا شیر پور سے ٹکرائے گا جہاں ہم دفاع کے لیے تیار بیٹھے ہوں گے، لیکن اس نے پہلے کی
 طرح یہاں بھی ہماری توقع پوری کرنے سے انکار کر دیا اور کچے راستے سے ہوتا ہوا جلگن چار جا پہنچا۔ اس پوسٹ کے انچارج نوجوان
 انسرن نے شیر پور اطلاع دی کہ دشمن کا دباؤ بڑھ رہا ہے اور ہمارے پاس ایمنیشن کم ہے، ممکن ہے ہم زیادہ دیر یہاں ٹھہرنہ سکیں۔
 یہ خبر سننے ہی ۳۱ بلوچ کے سیکنڈ این کمانڈ میجر فضل اکبر، ایمنیشن اور مزید نفری لے کر جلگن چار کی طرف روانہ ہو گئے۔ ابھی وہ شہر
 سے باہر تھے (۲) جنکشن ہی پہنچے تھے کہ آگے سے انہیں جلگن چار والی نفری واپس آتی ہوئی نظر آئی۔ انہوں نے اسے روکا اور
 وہیں نئی دفاعی لائن قائم کرنے کا حکم دیا۔ جب مورچے کھودنے کی باری آئی، تو پتا چلا کہ سلجے اور کڈالیں بھی نہیں ہیں قریب ترین
 دیہات کی طرف رجوع کیا گیا، تو وہاں سے محبت وطن بنگالیوں نے نہ صرف کڈالیں وغیرہ مہیا کیں بلکہ پاکستان کو بچانے کے لیے
 مورچے کھودنے میں بھی مدد دی۔

ادھر مہین سنگھ میں بیٹھے برکیدیہ قادر گڑھ رہے تھے کہ ۳۱ بلوچ نے کیا کیا۔ اس نے پہلے سرحدی چوکیاں چھوڑیں —
 پھر بخشی گنج سے اپنا بٹالین ہیڈ کوارٹر اکھاڑا۔ اور پھر ایک ہی جہت میں شیر پور تک پہنچ گئی۔ ان کا خیال تھا کہ یہ زیادہ

سپاہِ انوار بیگم ۱۹۷۷ء بیگم مرتیبا رفیق ۱۹۷۷ء

سے زیادہ وقت میں کم سے کم علاقہ دینے کی صریح احکامات ورزی ہے۔ اس سے نہ صرف ۳ بلوچ کی دفاعی پوزیشن متاثر ہوئی تھی، بلکہ سارے بریگیڈ کو پیچھے ہٹنے پر مجبور کر دیا تھا۔ اب انہوں نے جگن چار سے پسپائی کی خبر سنی، تو اور جزبہ ہوئے۔ انہوں نے لیفٹیننٹ کرنل سلطان کو حکم دیا کہ وہ دوبارہ جگن چار پر قبضہ کریں، مگر کرنل سلطان نے پیش قدمی کے بجائے ایک جست اور پیچھے لگائی اور دریائے برہم پتر پار کر کے جمال پور پہنچ گئے۔ کرنل صاحب کا خیال تھا کہ دریا کے شمال میں ٹھہرے رہنے کے بجائے اس کے جنوبی کنارے سے دشمن کا بہتر طور پر مقابلہ کیا جاسکتا ہے۔ ان کی اس حرکت سے ان کے دائیں جانب ۲۳ پنجاب کو بھی سرچہ گھاٹ سے ہٹ کر مین سنگھ آنا پڑا۔ گویا ہر ڈیسمبر تک ہماری دفاعی لائن سرحد سے ملتی ملتی مین سنگھ اور جمال پور میں آگئی۔ ان دونوں شہروں میں جو دفاعی قلعے سمجھے جاتے تھے، راشن اور ایمونیشن کے کافی ذخائر موجود تھے۔ دریا کے جنوبی کنارے پر بروقت آکر بیٹھ جانے کا ایک فائدہ یہ تھا کہ دشمن جب بھی دریا پار کرنے کی کوشش کرے گا، اسے بھون کر رکھ دیا جائے گا۔

دشمن نے پہلی بار ۷ دسمبر کو فضا ٹیہ اور توپ خانے کی مدد سے جمال پور پر گولے برسائے شروع کیے۔ پہلے دن ان کا زیادہ اثر نہ ہوا۔ جمال پور گریڈیشن کے محافظ سمجھنے لگے کہ وہ کافی عرصے تک "آہرن" کی طرح "تھوڑوں" کی ضربیں سہہ لیں گے۔ دفاعی نقطہ نظر سے یہ ایک اچھی حکمت عملی تھی، لیکن ہم نے اوپر دیکھا ہے کہ باقی سیکٹروں میں یہ کامیاب نہیں ہوئی۔ دیکھیے یہاں کیا بیٹتی ہے؟

اگرچہ ہمارے دفاعی انتظامات جمال پور میں تھے، ہم نے سپاہیوں کی ایک چھوٹی سی ٹکڑی دریائے برہم پتر کے پار بٹھا رکھی تھی تاکہ وہ دشمن کی پیش قدمی کی اطلاع دے سکے۔ جب دشمن کی فضا ٹیہ اور توپ خانہ جمال پور پر گولہ باری کر رہے تھے، تو اس کی تری فوج کے دستے دریائے برہم پتر کی طرف بڑھ رہے تھے۔ انہیں دیکھ کر ہمارے سپاہیوں کی یہ ٹولی بھی واپس آگئی اور جمال پور دشمن کا حملہ روکنے کے لیے تیار ہونے لگا۔ دوپہر کو دشمن کا کمانڈر دریا کے پار اپنے چند سینئر افسروں سمیت نظر آیا۔ غالباً یہ اس کا "اوگروپ" (O GROUP) تھا۔ ان افسروں کو گولی مارنے کو بہت جی چاہا، مگر وہ ہمارے چھوٹے ہتھیاروں کی مار سے باہر تھے، البتہ اس اوگروپ کا کمانڈر ایک بارودی سرنگ (مان) پھینکنے سے زخمی ہو گیا۔ وہ واپس چلا گیا اور اس کی جگہ ۱۰ کیوئی کمیشن زون کا نیا کمانڈر میجر جنرل ناگرہ مقرر ہوا۔

اگلے تین روز ہم جمال پور اور مین سنگھ میں بیٹھے ہوئی جہازوں اور توپوں کے گولے سہتے اور دشمن کی پیش قدمی کا انتظار کرتے رہے، مگر اس کے کوئی آثار نظر نہ آئے۔ کیا اسے دریا پار کرنے کی بہت نہیں پڑ رہی تھی؟ کیا وہ پیش قدمی کا ارادہ ترک کر چکا تھا؟ کیا ہماری یہ دفاعی لائن ناقابل تسخیر تھی؟

اس عرصے میں بھارتی فوج کے بریگیڈیئر کلیر (CLERE) نے لیفٹیننٹ کرنل سلطان کو ایک خط بھیجا جس میں انہوں نے لکھا کہ جمال پور کے چاروں طرف گھیر اکمل ہو چکا ہے، پاکستانی فوج کا بیچ نکلنا مشکل ہے۔ اوپر سے ہماری فضا ٹیہ کے کئی اہکواڈرن بمباری کرنے کو تیار کھڑے ہیں، بہتر ہوگا آپ انسانی جانوں کے بیجا ضیاع سے گریز کریں اور ہتھیار ڈال دیں۔ کرنل سلطان نے ایک جوابی خط

لے یہ گروپ جنگی صورت حال کے پیش نظر نئے طریق کار پر غور کرتا ہے اور وہیں موقع پر کمانڈر اپنے ساتھی افسروں کو فوری احکام دیتا ہے۔

نہ ہو سکا۔ ہماری سچی کھپی نفری چھوٹی چھوٹی ٹولیوں میں بٹ کر اس نزعے سے نکل گئی۔ دوسرا گروہ جو جمال پور میں بیٹھا اس بات کا منتظر تھا کہ حصار ٹوٹے، تو یہ بھی نکلیں وہیں کا ہو کر رہ گیا۔ بعد میں انہوں نے وہیں اپنے آپ کو دشمن کے حوالے کر دیا۔ ان میں سے خال خال آدمی اپنی ہمت پر ڈھاکہ کی طرف نکلنے میں کامیاب ہوئے۔

۳۱ بلوچ کے یوں بکھر جانے کا مطلب یہ تھا کہ بریگیڈیر قادر کے اس منصوبے پر عمل نہیں ہو سکتا تھا کہ دونوں پلٹیں مادھو پور جنگشن یا چوراہے پر اکٹھی ہوں اور پھر باقاعدہ مل کر کلیا کیر کی طرف روانہ ہوں۔ جب بریگیڈیر قادر نے دیکھا کہ ۳۱ بلوچ مذکورہ جگہ پر پہنچنے میں ناکام رہی ہے، تو انہوں نے اس چوراہے پر میجر سرور کی ایک کمپنی اور میجر ای۔ جی شاہ کی ہلکی توپیں (مارٹر) ۳۱ بلوچ کی رہنمائی کے لیے چھوڑیں اور خود اپنے حفاظتی دستے سمیت تشکیل کی طرف روانہ ہو گئے۔

بریگیڈیر قادر اور ان کے ساتھی ۱۱ دسمبر کی صبح کو تشکیل پہنچ کر سستانے لگے۔ البتہ ان کے ساتھ لیفٹیننٹ کرنل اکبر، جو سول آرڈ فورسز کے کمانڈر تھے، کلیا کیر کی طرف روانہ ہو گئے۔ ابھی وہ بمشکل دو یا تین کلومیٹر ہی گئے ہوں گے کہ انہوں نے دیکھا راستے میں تازہ تازہ بارودی سرنگ (MINE) پھٹی ہے جس کا نقشہ انہوں نے میرے سامنے یوں کھینچا:

”سڑک کے ایک کنارے پر ایک گاڑی اونڈھی پڑی تھی۔ ساتھ ہی ڈرائیور خون میں لت پت تڑپ رہا تھا، ڈرائیور لیفٹیننٹ کرنل سلطان ہاتھوں پر سر رکھے پریشان بیٹھے تھے۔ اتنے میں اتفاقاً ۳۱ بلوچ کا ایک بھٹکا ہوا سپاہی وہاں سے گزرا، اس نے اپنے کمانڈنگ آفیسر کو دیکھا، تو فوراً سیلوٹ کیا۔ کرنل نے چیخ کر کہا: ”میرے جوان کہاں ہیں، میری پلٹن کدھر ہے؟ سپاہی شاید یہی سوال اپنے کمانڈنگ آفیسر سے کرنا چاہتا تھا، مگر خاموشی سے سیلوٹ کر کے آگے نکل گیا۔ میں سلطان کو واپس اپنے ساتھ تشکیل لے آیا۔“

اکبر اور سلطان نے بریگیڈیر قادر کو بارودی سرنگ کے حادثے سے آگاہ کیا اور بتایا کہ دشمن نے راستے میں غالباً ایسی بہت سی سرنگیں بچھا رکھی ہیں؛ حالانکہ یہ تاثر حقیقتِ حال کے برعکس تھا، کیونکہ اسی سڑک سے ہمارے کئی جوان گزر رہے تھے اور تھوڑی دیر بعد وہاں بھارتی سپاہی گاڑیاں چلا رہے تھے، بہر حال یہ خبر سن کر بریگیڈیر قادر سوچنے لگے کہ اب انہیں کیا کرنا چاہیے؟ اب سہ پہر ہو چکی تھی۔ سورج اپنا دن بھر کا ادھا سفر طے کر کے مغرب کی طرف روانہ ہو چکا تھا۔ بریگیڈیر قادر اور ان کے چند اٹان آفیسر سڑکٹ ہاؤس کی سفید عمارت کے برآمدے میں کھڑے کسی روشن خیال کی آمد کا انتظار کر رہے تھے۔ اتنے میں اچانک دشمن کے بار بردار طیارے آگئے۔ انہوں نے تشکیل کے شمال میں کالی مٹی کے قریب چھاتہ بردار فوج اتارنا شروع کر دی۔ دوسری طرف نگاہ اٹا کر جنوبی طرف تشکیل کے متروک فضائی مستقر کے پاس بھی چھاتہ بردار فوج اتر رہی تھی۔ ان کے ساتھ ضروری جنگی سامان بھی پیراشوٹ کے ذریعے اتارا جا رہا تھا۔ ایک پیراشوٹ سے لٹکا ہوا سامان دیکھ کر ایک اٹان آفیسر چلا آیا: ”ارے! یہ تو تین اعشاریہ سات دہانے کی توپ لگتی ہے۔“

بریگیڈیر قادر نے جھٹ اپنی آٹین گن نکال کر بھارتی جہازوں کی طرف گولیاں داغ دیں۔ یہ گولیاں اپنے ٹارگٹ تک تو کیا پہنچیں، بریگیڈیر صاحب کا غصہ نکالنے میں مفید ثابت ہوئی۔ اس کے فوراً بعد انہوں نے میجر سرور کو (جو مادھو پور سے تشکیل پہنچ چکے تھے) حکم دیا کہ جاؤ، جا کر دشمن کی اس چھاتہ بردار فوج کا قلع قمع کر دو۔ میجر سرور فوراً حکم کی تعمیل کے لیے روانہ ہو گئے۔ آدھ لٹنٹ بعد وہ واپس آ کر کہنے لگے: ”سر، مقامی لوگوں کا خیال ہے یہ چینی سپاہی ہیں جو ہماری امداد کو آٹے ہیں۔“ اگرچہ یہ خبر ہمارے جذباتی



ميجر جنرل راول فرمان علي

گورنر مشرقی پاکستان کے بیٹے



ڈاکٹر اسے ایم۔ مالک

گورنر، مشرقی پاکستان

مذہب کے عین مطابق تھی، مگر اس میں حقیقت کا کوئی شائبہ نہ تھا، کیونکہ اگر چینی چھاتہ بردار فوج آ بھی جاتی، تو اُسے اترنے سے پہلے ہمارے کمانڈر سے پوچھنا پڑتا کہ اترنے کے لیے کونسی جگہ محفوظ ہے، کونسا ملاقات دشمن کے قبضے میں ہے اور کونسا ہمارے پاس ہے؟ ایسا کوئی رابطہ بریگیڈیر قادر سے قائم نہیں کیا گیا تھا؛ لہذا انہیں بھی اس کی تصدیق پر شبہ ہوا اور انہوں نے ابتدائی جھلمل کے بعد سنجیدگی سے اگلے اقدام کے بارے میں سوچنا شروع کیا۔ وہ جانتے تھے کہ مناسب نفری کے بغیر تنگیل میں بیٹھ کر لڑنا مشکل ہے۔ انہیں یہ بھی احساس تھا کہ ان کا بریگیڈ اب بریگیڈ نہیں رہا، وہ مختلف ٹولیوں میں بٹ چکا ہے؛ لہذا انہوں نے فیصلہ کیا کہ چھاتہ بردار فوج سے اُلجھنے کے بجائے کلیا کیر کی طرف روانہ ہونا زیادہ مناسب ہے۔ ڈھاکہ والوں کا حکم بھی تو یہی تھا۔

بریگیڈیر قادر باقاعدہ فوج، سول آرڈ فورسز، ریجنل اور پولیس کے چھ سو سپاہیوں اور کوئی درجن بھرا فوسز پر مشتمل نفری کے کراٹا کے پونے چھ بجے تنگیل سے روانہ ہوئے، وہاں اب سرکٹ ہاؤس پر پاکستانی پرچم تنہا رہ گیا تھا۔ ہمارے انخلا کے بعد جب مکتی باہنی والے وہاں پہنچے، تو انہوں نے اسے تار کر وہاں بنگلہ دیش کا پرچم بلند کر دیا۔

۹۳ بریگیڈ کے بعض اجزا (مثلاً میجر ای جی شاہ اور ان کی چھوٹی توپیں) ابھی مادھوپور کے پاس ہی تھیں، انہوں نے جب دیکھا کہ ۳۱ بلوچ کا سُرخ نہیں مل رہا، تو وہ بھی جنوب کی طرف چل پڑے۔ انہوں نے راستے میں 'کالی ہٹی' کے قریب چھاتہ بردار فوج اترنے دیکھی، تو ان میں سے بعض واپس پلٹ گئے اور بعض سڑک چھوڑ کر پلٹنڈیوں پر نکل گئے۔

جب بریگیڈیر قادر اور اُن کے ساتھی اس مقام پر پہنچے جہاں لیفٹیننٹ کرنل سلطان کو بارودی سرنگ پھٹنے کا حادثہ پیش آیا تھا، تو اکاؤنٹا فائر کرنے کی آوازیں آئیں۔ غالباً یہ مکتی باہنی کے ارکان تھے، مگر بریگیڈیر قادر انہیں دشمن کی بھاری جمعیت سمجھے۔ انہوں نے بارودی سرنگوں اور مسلح دشمن سے ٹکر لینے کے بجائے سڑک سے کنارہ کشی کر کے کھیتوں کی راہ لینے کا فیصلہ کیا۔ انہوں نے اپنی ساری نفری کو تین ٹولیوں میں بانٹ کر تین افسروں کے حوالے کر دیا کہ لوبھی تم جانو اور تمہارا کام، خود آٹھ افسروں اور اٹھارہ سپاہیوں کو لے کر کھیتوں میں چلے گئے۔

بریگیڈیر قادر اور اُن کے ۲۶ ساتھی تین دن اور چار راتیں کھیتوں میں دھکے کھاتے رہے کبھی وہ کسی جھیل کی طرف جا سکتے اور کبھی دلدل میں جا پھنستے، جہاں جو تکس ان کی ٹانگوں سے چمٹ جاتیں یا جنگلی گھاس کے ریشے اُن کے پاؤں پکڑ لیتے۔ جب یہ پانی اور دلدل سے بچ کر خشکی کی راہ لیتے، تو دیہات میں پھیلی ہوئی مکتی باہنی سے واسطہ پڑ جاتا۔ اس صبر آزما سفر میں اُن کے پاس زادراہ نہیں تھا کہ اُن کا ساتھ دیتا۔ اگر کسی کی جیب میں چند روپے تھے بھی تو کوئی بنگالی انہیں قیمتاً بھی خوراک مہیا کرنے کو تیار نہ تھا۔ انہیں اس آزمائش میں صرف ایک خداترس آدمی ملا جس نے انہیں اپنے گھر سے پانی پینے دیا، ورنہ وہ سبز پتے کھا کر اور جو ٹرولر سے گندہ پانی پی کر گزارا کرتے رہے۔ سفر کے تیسرے دن وہ درختوں کے ایک جھنڈ میں پڑے سستارہے تھے کہ ایک افسر درخت کی ایک تازہ ٹہنی توڑ کر لایا اور اسے بریگیڈیر قادر کے حضور پیش کرتے ہوئے کہنے لگا: "سر، اس کے پتے آہستہ آہستہ چبائیے، اس سے پیاس بجھتی ہے، میں نے ابھی آزما کر دیکھا ہے، لیجیے نا۔"

۱۴ دسمبر کو یہ لوگ تنگیل روڈ پر کلیا کیر کے شمال میں جانکلے گزشتہ تین چار دنوں میں اس سڑک پر دشمن کی باقاعدہ آمد و رفت شروع ہو چکی تھی۔ اُس کی فوج دھڑا دھڑا ڈھاکہ کی طرف بڑھ رہی تھی۔ بریگیڈیر قادر اور اُن کے ساتھیوں نے دشمن کی نقل و حرکت میں خلل ڈالنے کے بجائے سڑک سے ذرا پرے ایک جھنڈ میں پناہ لی اور ایک میجر کو روانہ کیا کہ جا کر دیکھو کہیں اپنے سپاہیوں کا بھی کوئی سُرخ ہے کہ نہیں؟

وہ واپس آیا، تو اُس کے ساتھ سکھوں کی ایک مسلح پارٹی تھی جس نے آکر ان تھکے ہارے مسافت کے ماروں کو حراست میں لے لیا۔ ساری جنگ میں اس لحاظ سے یہ سب سے اہم واقعہ تھا کہ ایک بریگیڈ بریڈمن کے ہاتھ آگیا تھا۔

۹۳ بریگیڈ کے جو بکھرے ہوئے اجزا جنوب کی طرف آ رہے تھے، انہیں کوئی خبر نہ تھی کہ کلیا کیر کہاں واقع ہے، انہوں نے اس سے پہلے اس کی ریکی کرنا تو درکنار اس کا نام تک نہیں سنا تھا۔ وہ چلتے چلتے ۴ اڈمبر کو ڈھاکہ پہنچ گئے، جہاں میں نے انہیں وارد ہوتے دیکھا۔ بُرا حال تھا بیچاروں کا! حجامت بڑھی ہوئی، ہونٹوں پر پٹریاں جمی ہوئی، وردی کچھڑ اور خون کے دھبوں سے اُٹی ہوئی، بعض سپاہیوں کے پاس ہتھیار نہ تھے اور بعض کے بوٹ غائب تھے۔ فائدہ چہرے، بیخواب آنکھیں! اس سے قبل کہ وہ ڈھاکہ کے دفاع میں کوئی کردار ادا کر سکتے، انہیں فوری آرام کی ضرورت تھی۔ آئیے اب دیکھیں کہ خود ڈھاکہ نے جنگ کے دن کس طرح گزارے۔

آغاز کیا جس کا لقب باب یہ تھا کہ حالات کبھی ایک سے نہیں رہتے۔ زندگی دُصوب جھاؤں سے کبھی اچھے دن آجاتے ہیں اور کبھی بُرے
 جرنیلوں کو بھی کئی ٹیٹب و فزاز کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ کبھی فتح کی روشنی سے اُن کا چہرہ دکنے لگتا ہے اور کبھی شکست کے سایے اُن کی شہرت
 کو کجلا دیتے ہیں۔ گورنر مالک نے ابھی آخری جملہ کہا ہی تھا کہ جنرل نیازی کا چوڑا چکلا جسم یکایک کیکانے لگا اور اُن کی آنکھوں سے آنسو
 بہ نکلے۔ انہوں نے دونوں ہاتھوں سے اپنے چہرے کو ڈھانپ لیا اور پتروں کی طرح سسکیاں بھرنے لگے۔ گورنر نے اپنا بزرگانہ اور شہخاں
 ہاتھ بڑھا کر جنرل نیازی کے کندھے پر رکھا اور تسلی دیتے ہوئے کہا: جنرل صاحب گھبرائیے مت! ایک کمانڈر کی زندگی میں کٹھن دن آہی
 جاتے ہیں آپ بہت نہ ہاریں! اللہ عظیم ہے!

جس وقت جنرل نیازی بلک رہے تھے، گورنر ہاؤس کا ایک بنگالی بیراچائے کا خوان اٹھائے کمرے میں داخل ہوا۔ اسے فوراً ایک
 افسر نے جھاڑ پلا کر واپس کر دیا۔ اس نے باہر آکر اپنے ساتھیوں کو بتایا: اندر صاحب لوگ رو رہے ہیں۔ یہ بات گورنر کے پنجابی طہری
 سیکرٹری نے سنی تو اس نے ڈانٹ کر انہیں چپ کر دیا۔

یوں گورنر مالک کو جنگی صورت حال کا ایسا اندازہ ہوا جو موٹر سے موٹر الفاظ میں بھی پیش نہیں کیا جاسکتا تھا۔ انہوں نے جنرل نیازی کی
 شکستوں کے بعد کمانڈیر اخیال ہے مجھے اس خراب صورت حال سے صدر کو مطلع کر دینا چاہیے تاکہ وہ جنگ بندی کا اہتمام کر سکیں۔
 جنرل نیازی کا سر ابھی تک چھاتی کی طرف دٹکا ہوا تھا۔ انہوں نے سر اُپر اٹھائے بغیر ہولے سے کہا: میں تمہیں کروں گا۔ چنانچہ گورنر
 نے صورت حال پر مبنی ایک تار صدر ریجنی خاں کو روانہ کر دیا۔

جنرل نیازی واپس اپنے ہیڈ کوارٹر میں آئے تو دروازے بند کر کے اپنے کمرے میں بیٹھ رہے۔ اگلی تین راتیں اور تین دن
 انہوں نے اسی ذہنی کیفیت میں گزارے۔ مجھے اس وقت اس بات کا اندازہ نہ تھا کہ ان پر کیا بیت رہی ہے۔ میں حسب معمول ۸
 اور ۹ دسمبر کی رات کو ان کے کمرے میں گیا۔ انہوں نے کُسنیاں اپنی میز پر گاڑ رکھی تھیں اور سر دونوں ہاتھوں کے پیلے میں رکھا ہوا تھا۔
 باہر سے آنے والے کو چہرہ صاف دکھائی نہیں دیتا تھا، اس لیے میں نہیں کہہ سکتا کہ وہ اس وقت واقعی رو رہے تھے؛ البتہ ان کی ذہنی
 کیفیت کا اندازہ اس جملے سے ہوتا ہے جو انہوں نے اس موقع پر مجھ سے کہا۔ انہوں نے فرمایا: سالک! شکر کرو کہ تم آج جرنیل نہیں
 ہو۔ اس سے بیشک ان کے گہرے کرب کا احساس ہوتا تھا۔ وہ مجھے بے بس لگے۔ میں وہاں سے چلا آیا، لیکن ساری رات ان
 کے الفاظ میرے کانوں میں گونجتے رہے، مجھے ان پر بہت ترس آیا۔

۹ دسمبر سے ۹ دسمبر تک تین دن جنرل نیازی پر بھاری گزے۔ اس عرصے میں ان کے تقریباً سبھی ڈویژن اپنی سالمیت اور تنظیمی
 یگانگت کھو بیٹھے تھے۔ بہت سے علاقوں میں ان کی فوجیں ان دفاعی لائنوں سے بہت پیچھے ہٹ چکی تھیں جن کے متعلق کہا جاتا تھا
 کہ ان سے پیچھے ہٹنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ انہیں انگریزی میں LINE OF NO PENETRATION کہا جاتا تھا۔ مزید مایوسی کی
 وجہ یہ تھی کہ مغربی پاکستان محاذ پر بھی پیش قدمی کے امکانات ختم ہو گئے تھے جہاں غیر معمولی فتوحات حاصل کرنے کی توقع تھی؛ کیونکہ مشرقی
 پاکستان کا دفاع مغربی پاکستان سے ہونا تھا۔

قدتی طور پر اس عرصے میں جنرل نیازی کی شوخی اور لطیف گوئی ہرن ہو چکی تھی۔ وہ اپنے کمرے سے بہت کم نکلتے اور عموماً تھیلے کو تزیح
 دیتے، لیکن جب بھی نظر آتے، بچے بچے سے لگتے۔ ان کی طبیعت میں شوخی کے بجائے چڑچڑاہٹ آچکا تھا۔ ان کی آنکھیں ان کی بے خوابی
 کی غمازی کرتی تھیں۔ ذمہ داریوں کا بھاری بوجھ ان کے چہرے کے سبھی خدو وخال میں جھلک رہا تھا۔

اسی اثنا میں آل انڈیا ریڈیو اور دوسرے غیر ملکی نشری ادارے ہماری پسپائی کی خبریں بڑھا چڑھا کر پیش کر رہے تھے۔ اس پر مزید المیہ یہ تھا کہ ہمارے بنگالی بھائی ریڈیو پاکستان کے بجائے ان غیر ملکی اداروں کو زیادہ قابل اعتماد سمجھتے تھے۔ انہی دنوں بی بی سی نے اعلان کیا کہ جنرل نیازی اپنی فوج کو چھوڑ کر مغربی پاکستان جاگ گئے ہیں۔ اس نشریے سے جنرل نیازی بہت جڑ بڑھوئے اور ۱۰ دسمبر کو اچانک ڈھاکہ انٹر کانٹینینٹل میں جا دھکے۔ ہوٹل کی لابی میں جو شخص بھی ان کے سامنے آیا انہوں نے جھٹاکر کہا، بی بی سی والا کدھر سے ہے میں اس کو بتانا چاہتا ہوں کہ میں ابھی تک مشرقی پاکستان میں موجود ہوں اور میں اپنے سپاہیوں کو کبھی چھوڑ کر نہیں جاتا۔ وہ ہوا میں یہ اعلان کر کے ایسٹرن کمانڈ ہیڈ کوارٹر آگئے۔

جنرل نیازی جسمانی طور پر ڈھاکہ میں موجود تو تھے مگر ان کی موجودگی سے جنگی صورت حال پر کوئی خوشگوار اثر نہیں پڑ رہا تھا اور نہ ڈھاکہ میں رہنے والوں (خاص کر غیر ملکی شہریوں) کو اعتماد تھا کہ جب تک جنرل نیازی موجود ہیں ان کی جانیں محفوظ ہیں۔ پنجابیوں پٹھانوں اور بہاریوں کے لیے تو کوئی راہ فرار تھی نہیں وہ بے چارے تو اپنے اپنے گھروں میں دیکھے وقت آخر کا انتظار کرتے رہے، لیکن غیر ملکیوں نے اس ڈوبتے جہاز سے باہر نکلنے کا فیصلہ کر لیا۔ انہیں نکالنے کے لیے ۸ دسمبر کو اقوام متحدہ نے طیاروں کا بندوبست کیا، لیکن ڈھاکہ ایئر پورٹ کا رن وے ناقابل استعمال ہونے کی وجہ سے وہ نہ جاسکے۔ آئندہ چند روز میں وہ پرواز کرنے میں کامیاب ہو گئے۔

بے یقینی اور عدم تحفظ کا احساس صرف سوئین آبادی تک محدود نہ تھا، اس کا اثر دفاعی حلقوں میں بھی ہو چکا تھا۔ مجھے یاد ہے کہ دو فوجی افسر جن کے کندھوں پر آدھ پاؤ پیٹل چمک رہا تھا، یکے بعد دیگرے میرے پاس آئے اور کہنے لگے، تمہیں جنرل نیازی کا قُرب حاصل ہے تم اسے کیوں نہیں کہتے کہ حقیقت پسندی سے کام لے، ورنہ ہم سب کتوں کی موت فرمائیں گے۔ میں نے یہ کہہ کر ان سے معذرت کر لی کہ سپیک ریلیشنز آفیسر کا یہ کام نہیں کہ وہ جنگی معاملوں میں کمانڈر کے فیصلوں پر اثر ڈالنے کی کوشش کرے۔ میں نے جنرل نیازی سے اس موضوع پر کوئی بات نہ کی، البتہ ۸ اور ۹ دسمبر کی درمیانی رات کو جب جنرل فرمان علی مجھے ایسٹرن کمانڈ ہیڈ کوارٹر سے باہر بل گئے، تو میں نے تذکرہ ان افسروں کے احساسات ان تک پہنچائے۔ انہوں نے جواباً کہا، ہاں گورنر بھی اس بارے میں فکر مند ہیں، مگر جنرل نیازی کا اپنا زاویہ نگاہ ہے۔ بہر کیف ہم اس سلسلے میں کچھ کریں گے؟ اگلے دن گورنر نے صدر پاکستان کو ایک تار دیا جس میں صورت حال کا ذکر کرنے کے بعد کہا گیا، میں ایک مرتبہ پھر آپ پر زور دوں گا کہ آپ جنگ بندی اور سیاسی تصفیے پر غور کریں۔ جنرل یحییٰ خاں نے، ۹ دسمبر والے تار کی طرح اس تار کو بھی نظر انداز کر دیا۔ غالباً اس کی ایک وجہ یہ تھی کہ مشرقی پاکستان کی جنگی صورت حال کے مالک و مختار تو جنرل نیازی تھے جو متواتر اپنی اور اپنی سپاہ کی اعلیٰ دفاعی صلاحیتوں کی رپورٹیں بھیج رہے تھے ڈاکٹر مالک گورنر سسی انگریزی جنگی حالات کے بارے میں ان کی رائے کیا اہمیت رکھتی ہے؟

ایسٹرن کمانڈ نے پہلی مرتبہ ۹ دسمبر کو صورت حال کی نزاکت کا اقرار کیا اور جی ایچ کیو کے نام ایک پیغام (گنل) میں کہا،

(۱) فضا میں دشمن کی برتری کے باعث بھری ہوئی فوج کی صف بندی اور تنظیم ناممکن نہیں۔ مقامی لوگوں کا رویہ انتہائی مختصرانہ ہے۔ وہ دشمن کو ہر ممکن مدد دے رہے ہیں۔ رات کے وقت کئی باہنی کی چھاپہ مار کارروائیوں کی وجہ سے نقل و حرکت مشکل ہے۔ وہ بھارتی فوج کی رہنمائی کرتے ہوئے اسے ہمارے عقب میں لے آتے ہیں۔ ہوائی اڈہ زبردست نقصان کے باعث ناقابل استعمال ہو چکا ہے جس کی وجہ سے گزشتہ تین دنوں میں ہمارے جہاز پرواز نہیں کر سکے اور آئندہ بھی نہیں کر سکیں گے۔



(۲) دشمن کی فضائی کارروائیوں سے ہمارے بحاری ہتھیاروں اور جنگی سامان کو سبید نقصان پہنچا ہے۔ ہمارے جوان تامل بڑی جرات سے لڑتے ہیں مگر ان پر تھکان اور دباؤ کے آثار نمایاں ہو رہے ہیں۔ وہ گزشتہ ۲۰ دن سے سو نہیں سکے، کیونکہ دشمن کے جہاز تو ہیں اور ٹینک مسلسل گولہ باری کر رہے ہیں۔

(۳) صورت حال انتہائی نازک ہے، مگر ہم اپنی استطاعت کے مطابق لڑتے رہیں گے۔

(۴) آپ سے درخواست ہے کہ اس علاقے میں دشمن کے تمام ٹھکانوں پر فضائی حملوں کا اہتمام کریں اور اگر ممکن ہو تو ڈھاکہ کے دفاع کے لیے جہازوں کے ذریعے کمک روانہ کریں۔

جنرل نیازی کے مذکورہ تار (سگنل) نے گورنر مالک کے اندیشے کی تصدیق کر دی۔ اب جنرل یحییٰ کے لیے لازم ہو گیا کہ وہ صورت حال کو سنبھال لینے کے لیے ضروری کارروائی کریں، لیکن انہوں نے صرف یہ کیا کہ موقع کی مناسبت سے ضروری اقدامات کرنے کا اختیار گورنر مالک کو سونپ دیا۔ یہ احکام انہوں نے ایک تار کے ذریعے گورنر مالک کو دیے اور اس کی نقل جنرل نیازی کو بھیج دی۔ اس تار میں لکھا گیا:

از: صدر پاکستان

برائے: گورنر مشرقی پاکستان

اطلاع: کمانڈر ایسٹرن کمانڈ

آپ کا پیغام مل گیا اور اس کا مفہوم پوری طرح سمجھ لیا گیا ہے۔ آپ نے جو تجویز مجھے بھیجی ہے میری طرف سے آپ کو اس پر عمل کرنے کی پوری اجازت ہے۔ بین الاقوامی سطح پر جو اقدامات ممکن ہیں وہ نہیں کر رہا ہوں اور کرتا ہوں گا، لیکن دونوں صوبوں کے درمیان رابطہ نہ ہونے کی وجہ سے میں مشرقی پاکستان کے بارے میں فیصلہ آپ کی صوابدید پر چھوڑتا ہوں، آپ جو فیصلہ کریں گے مجھے منظور ہو گا۔ میں جنرل نیازی کو بھی ہدایت کر رہا ہوں کہ وہ آپ کے فیصلے کے مطابق کارروائی کریں۔ اس تار کے بعد ایک اور تار جنرل عبدالحمید کی طرف سے جنرل نیازی کے نام پہنچا۔ انہوں نے مذکورہ صدارتی تار کے بنیادی نکات ہلانے کے بعد جنرل نیازی کو ہدایت کی کہ وہ جنگ سے متعلق صحیح صورت حال سے گورنر مالک کو باخبر رکھیں تاکہ وہ درست فیصلہ کر سکیں۔ اسی تار میں جنرل حمید نے یہ مشورہ بھی دیا کہ وہ زیادہ سے زیادہ ساز و سامان بروقت تلف کر دیں تاکہ یوگن کے ہاتھ نہ لگ جائے۔ جنرل حمید کے تار کا متن یہ تھا:

از: چیف آف اسٹاف آرمی

برائے: کمانڈر ایسٹرن کمانڈ

بحوالہ: صدارتی تار بنام گورنر جس کی نقل آپ کو دی گئی ہے۔

صدر نے مشرقی پاکستان کے متعلق فیصلہ گورنر پر چھوڑ دیا ہے جو اس بارے میں آپ سے مشورہ کریں گے، کیونکہ کوئی بھی تار صحیح صورت حال کی پوری پوری عکاسی نہیں کر سکتا، اس لیے میرے لیے اس کے سوا کوئی چارہ نہیں رہا کہ میں آپ پر یہ بات چھوڑ دوں کہ آپ موقع پر موجود ہونے کی وجہ سے کوئی درست فیصلہ کر لیں، البتہ ایک بات واضح نظر آتی ہے کہ دشمن جس کو ساز و سامان کی برتری اور کئی باہنی کی حمایت حاصل ہے جلد ہی مکمل طور پر مشرقی پاکستان پر حاوی ہو جائے گا۔ درمیانی

عرصے میں بھی شہری آبادی اور فوج کا بھاری نقصان ہو رہا ہے۔ ان حالات میں آپ کو دیکھنا ہو گا کہ آپ کب تک جنگ جاری رکھ سکتے ہیں اور کس قیمت پر؟ اس کا حقیقت پسندانہ تجزیہ کر کے آپ گورنر کو اپنا عندیہ بتادیں تاکہ وہ صدر کی طرف سے سوچے گئے اختیار کے مطابق کوئی فیصلہ کر سکیں۔ اور اگر آپ انتہائی اقدام پر مجبور ہو جائیں تو زیادہ سے زیادہ جنگی ساز و سامان تلف کر دیں تاکہ دشمن کے ہاتھ نہ لگنے پائے۔ بے باخبر رکھیے گا۔ خدا حافظ!

اگرچہ فیصلہ گورنر پر چھوڑ دیا گیا تھا، مگر مسئلے کا کوئی آسان حل نظر نہیں آتا تھا جسے منتخب کر لیتے، کیونکہ اگر جنرل نیازی جنگ جاری رکھ سکتے، تو مذکورہ تاروں کے تباہی کی ضرورت نہ تھی۔ اگر وہ جی چھوڑ بیٹھے تھے، تو گورنر ان کا حوصلہ نہیں بڑھا سکتے تھے، لہذا گورنر مالک نے ایک ایسا سیاسی تصفیہ تلاش کرنے کی کوشش کی جس کے مطابق مشرقی پاکستان میں اقتدار اس کے منتخب نمائندوں کے حوالے کر کے جاری اور پاکستانی فوجوں کے انخلا کا انتظام کیا جاسکے۔ اس سلسلے میں انہوں نے ڈھاکہ میں موجود اقوام متحدہ کے اسسٹنٹ سیکرٹری جنرل مسٹر پال مارک ہنری سے رابطہ قائم کیا اور جنرل فرمان علی اور چیف سیکرٹری مظفر حسن کی موجودگی میں ایک مراسلہ اس کے سپرد کر دیا، اس کی اطلاع صدر یحییٰ خاں کو بھی کر دی۔ صدر یحییٰ کے نام گورنر کے تاریخی تار کا متن یہ تھا:

از: گورنر

برائے: صدر پاکستان

چونکہ آخری فیصلے کی ذمہ داری آپ نے مجھ پر ڈال دی تھی اس لیے میں آپ کی اجازت سے حسب ذیل دستاویز اسسٹنٹ سیکرٹری جنرل مسٹر پال مارک ہنری کے حوالے کر رہا ہوں (۱) پاکستانی افواج مشرقی پاکستان میں جنگ چھیڑنے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتی تھیں۔ لیکن حالات ایسے ہو گئے کہ انہیں مجبوراً دفاعی اقدامات کرنے پڑے۔ حکومت پاکستان درحقیقت شروع سے ہی مشرقی پاکستان کے مسئلے کو سیاسی طریقے سے حل کرنا چاہتی تھی جس کے لیے مذاکرات جاری تھے۔ (۲) مسلح افواج بیشک کٹھن حالات سے دوچار ہیں مگر وہ اب بھی پوری دلیری سے جنگ جاری رکھ سکتی ہیں مگر مزید خون خرابے اور بے جا جانی نقصان کو روکنے کے لیے میں مندرجہ ذیل تجاویز پیش کرتا ہوں تاکہ موجودہ کشمکش کو سیاسی طریقے سے ختم کیا جاسکے۔ (الف) میں صدر پاکستان کی طرف سے دیے گئے اختیار کے تحت مشرقی پاکستان کے منتخب نمائندوں کو ڈھاکہ میں پُر امن طریقے سے حکومت قائم کرنے کی دعوت دیتا ہوں۔ (ب) میں سمجھتا ہوں کہ مشرقی پاکستان کے باشندوں کی عزت نفس اس بات کا تقاضا کرے گی کہ بھارتی افواج بھی ان کی سرزمین سے نکل جائیں (ج) لہذا میں آپ سے درخواست کرتا ہوں کہ پُر امن انتقالِ اقتدار کے لیے پانچ چیزوں کا اہتمام کریں (اول) فوری جنگ بندی (دوم) پاکستانی افواج کی آبرومندانہ مغربی پاکستان کو واپسی (سوم) ان غیر بنگالیوں کا پُر امن انخلا جو مغربی پاکستان جانا چاہتے ہیں (چہارم) ان تمام لوگوں کا تحفظ جو ۱۹۴۷ء سے مشرقی پاکستان میں مقیم ہیں (پنجم) اس بات کی ضمانت کہ مشرقی پاکستان کے کسی فرد کے خلاف (فوج سے تعاون کے جرم میں) انتقامی کارروائی نہیں کی جائے گی۔ یہ پیش کش کرتے وقت میں واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ ان تجاویز کا مقصد صرف پُر امن طور پر اقتدار کی منتقلی ہے، مسلح افواج کے ہتھیار ڈالنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ مذکورہ تجاویز ناقابل قبول ہونے کی صورت میں ہماری افواج آخری سپاہی تک لڑتی رہیں گی (مراسلہ ختم ہوا)۔ (۳) جنرل نیازی سے مشورہ کر لیا گیا ہے اور وہ آپ کے حکم کی تعمیل کے لیے تیار ہیں۔

مذکورہ بالا مراسلہ اقوام متحدہ کو پہنچتے ہی افشا ہو گیا۔ کئی غیر ملکی نشری اداروں نے اس کی موٹی موٹی باتیں نشر کر دیں۔ اقوام متحدہ میں اُس وقت پاکستان کی نمائندگی نامزد نائب وزیر اعظم ذوالفقار علی بھٹو کر رہے تھے۔ انہوں نے بعض اطلاعات کے مطابق نیویارک سے راولپنڈی پیغام بھیجا کہ مذکورہ مراسلے سے ان کی پوزیشن کمزور ہو گئی ہے، ورنہ وہ چین اور امریکہ کو مدد کرنے پر آمادہ کر رہے تھے؛ چنانچہ ۱۳ دسمبر کو راولپنڈی میں حکومت پاکستان کے ایک ترجمان نے ایک پریس کانفرنس میں جنگ بندی کی تجویز کی تردید کر دی۔ ترجمان نے زور دے کر کہا کہ میں چیلنج کرتا ہوں کہ کوئی شخص ایسی کوئی دستاویز یا بیان مجھے دکھائے جس میں ہتھیار ڈالنے کا ہلکا سا اشارہ بھی کیا گیا ہو۔ اس تردید سے ڈھا کہ کو بھی مطلع کیا گیا، بلکہ تنبیہ کی گئی کہ آپ کو جو فیصلہ کرنے کا اختیار دیا گیا تھا اسے استعمال کرتے وقت متحدہ پاکستان کی سالمیت کا تو خیال رکھتے، آپ تو تجاویز دیتے ہوئے مدد سے آگے نکل گئے۔

عام طور پر اقوام متحدہ کو دیے گئے مذکورہ مراسلے کی ذمہ داری جنرل فرمان علی پر ڈالی جاتی ہے۔ میں نے ان سے پوچھا تو انہوں نے فرمایا کہ یہ تاریخ میرا نہیں، گورنر مالک کا تھا اور ان تجاویز کا مقصد پاکستان کی سالمیت کو زک پہنچانا نہیں، صرف جنگ بندی کے سہانے وقت حاصل کرنا تھا تاکہ ہمارے کمانڈروں کو از سر نو صف بندی کی مہلت مل جائے۔ اگر ہندوستان ہمارے اس اقدام کو جنگ بندی کی خلاف ورزی سمجھتا اور دوبارہ جنگ شروع کر دیتا تو ہم اس وقفے میں اس کے لیے تیار ہو چکے ہوتے۔ انہوں نے مزید کہا کہ جہاں تک اقتدار مشرقی پاکستان کے نمائندوں کے حوالے کرنے کا تعلق ہے، ہمارے پیش نظر وہ نمائندے تھے جو ۱۹۷۰ء کے انتخابات میں منتخب ہوئے تھے اور وہ ابھی تک مشرقی پاکستان میں موجود تھے۔

ان تجاویز کی غرض و غایت سے قطع نظر یہ امر واقعہ ہے کہ حکومت پاکستان کے ترجمان کی طرف سے ان کی پُر زور تردید کے بعد جنگ بندی کا چرچا ختم ہو گیا۔ کم از کم وقتی طور پر! غالباً یچی خاں اُمید لگائے بیٹھے تھے کہ مزید مہلت ملنے سے بھٹو کوئی سزا کی معرکہ انجام دے لیں گے۔

مزید مہلت کا مطلب یہ تھا کہ کسی طرح جنرل نیازی بھی اڑے رہیں اور قبل از وقت ہمت نہ ہار بیٹھیں؛ چنانچہ ان کے مورال کو سہارا دینے کے لیے راولپنڈی نے یہ انوکھی ترکیب نکالی کہ ڈھا کہ کو غیر سرکاری طور پر یہ اطلاع دی کہ بین الاقوامی سطح پر وسیع پیمانے پر عملی امداد حاصل کی جا رہی ہے۔ ہمارے زرد دوست شمال سے اور سفید دوست جنوب سے مداخلت کرنے والے ہیں۔ زرد دوستوں سے مُراد چینی تھے جن کی سرحد شمالی جانب قریب تھی اور سفید دوستوں سے اشارہ امریکہ کی طرف تھا جس کا بحری بیڑہ بحر ہند کے مشرقی کنارے پر تھا۔ اس خوشخبری کو مشرقی پاکستان کے مختلف سیکٹروں میں پھیلا یا گیا تاکہ ہمارے ڈگ گاتے ہوئے سپاہی شہل جا میں بریگیڈیئر قادر کا ۹۲ بریگیڈ جب مسین سنگھ سے سپاہیوں کو ڈھا کہ کی طرف آ رہا تھا، تو اسے بھی تنگیل کے قریب بھارتی چھاتہ برداروں کو دیکھ کر یہی خیال ہوا تھا کہ شاید واقعی ہمارے دوست ہماری مدد کو پہنچ گئے ہیں۔ انہی دنوں میں نے ایسٹرن کمانڈ کے ٹیک ہیڈ کوارٹر کے باہر ایک سپاہی کو دو ہینڈ کے سنستے سے ٹرانسٹر سے کان لگائے دیکھا، اس کی ڈاڑھی بڑھی ہوئی اور ٹوپی پھکی ہوئی تھی۔ میں نے یونہی اس سے پوچھا، بھی کیا خبریں ہیں؟

وہ یاس میں ڈوبے لہجے میں بولا، سُر چینی یا امریکی امداد کی کوئی خبر نہیں!

لے پاکستان نامز، راولپنڈی۔ مورخہ ۱۳ دسمبر ۱۹۷۱ء



راولپنڈی کی طرف سے دی گئی اس طفل تنی کا وقتی طور پر یہ اثر ہوا کہ کیا افسر اور کیا جوان سب کبھی آسمان کی طرف دیکھتے اور کبھی سمندر کی طرف نگاہ رکھتے کہ دیکھتے کب مدد پہنچتی ہے، مگر کوئی نہ پہنچا۔ ایسٹرن کمانڈ ہیڈ کوارٹر بھی اس مدد کے لیے بے چین تھا۔ اس نے راولپنڈی کو کئی ٹیلیفون کھڑکائے کہ بتاؤ بھی کب زرد اور سفید دوست آ رہے ہیں۔ وہاں سے صرف یہی جواب ملا کہ جلد۔۔۔ جب مزید ۴۸ گھنٹے گزر گئے اور دوستوں کے کوئی آثار نظر نہ آئے تو ایک بار پھر راولپنڈی فون کیا گیا کہ بتاؤ بھی کہ وہ کب آ رہے ہیں؟ جواب ملا، بس جلد ہی۔ اس پر پاس کھڑے ایک افسر نے بل کر کہا: ان سے پوچھو کہ ان کا جلد کتنی جلدی آنے والا ہے؟

اس خوشخبری کی تصدیق کے لیے ڈھاکہ میں مقیم چین اور امریکہ کے نمائندوں کو الگ الگ بلا کر پوچھا گیا کہ تم ہی بتاؤ کب مدد پہنچنے والی ہے۔ دونوں نے کسی ایسی کارروائی سے مکمل لاعلمی کا اظہار کیا۔ جھنجھلا کر بریگیڈیئر باقر صدیقی نے ایک بار پھر راولپنڈی فون کیا اور پوچھا: ہمیں صاف صاف بتا دو کہ ہم کب تک دوستوں کا انتظار کرتے رہیں؟ جواب ملا، بس صرف ۳۶ گھنٹے اور۔۔۔ یعنی ۱۲ دسمبر کی شام تک۔ اس عرصے میں جنگ کی صورت حال اور خراب ہو گئی تھی۔ ۹ ڈویژن میں ۱۰ بریگیڈ کھٹنا کے قریب پہنچ چکا تھا اور، ۵ بریگیڈ ہارنگ برج کے ذریعے دریائے گنگا پار کر کے ۱۶ ڈویژن کے علاقے میں داخل ہو چکا تھا جہاں بریگیڈیئر انصاری والا بریگیڈیئر اور بریگیڈیئر جمل والا بریگیڈیئر رہ گیا تھا۔ دشمن رنگ پور بوگرہ روڈ پر آتے ہوئے بوگرہ کے شمال میں آچکا تھا۔ مشرقی سرحد پر ۱۴ ڈویژن دریائے میگھنا عبور کر کے بہرا ب بازار میں قلعہ بند ہو چکا تھا۔ ۳۹ ہنگامی ڈویژن (میجر جنرل رحیم) چاند پور سے ڈھاکہ آتے ہوئے تپٹ ہو چکا تھا اور میجر جنرل جمیل کا ہنگامی ڈویژن (۳۶) جمال پور اور مین سنگھ سے واپس آتا ہوا تتر بتر ہو چکا تھا۔ جہاں جہاں دشمن ہماری دفاعی لائن میں شگاف کر چکا تھا وہاں سے اس کے فوجی دستے اندر داخل ہو رہے تھے۔

اگر دشمن کی آمد کے غوغا سے ہٹ کر اصلی جنگی حالت کا جائزہ لیا جائے تو یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ دشمن ابھی تک ڈھاکہ کے گرد تین بڑے دریاؤں (جمنا، میگھنا اور برہم پتر) کو پار نہیں کر پایا تھا۔ صرف پہلی کاپڑوں کے ذریعے اس کی ایک کمپنی بہرا ب بازار کے جنوب میں (رائے پور اور زنگدی) اتری تھی اور ایک چھاتہ بردار پلٹن ہوائی جہازوں کی مدد سے تنگیل کے پاس وارد ہوئی تھی۔ اس کی باقی ساری فوج، ٹینک اور توپیں ابھی پیچھے تھیں۔ جو لغری دریاؤں کے اس پار اتر چکی تھی وہ ڈھاکہ کو فتح کرنے کے لیے سرسرنما کافی تھی۔ ڈھاکہ کی قسمت کا فیصلہ کرنے کے لیے دشمن کو ابھی اپنے ڈویژن اور بھاری ہتھیار (ٹینک اور توپیں وغیرہ) آگے لانا تھے اور یہ اس وقت تک ممکن نہ تھا جب تک وہ دریاؤں پر عارضی پل نہ باندھ لیتا۔ اور اگر آپ مشرقی پاکستان کے ان مہیب دریاؤں کا خیال کریں تو آپ کو اندازہ ہو گا کہ ان پر پل باندھنا آسان کام نہ تھا۔ ماہرین کا خیال ہے کہ دشمن کو موجودہ گھاٹوں یا نئے پلوں کے ذریعے دریا پار کرنے میں کم از کم ایک مہینہ ضرور لگتا۔ اس کے بعد وہ صبح سنوں میں ڈھاکہ پر دستک دیتا۔ پھر ڈھاکہ پر منحصر تھا کہ اس کی ریڑھ کی ہڈی کتنی مضبوط ہے۔ جہاں تک راشن اور ایمونیشن کا تعلق ہے اس کی کوئی کمی نہ تھی، کم از کم ایک ماہ تک لڑائی با آسانی لڑی جا سکتی تھی۔ اس کے باوجود ایسٹرن کمانڈ کے اوسان خطا ہو گئے۔ اس کی کپکپی کی وجہ غالباً یہ تھی کہ اس کے پاس ڈھاکہ کے دفاع کے لیے پی فوج (ریگولر آرمی) کی ایک پلٹن ہی موجود نہ تھی۔ اس کام کے لیے جو ۵۳ بریگیڈ رکھا گیا تھا وہ وسط نومبر میں فیسی منتقل کر کے میجر جنرل رحیم کے سپرد کیا جا چکا تھا۔ اب جنرل نیازی کو لالے پڑے تو ان کے چیف آف اسٹاف بریگیڈیئر باقر صدیقی نے مختلف سیکٹر کمانڈروں سے کنا شروع کیا کہ وہ ڈھاکہ کے دفاع میں ہاتھ بٹائیں۔ انہوں نے کو میلا میں بریگیڈیئر عاطف سے کہا وہ ڈھاکہ کے مشرقی جانب دریائے میگھنا کے مغربی کنارے پر آکر پوزیشن سنبھال لیں۔ عاطف نے اپنے دفاعی قلعے میں پڑے رہنا زیادہ مفید سمجھا جسے انہوں نے بڑی محنت سے

تیار کیا تھا۔ پھر ۱۴ ڈویژن کے جی اوسی (میجر جنرل قاضی) سے کہا گیا کہ وہ بہراب بازار کو چھوڑیں اور ڈھا کر واپس آجائیں، مگر انہوں نے کشتیوں کی کئی کے باعث تعمیل ارشاد سے معذرت کر لی۔ میجر جنرل نذر حسین شاہ سے درخواست کی گئی کہ ۹ ڈویژن کا ۵۷ بریگیڈ (بریگیڈیئر منظور) جو ان کے علاقے میں پہنچ چکا ہے اسے ڈھا کر روانہ کر دیں۔ انہوں نے بریگیڈ کے بجائے اس کی ایک پلٹن روانہ کر دی، مگر وہ دریائے جمنہ پار نہ کر سکی۔

بے بسی کے اس عالم میں میجر جنرل جمشید کو مجبور کیا گیا کہ وہ بریگیڈیئر قادر والے بریگیڈ (۹۳) کو مہین سنگھ اور جہاں پور سے واپس بلا کر ڈھا کر کے شمال میں کلیا کیر کے قریب لگا دیں تاکہ ڈھا کر کا ایک پہلو تو محفوظ رہے۔ بریگیڈیئر قادر نے بھی ان احکامات کو منسوخ کرانے کے لیے کئی بار جنرل جمشید سے رابطہ قائم کرنے کی کوشش کی، مگر کامیابی نہ ہوئی۔ مجبوراً انہیں پسپا ہونا پڑا۔ اس پسپائی میں ہی اس بریگیڈ کا شیرازہ بکھ گیا جس کا احوال پچھلے باب میں آچکا ہے۔

اگرچہ جنگ کے تیسرے روز بروز بدل رہے تھے اور کامیابی کی کوئی صورت نظر نہ آتی تھی، مگر جنرل نیازی اب بھی اُمید لگائے بیٹھے تھے کہ واقعی شمال سے زبرد دوست اور جنوب سے سفید دوست مدد کو پہنچنے والے ہیں۔ وہ اُمید کی اسی لہ میں اردمبر کو سی ایم ایچ ڈھا کر گئے جہاں ان کے سامنے نصف درجن زمیں پلٹیں کی گئیں جو مغربی پاکستان سے تعلق رکھتی تھیں۔ انہوں نے جنرل صاحب سے درخواست کی کہ ہمیں ملتی باہمی کے درندوں سے بچانے کی تدبیر کی جائے، کیونکہ گزشتہ ماہچ اپریل میں جو عورتیں ان کے ہتھے چڑھ گئی تھیں، ان سے عبرتناک سلوک کیا گیا تھا۔ جنرل نیازی نے انہیں تسلی دی، گھبراؤ نہیں، لگ آنے والی ہے، کل شام تک انتظار کرو۔ اگر حالات خراب ہو گئے اور صورت حال بے قابو ہونے لگی، تو ہم آپ کو ملتی باہمی کے ہاتھوں میں جانے سے پہلے خود ہلاک کر دیں گے۔

ہسپتال سے نکل کر وہ ہوائی اڈے پر تشریف لے گئے جہاں انہوں نے ہماری طیارہ شکن توپوں کی پوزیشنوں کا معائنہ کیا اور جوانوں کو ہر وقت چوکتا رہنے کی ہدایت کی۔ وہ واپس چھاؤنی آنے لگے، تو ہوائی اڈے کے باہر انہیں غیر ملکی مردوں اور عورتوں کا ایک غول نظر آیا۔ انہوں نے اسے اپنے فرار کی افواہوں کی تردید کرنے کا سنہری موقع سمجھا۔ وہ جھٹ جیپ سے اتر کر ان کے پاس پہنچ گئے۔ اس غول میں بہت سے اخبار نویس بھی تھے جنہوں نے انہیں گھیر لیا اور طرح طرح کے سوال کرنے لگے۔ چند سوال و جواب یہ تھے:

سوال: بھارت کا دعویٰ ہے کہ اس کی فوج ڈھا کر کے دروازے پر پہنچ چکی ہے، آپ بتائیے کہ وہ کتنی دُور ہے؟
جواب: خود ہی جا کر دیکھ لو۔

سوال: آپ کے عزائم کیا ہیں؟

جواب: میں آخری سپاہی اور آخری گولی تک لڑوں گا۔

سوال: کیا بھارتی فوج کو ڈھا کر سے دُور رکھنے کے لیے آپ کے پاس کافی تعداد میں فوج موجود ہے؟

جواب: ڈھا کر پہنچنے کے لیے میری لاشس پر سے گزرنا ہوگا۔ انہیں پہلے یہاں سے (اپنی چھاتی ٹھونکتے ہوئے) اپنے ٹینک گزارنے ہوں گے۔

سوالات کی بوچھاڑ جاری تھی اور جنرل نیازی جھلاہٹ میں کسی کا جواب دیتے اور کسی کو ٹال دیتے۔ پھر یکایک وہ اس بوچھاڑ سے نکل کر واپس اپنے زیر زمین ہیڈ کوارٹر میں آ گئے۔

۱۰ دسمبر سے ۱۳ دسمبر کا درمیانی عرصہ جنرل نیازی کے لیے پُر امید وقفے کی حیثیت رکھتا تھا۔ اس عرصے میں وہ مضطرب تو تھے مگر بالکل ہی شکستہ نہ تھے (جو، دسمبر سے ۹ دسمبر تک حالت تھی)۔ اگرچہ اب بھی ان کی شگفتہ مزاجی مفقود تھی، مگر ان کی سسکیاں اور آہ وزاری تمہم ٹپکی تھی۔ وہ اپنے اندر ذہنی خلفشار کو اپنے چہرے پر منکس ہونے سے روکنے میں کافی حد تک کامیاب لگتے تھے۔ معلوم ہوتا تھا کہ بیرونی امداد کی تفل تسلی نے انہیں عارضی طور پر سہارا دیا تھا۔

طبیعت کے اس اتار چڑھاؤ سے قطع نظر جنگ اپنے انداز پر حسبِ معمول جاری رہی۔ بگڑتی ہوئی صورتِ حال کے پیشِ نظر اب یوں معلوم ہوتا تھا کہ صرف ڈھاکہ کی جنگ باقی رہ گئی ہے جس کے لیے جنرل نیازی نے جنرل جمشید کو ذمہ داری سونپ دی۔ آپریشن روم کی مغربی دیوار پر جہاں جنگ کے آغاز میں مغربی پاکستان کا جنگی نقشہ لٹکا ہوا تھا وہاں اب ڈھاکہ شہر اور چھاؤنی کا نقشہ لگا دیا گیا۔ جنرل جمشید ڈھاکہ کے دفاع کے لیے اسی آپریشن روم میں کانفرنس منعقد کرنے لگے جہاں ۳ دسمبر کو بھر پور جنگ چھڑنے پر جنرل نیازی نے ریشمی اسکارف پہن کر چیدہ چیدہ افسروں سے خطاب کیا تھا۔

میجر جنرل جمشید کے نائب بریگیڈیئر بشیر تھے۔ وہ ان فیصلوں کے مطابق نقشے پر ڈھاکہ کے ارد گرد گول گول دائرے لگاتے جاتے تھے جو مجوزہ دفاعی مورچوں کی نشاندہی کرتے تھے۔ سُرخ پنسل سے لگائے گئے یہ دائرے یوں لگتے تھے جیسے سانپ کُندلی ہائے بیٹھے ہیں اور جو نہی انہیں کسی نے چھیڑا یہ فوراً اسے ڈس لیں گے۔

اس کاغذی کارروائی کے مطابق ڈھاکہ کی دو دفاعی لائنیں تھیں۔ بیرونی دفاعی لائن شمال مغرب میں ماہک گنج، شمال میں کلیا کیر، شمال مشرق میں زرائن گنج اور مشرق میں منشی گنج پر محیط تھی۔ ترقی یہ تھی کہ مین سٹگم سے ۹۳ بریگیڈ، بہراب بازار سے ۲۷ بریگیڈ، کومیل سے ۱۱۷ بریگیڈ اور چاند پور سے ۳۹ ہنگامی ڈویژن سپاہیوں کی ترتیب کلیا کیر، زنگدی، داؤد کندی اور منشی گنج میں آجائیں گے۔

اندرونی دفاعی لائن میر پور کے پُل، ٹونگی، ڈیمیر اور زرائن گنج کے ساتھ ساتھ قائم کی گئی تھی۔ خیال تھا کہ اگر دشمن بیرونی دفاعی لائن توڑ کر اندر آ گیا، تو اس دفاعی لائن پر مغرب میں کرنل فضل حمید (کھٹنا فیم)، شمال میں بریگیڈیئر قائم اور مشرق میں بریگیڈیئر منصور اُسے روک لیں گے۔ خود ڈھاکہ شہر کی نگرانی بریگیڈیئر بشیر کے سپرد تھی۔

دفاعی لائنیں تو قائم کر دی گئیں، مگر ان کی حفاظت کے لیے سپاہی کہاں سے آئیں گے؟ جیسا کہ اوپر کہا گیا ہے ڈھاکہ کے دفاع کے لیے باقاعدہ ایک پلٹن بھی نہیں تھی؛ لہذا ایک کانفرنس بلائی گئی تاکہ تمام افسر اپنی عسکری اور نیم عسکری نفری کی نشاندہی کریں کہ وہ کتنی ہے اور اس کے پاس کیا کیا ہتھیار ہیں۔ اس کانفرنس میں باقاعدہ فوج کے زیادہ تر خدمت گزار عملے آرڈی نرس، سگنل، سپلائی، انجینئرز اور ای ایم ای وغیرہ نے شرکت کی اور اس کی کل ۱۲ کمپنیوں کے برابر نفری (تقریباً ڈیڑھ ہزار افراد) کی نشاندہی کی گئی۔ اس طرح سول آرڈ فورسز کے ۱۵۰۰ سپاہی پولیس کے ۱۸۰۰ سپاہی اور ابدز کے ۸۰۰ رضا کار دستیاب ہوئے۔ یوں کل نفری پانچ ساڑھے پانچ ہزار بن گئی۔

ان میں سے اکثر کے پاس تھری ناٹ تھری کی پُرانی رائفلیں تھیں۔ ان کی دفاعی قوت میں اضافہ کرنے کے لیے ادھر ادھر سے مزید ہتھیاروں کا کھوج لگایا گیا جس کے نتیجے میں ۳ انچ دہانے کی تین ہارٹس، چارٹینک شکن توپیں (آر۔ آر)، چھ پونڈ وزنی گولہ بھینکنے والی دو توپیں اور چار ہٹی مشین گنیں مل گئیں۔ مارچ ۱، ۱۹۷۱ء میں استعمال ہونے والے ٹینک اس کے علاوہ تھے۔ اس نفری کو مذکورہ ہتھیاروں سمیت ڈھاکہ کے ارد گرد مستعین کر دیا گیا۔ اس میں اچھی نفری اور بھاری ہتھیار شمالی جانب رکھے گئے

کیونکہ چھاتہ بردار بھارتی فوج کی خبر کے بعد ہی خطرہ تھا کہ سب سے پہلے یہی دستے ڈھا کہ پر حملہ آور ہوں گے۔

کافذ پر یہ دفاعی انتظامات معقول لگتے تھے مگر عملہ زمین پر حالت بالکل مختلف تھی۔ سپاہیوں کے حوصلے پست تھے اور ہتھیار زیادہ تر فرسودہ اور بیکار — کسی کی نالی خراب تھی اور کسی کا نشانہ باندھنے والا حصہ غائب تھا، کہیں ہتھیار پہنچے تھے مگر ایمونیشن غائب تھا اور کہیں ایمونیشن تھا، لیکن ہتھیار نہ تھے۔ ہنگامی طور پر اکٹھی کی گئی یہ نفری اور اس پر مبنی دفاعی انتظامات خاصے کمزور لگتے تھے۔ یوں معلوم ہوتا تھا کہ یہ بے نسبت ایک ہی ٹھوکہ لگنے سے منہدم ہو جائیں گے۔

میں نے اس حقیقت پسندی کا اظہار کیا، تو بریگیڈیئر قاسم جو چھاؤنی کی شمالی سرحد کے نگہبان تھے، مجھے اپنے سیکڑ کے دفاعی انتظامات دکھانے لے گئے۔ وہ جیب چلار ہے تھے اور میں ان کے ساتھ بیٹھا تھا۔ راستے میں وہ ایک جگہ رُکے اور جیب پر بیٹھے بیٹھے کئی ہونی شرک کی طرف اشارہ کر کے کہنے لگے یہاں ہماری بارودی سرنگیں ہیں۔ تھوڑی دور آگے جا کر وہ ایک نیشب کے کنارے کھڑے ہو گئے اور انگلی کے اشارے سے فرمانے لگے کہ وہاں ہماری ٹینک شکن تو ہیں — اور ان سے اور آگے ہمارے ٹینک ہیں۔ ایک جگہ ہم جیب سے اتر کر گن پوزیشن دیکھنے گئے تو وہاں ایک ٹینک شکن توپ دھری تھی، مگر اس کے قریب کوئی آدمی نہ تھا۔ آواز دینے پر ایک سپاہی نمودار ہوا۔ اس نے بتایا کہ اس توپ کا ایمونیشن غلط آگیا تھا، پکتان صاحب صحیح قسم کا ایمونیشن لینے ڈھا کہ گئے ہیں۔ یہ ۱۳ دسمبر کا واقعہ ہے، دورے کے آخر میں ہم ٹونگی سے ذرا ادھر کر میٹولا ایر پورٹ کے قریب رُکے جہاں بریگیڈیئر قاسم نے ایک میجر سے پوچھا: "کون تم کیسے محسوس کرتے ہو؟"

"میں تو ٹھیک محسوس کر رہا ہوں، مگر جو ان سمجھتے ہیں کہ ایک مارٹر اور دو دشمن گنوں سے وہ دشمن کی یلغار نہیں روک سکیں گے۔" احمقانہ باتیں نہ کرنا، انہیں حوصلہ دلاؤ۔ انہیں بتاؤ کہ جنگیں ہتھیاروں سے نہیں جیتی جاتیں۔ میجر خاموش رہا۔

ادھر ایسٹرن کمانڈ ہیڈ کوارٹر میں خیال آرائی ہونے لگی کہ ڈھا کہ شہر کے گلی کوچوں میں کس طرح لڑائی لڑی جائے۔ ایک صاحب نے کہا: ہمیں ڈھا کہ کوٹھالین گراؤ بنا دینا چاہیے۔ دوسرے بولے: پاگل ہو گئے ہو، ٹھالین گراؤ اور ڈھا کہ کا کیا مقابلہ؟ یہاں مقامی آبادی ہمارے خلاف ہے۔ ایک طرف بھارت ہماری سرزنش کرے گا اور دوسری طرف کئی باہنی ہمارا تعاقب کرے گی۔ ہم آوارہ گنتوں کی طرح پھڑک پھڑک کر تباہ ہو جائیں گے۔ گلی گلی لڑنے کا ارادہ ترک کر دیا گیا۔

..... اور ڈھا کہ ڈوب گیا

میجر جنرل رحیم جو چاند پور سے آتے ہوئے زائن گنج کے پاس زخمی ہو گئے تھے، سی ایم ایچ ڈھا کہ میں ابتدائی علاج کے بعد جنرل فرمان کے کھرا رام فرما رہے تھے۔ اس روز دسمبر کی ۱۲ تاریخ تھی۔ بھر پور جنگ شروع ہوئے نو دن ہو گئے تھے۔ جنرل فرمان اگرچہ جنرل رحیم کی خبر گیری کرنے ان کے کمرے میں گئے تھے، مگر حالات کے پیش نظر موضوع لامحالہ جنگ کی طرف منتقل ہو گیا۔ جنرل رحیم نے حتی طور پر کہا کہ اب جنگ بندی کے بغیر چارہ نہیں۔ جنرل فرمان ان کے منہ سے یہ کلمات سن کر حیران ہوئے، کیونکہ جنرل رحیم ہمیشہ بھارت سے طویل جنگ کی بات کرتے تھے اور کہتے تھے کہ اس کو مزہ چکا کہ رہیں گے۔ جنرل فرمان نے کہا، بس دانے تک گئے۔ اتنی جلدی! رحیم نے اپنی رائے پھر دہرائی اور کہا اس باسے میں بلا تاخیر قدم اٹھانا چاہیے۔

ابھی یہ باتیں ہو رہی تھیں کہ جنرل نیازی اور جنرل حبیب اس زخمی جنرل کی عیادت کے لیے تشریف لے آئے۔ جنرل رحیم نے جنرل نیازی سے بھی کہا کہ جنگ بندی کے لیے تاخیر ہو رہی ہے، مگر جنرل نیازی خاموش رہے (اس وقت تک ابھی بیرونی اعداد کا شوشہ ختم نہیں ہوا تھا) جنرل فرمان انہیں وہیں چھوڑ کر اپنے کمرے میں چلے گئے۔

تھوڑی دیر بعد جنرل نیازی جنرل فرمان کے پاس آئے اور کہنے لگے، تو پھر راولپنڈی تاریخ دو نا! اس کا مطلب یہ تھا کہ جنرل نیازی نے حسب معمول جنرل رحیم کا مشورہ قبول کر لیا تھا۔ اب وہ چاہتے تھے کہ جنگ بندی والی تجویز صدر پاکستان کو گورنر ہاؤس سے بھیجی جائے، جبکہ جنرل فرمان کا خیال تھا کہ اس موضوع پر سگنل ایسٹرن کمانڈ ہیڈ کوارٹر سے جانا چاہیے۔ جنرل نیازی نے اصرار کرتے ہوئے کہا، راؤ اس سے کیا فرق پڑتا ہے کہ سگنل یہاں سے جائے یا وہاں سے، میں دراصل ایک ضروری کام کے لیے کیس جا رہا ہوں، سگنل تمہیں سے مجبور دینا! اس سے پیشتر کہ جنرل فرمان ہاں یا نہ کرتے چیف سیکرٹری مظفر حسن تشریف لے آئے۔ انہوں نے جنرل نیازی کا جملہ سنتے ہی کہا، آپ ٹھیک کہتے ہیں سگنل یہیں (گورنر ہاؤس) سے جاسکتا ہے۔ یوں یہ معاملہ رفع ہو گیا۔

جنرل فرمان جنگ بندی کی تجویز کی مخالفت نہیں کر رہے تھے۔ دراصل ان کا بنیادی اختلاف اس بات پر تھا کہ اس کا محرک کون بنے۔ وہ خود اس سلسلے میں پہل نہیں کرنا چاہتے تھے کیونکہ ان کے پہلے سگنل پر راولپنڈی میں ناخوشگوار رد عمل ہوا تھا۔

جنرل نیازی ضروری کام کا بہانہ کر کے چلے گئے اور جنگ بندی سے متعلق تاریخی تار کا ڈرافٹ چیف سیکرٹری مظفر حسن نے تیار کیا۔ جنرل فرمان یہ مستودہ لے کر گورنر کے پاس گئے جنہوں نے اس کی منظوری دے دی۔ اسی شام (۱۲ دسمبر) یہ تاریخی غاں کو روانہ کر دیا گیا۔ اس تار میں انسانی جانوں کا بیجا ضیاع روکنے کے لیے ضروری اقدامات کرنے کی درخواست کی گئی۔

گورنر اور ان کے رفقا اس تار کے جواب کا انتظار کرنے لگے۔ اگلی رات اور اگلادین گزر گیا، لیکن راولپنڈی سے کوئی نامرو پیام

نہ آیا۔ شاید صدر پاکستان اپنی گونا گوں مصروفیات سے اس کا فذ کے پُرزے کے لیے وقت نہ نکال سکے؛ حتیٰ کہ ۱۴ دسمبر آگیا۔ اس روز گورنمنٹ ہاؤس میں ایک اعلیٰ سطحی کانفرنس منعقد ہو رہی تھی۔ سواگیارہ بجے کے قریب اچانک بھارت کے بم ۲۱ طیارے گورنر ہاؤس پر نمودار ہوئے اور گولہ باری کر کے گُزر گئے۔ گورنمنٹ ہاؤس کے مرکزی ایوان کی چھت اڑ گئی۔ بھری اور اینٹوں کا بلہ پیچھے آ رہا۔ ہال میں پڑا ہوا شیشے کا ایک ڈبہ (CASE) چُور چُور ہو گیا اور اس میں تیرنے والی سُرخ رنگ کی زیبائشی مچھلیاں گرم گرم طے پڑنے لگیں۔ گورنر مالک لپک کر پناہ گاہ کی طرف چلے گئے جہاں انہوں نے جلدی جلدی اپنا استعفیٰ لکھا اور جیب میں ڈال دیا۔ گورنر ان کی کاہلی کے وزیر اور اعلیٰ سرکاری ملازمین (جو مغربی پاکستان سے تعلق رکھتے تھے) ہٹل انٹر کانٹینیٹنٹل منتقل ہو گئے جسے انٹرنیشنل ریڈ کراس نے غیر جانبدار علاقہ بنا رکھا تھا۔ ان پناہ گزینوں میں صوبے کے چیف سیکرٹری، انپکٹر جنرل پولیس، صوبائی سیکرٹری ڈھاکہ کے کمشنر اور چند دوسرے افسر شامل تھے۔ غیر جانبدار علاقے میں داخلہ حاصل کرنے کے لیے انہوں نے تحریری طور پر ریڈ کراس کو یقین دلایا کہ ہمارا متحارب ملکوں میں سے کسی سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ (اس کے بغیر وہ اس پناہ گاہ میں نہیں آسکتے تھے)۔

۱۴ دسمبر حکومت مشرقی پاکستان کا آخری دن تھا۔ اس روز گورنمنٹ ہاؤس کا بلہ کیا بکھرنا خود حکومت کا شیرازہ بکھر گیا۔ بنگلہ دیش کی پیدائش ایک ایسے نپتے کی ولادت تھی جسے ماں کا پیٹ چاک کر کے نکالا گیا ہو۔ بھارت یہ آپریشن کر رہا تھا۔ اب اس میں صرف یہ مرحلہ تھا کہ کب مرحلے ہوئے جنرل نیازی اور کلائے ہوئے پاکستانی دستوں سے ہتھیار ڈولنے جائیں۔ ادھر جنرل نیازی بھی اب غیر ملکی امداد سے نا اُمید ہو چکے تھے۔ انہوں نے اب حقائق کو ان کے صحیح پس منظر میں دیکھنا شروع کر دیا تھا۔ انہوں نے صدر مملکت کو۔ جو کمانڈر انچیف بھی تھے۔ سچی سچی رپورٹ بھیج کر ہدایات کا انتظار کرنا شروع کر دیا۔ انہوں نے ۱۳ دسمبر اور ۱۴ دسمبر کی درمیانی رات کو میرے سامنے جنرل حمید (چیف آف سٹاف آرمی) کو ٹیلیفون پر کہا: سز میں نے صدر کو کچھ تجاویز بھیجی ہیں مہربانی کر کے ان پر جلدی کارروائی کروادیں۔ انہوں نے کہا: اچھا!

اگلے دن جنرل یحییٰ خاں نے گورنر اور جنرل نیازی کو جنگ بندی اور لوگوں کے جانی تحفظ کے لیے ضروری اقدامات کا حکم دے دیا۔ جنرل نیازی کے نام جنرل یحییٰ نے لکھا:

”گورنر کا پیغام مجھے مل گیا ہے۔ آپ نے نہایت کٹھن حالات میں نہایت دلیرانہ جنگ لڑی ہے۔ قوم کو آپ پر فخر ہے۔ دُنیا آپ کی تعریف کر رہی ہے۔ جہاں تک انسان کے بس میں ہے میں نے مسئلے کا قابل قبول حل تلاش کرنے کی کوشش کی ہے۔ اب آپ ایسے مرحلے میں ہیں جہاں نہ مزید مزاحمت ممکن ہے اور نہ اس مزاحمت سے کوئی سود مند مقصد حاصل ہو سکتا ہے؛ بلکہ اس سے مزید جان و مال کا نقصان ہوگا۔ آپ کو ان حالات میں مسلح افواج مغربی پاکستان کے رہنے والوں اور دوسرے وفادار لوگوں کی سلامتی کے لیے ہر ممکن کوشش کرنی چاہیے۔ میں نے اس ایشیا میں اقوام متحدہ سے درخواست کی ہے وہ ہندوستان سے مشرقی پاکستان میں جنگ بند کرنے کو کہے اور اس سے ہماری مسلح افواج کے علاوہ ان تمام لوگوں کے تحفظ کی ضمانت مانگے جو شہر پسندوں کی معاندانہ سرگرمیوں کا نشانہ بن سکتے ہیں۔“

مذکورہ بالاتار پراولپنڈی سے ۱۴ دسمبر کو ساٹھے تین بجے سہ پہر نکلا اور مشرقی پاکستان کے وقت کے مطابق ساٹھے پانچ بجے شام ڈھاکہ پہنچا۔ صدر کے اس تار کا منشا کیا تھا؟ کیا یہ جنرل نیازی کے لیے ہتھیار ڈولنے کا حکم تھا یا اس تار کے باوجود وہ اگر چاہتے تو مزاحمت



جاری رکھ سکتے تھے؟ میں اپنی طرف سے اس کی تشریح کرنے کے بجائے قارئین کرام پر چھوڑتا ہوں کہ وہ اس سے خود نتیجہ اخذ کریں۔ جنرل نیازی نے اسی شام جنگ بندی کے لیے اقدامات کا آغاز کر دیا۔ انہوں نے پہلے روسی اور چینی سفارتی نمائندوں کے ذریعے بھارتی کمانڈر ایچیف سے رابطہ قائم کرنے کا سوچا، مگر بالآخر ڈھاکہ میں مقیم امریکی توصل جنرل مسٹر سپیوک (SPIVACK) سے ملنے کا فیصلہ کیا۔ انہوں نے جنرل فرمان سے کہا کہ تم گورنمنٹ ہاؤس میں ہونے کی وجہ سے سفارتی نمائندوں سے ملتے رہتے ہو میرے ساتھ چلو۔ جنرل فرمان تھوڑی سی ہچکچاہٹ کے بعد ان کے ہمراہ ہو لیے۔ جب یہ دونوں اس کے پاس پہنچے، تو جنرل فرمان انتظار گاہ میں بیٹھ گئے اور جنرل نیازی انڈر مسٹر سپیوک کو رام کرنے لگے۔ جھٹ پٹ دوستی پیدا کرنے کے لیے جنرل نیازی جو ہتھکنڈے استعمال کر رہے تھے، ان کی بازگشت باہر بھی سناٹی دے رہی تھی۔ جب جنرل نیازی کو یقین ہو گیا کہ وہ امریکی توصل جنرل سے دوستی بچی کر چکے ہیں، تو انہوں نے مطلب کی بات کہی جس کا جواب اس نے نہایت سرد کاروباری لہجے میں یہ دیا: "میں آپ کی طرف سے جنگ بندی کے لیے بھارت سے مذاکرات نہیں کر سکتا۔ اگر آپ چاہیں، تو آپ کی طرف سے پیغام بھجو سکتا ہوں۔"

اب جنرل فرمان کو بڑھایا گیا کہ وہ بھارتی فوج کے چیف آف اسٹاف جنرل (بعد ازاں فیلڈ مارشل) مانک شا کے نام ایک پیغام لکھیں۔ ایک لیڈی سیکرٹری کو بولا کہ جنرل فرمان نے ایک صفحے کا نوٹ لکھوا دیا جس میں بعض تحفظات کی شرط کے ساتھ جنگ بندی کی پیش کش کی گئی تھی۔ شرائط یہ تھیں (الف) مسلح افواج کا تحفظ (ب) ملٹی باہنی کی انتظامی سرگرمیوں سے وفادار شہریوں کا تحفظ اور (ج) بیماروں اور زخمیوں کا تحفظ۔

مسودہ تیار ہو گیا، تو مسٹر سپیوک نے کہا کہ یہ بیس منٹ میں پہنچ جائے گا آپ جا سکتے ہیں۔ جنرل نیازی اپنے اے ڈی سی کیپٹن نیازی کو وہاں چھوڑ کر جنرل فرمان کے ساتھ واپس آ گئے۔ کیپٹن نیازی رات دس بجے تک وہاں بیٹھے رہے، مگر کچھ نہ ہوا۔ انہوں نے پوچھنا چاہا، تو حکم ہوا کہ تم چلے جاؤ، رات کو سونے سے پہلے فون کر کے پوچھ لینا۔

درحقیقت مسٹر سپیوک نے پیغام جنرل مانک شا کو بھیجنے کے بجائے اپنی حکومت کو واشنگٹن رواز کر دیا تھا جہاں امریکی حکومت کسی قسم کی کارروائی کرنے سے پہلے یقینی خاں سے مشورہ کرنا چاہتی تھی۔ یقینی خاں اس رات اتنے مصروف تھے کہ امریکیوں کو ہاتھ نہ آسکے، بعد میں معلوم ہوا کہ انہوں نے ۳ دسمبر ہی سے مشرقی پاکستان میں دلچسپی لینا بند کر دی تھی۔ انہوں نے دفتر آنا بھی ترک کر دیا تھا۔ عموماً ان کا ملٹری سیکرٹری نقشے پر جنگ کی تازہ ترین صورت حال لگا کر ان کے پاس لے جاتا جس پر وہ کبھی کبھی نگاہ غلط انداز ڈال لیتے تھے۔ سنا ہے ایک دفعہ انہوں نے مشکل جنگی حالت دیکھ کر اتنا کہا تھا "میں مشرقی پاکستان کے لیے کبھی کیا سکتا ہوں؟"

جنرل مانک شا کا جواب ۵ دسمبر کو ملا۔ انہوں نے جنگ بندی کی پیش کش قبول کر لی تھی اور مطلوبہ تحفظات کی بھی ضمانت دے دی تھی بشرطیکہ "پاکستانی فوج ہتھیار ڈال دے۔" اس کے ساتھ ہی اس نے ریڈیائی لہروں کی نشاندہی بھی کر دی جن پر کلکتہ میں بھارتی ایئر فورس کمانڈر کوارٹر سے رابطہ قائم کیا جاسکتا تھا۔

مانک شا کا پیغام راولپنڈی بھیج دیا گیا۔ وہاں سے شام تک (۵ دسمبر) جواب آ گیا جس میں من جملہ دیگر باتوں کے یہ کہا گیا تھا: "میں مشورہ دیتا ہوں کہ آپ ان شرائط پر جنگ بندی قبول کر لیں، کیونکہ یہ آپ کی ضروریات کو پورا کرتی ہیں؛ البتہ یہ یاد رکھیں کہ اس بھوتے کی حیثیت دو مقامی کمانڈروں کے باہمی بندوبست کی سی ہوگی۔ اگر یہ بھوتہ ان کوششوں سے متصاف ہو، جو ہم بین الاقوامی سطح پر کر رہے ہیں، تو اس کو کالعدم سمجھا جائے گا۔"

جنرل نیازی اور جنرل مانگ شا کے درمیان یہ فیصلہ ہوا کہ جنگ بندی کی تفصیلات طے کرنے کے لیے عارضی طور پر ۱۵ دسمبر کی شام کو پانچ بجے سے لے کر اگلے روز ۹ بجے صبح تک سیز فائر کیا جائے۔ بعد میں اس مدت کو ۱۴ دسمبر ۲ بجے سہ پہر تک بڑھا دیا گیا۔

جنرل حمید نے جنرل نیازی کو جنگ بندی کا جو مشورہ دیا تھا، موصوف نے اسے منظوری سمجھ لیا اور اپنے چیف آف سٹاف بریگیڈیر باقر صدیقی کو حکم دے دیا کہ وہ تمام ماتحت جرنیلوں اور بریگیڈیروں کو جنگ بندی کی ہدایات دے دیں۔ تمام سیکٹر کمانڈروں کو ایک صفحے کا جو مراسلہ بھیجا اس میں ان کی شجاعت اور پامردی کی تعریف کرنے کے بعد کہا گیا کہ وہ لڑائی اب بند کر دیں اور اس سلسلے میں اپنے مد مقابل بھارتی کمانڈر سے رابطہ قائم کریں۔ اس ہدایت نامے میں سرنڈر (SURRENDER) کا لفظ کہیں نہیں تھا، صرف آخر میں ایک جملہ یہ تھا: بد قسمتی سے اس اہتمام میں ہتھیار ڈال دینا بھی شامل ہے۔

مذکورہ سگنل ۱۵ اور ۱۶ دسمبر کے درمیان نصف شب کے لگ بھگ جاری ہوا۔ اسے بھیجنے کے بعد آرمی ایوی ایشن کے کمانڈنگ آفیسر لیفٹیننٹ کرنل لیاقت بخاری کو بلا کر حکم دیا گیا کہ وہ اپنے ہیلی کاپٹر راتوں رات اکیاب (برا) لے جانے کی تیاری کریں۔ ان ہیلی کاپٹروں کو نصف درجن نرسوں (جو ۱۶ دسمبر کو جنرل نیازی سے سی ایم ایچ ڈھاکہ میں ملی تھیں) کے علاوہ ان ۲۸ فوجی کنبوں کو بھی لے جانا تھا جو اب تک ڈھاکہ میں پڑے تھے۔ کرنل بخاری نے یہ احکامات بڑے تحمل سے سنے اور فوراً بج آؤری کا وعدہ کیا۔ ان کے چہرے پر پریشانی کے کوئی آثار نہ تھے۔ ان کو یوں نے آج بھی اتنا ہی حوصلہ مند پایا جتنا انہیں مارچ ۱۹۷۱ء کے ہنگاموں یا سیلاب کے دوران امدادی کاموں میں دیکھا تھا۔

یہ ہیلی کاپٹر ایسٹرن کمانڈ ہیڈ کوارٹر اور مختلف سیکٹروں کے درمیان دوران جنگ رابطے کا واحد ذریعہ تھے۔ انہوں نے نہایت نازک حالات میں مختلف علاقوں میں گولہ بارود، ہتھیار اور فوجی دستے پہنچائے تھے۔ ان کی داستان شجاعت رقم کرنے کے لیے ایک الگ دفتر چاہیے۔

دو ہیلی کاپٹر سحری سے پہلے پہلے نکل گئے، مگر تیسرا کسی فنی خرابی کی وجہ سے اڑ نہ سکا۔ وہ اگلے روز دن چڑھے گیا۔ ان ہیلی کاپٹروں میں فوجی کنبوں کے علاوہ جنرل رحیم بھی اہم سرکاری دستاویزات سمیت چلے گئے۔ مگر وہ بد قسمت نرسیں وہیں کی وہیں رہ گئیں۔ ان کو لانے کی ذمہ داری جن افسروں کو سونپی گئی تھی، ان کا کہنا ہے کہ آخر وقت بھی وہ اپنی چھوٹی چھوٹی چیزیں نبھانے لگیں، کسی کو اپنا نیا جوٹا نہیں مل رہا تھا اور کسی کو جراب ہاتھ نہیں آ رہی تھی۔ اس طرح کے لالچ میں انہیں دیر ہو گئی اور ہیلی کاپٹر زیادہ دیر انتظار نہ کر سکے۔ اس کے برعکس یہ بھی سننے میں آیا ہے کہ ان افسروں کو خود جلدی تھی کہ وہ نرسوں کو لاتے لاتے ہیلی کاپٹروں سے کہیں رہ نہ جائیں (وہ واقعی ان ہیلی کاپٹروں میں رہا چلے گئے)۔

جو لوگ ان ہیلی کاپٹروں کے ذریعے ڈھاکہ سے نکل گئے، وہ برما میں چند روز قیام کرنے کے بعد پھر وعافیت کراچی پہنچ گئے۔ ادھر ڈھاکہ میں تاریخی ساعت لمحہ بہ لمحہ قریب آ رہی تھی۔ دشمن ٹینکوں سے ہوتا ہوا ٹوٹی کے قریب آپہنچا جہاں ہمارے ٹینکوں نے اس پر فائر کر کے اسے روک دیا۔ اس فائر سے دشمن کو اندازہ ہو گیا کہ سیدھا ٹوٹی ڈھاکہ روڈ پر بڑھتے ہوئے چھاؤنی میں جا داخل ہونا مناسب نہیں۔ اس نے ملتی باہمی کی مدد سے ایک اور راستہ تلاش کر لیا جو مغربی جانب ہوتا ہوا مانگ گنج کے پاس سے ڈھاکہ شہر کو آتا تھا۔ اس طرف کھٹنا فیم والے کرنل فضل حمید اور ان کی نیم عسکری نفری لگی ہوئی تھی۔ جب انہیں پتہ چلا کہ دشمن کا رخ ان کی طرف ہے، تو وہ بدک کر

واپس ڈھاکہ آگئے۔ ان کے ہٹنے سے دشمن کا راستہ صاف ہو گیا اور وہ شہر کی طرف بڑھنے لگا۔

بریگیڈیئر بشیر کو جو ڈھاکہ شہر کے محافظ تھے، اس کی اطلاع ۱۵ دسمبر کی شام کو ملی۔ انہوں نے بول آرڈر سنز کی منظمی بھرنفری جمع کئے مگر سلامت کی سرکردگی میں شہر سے باہر میرپور پٹنہ پر بھیج دی جو رات ہی کو اپنی پوزیشن پر پہنچ گئی۔ دشمن اب بھی کئی باہمی کی سابقہ اطلاع پر تکیہ کیے بیٹھا تھا کہ میرپور پٹنہ خالی پڑا ہے، لہذا وہ بے دھڑک آگے بڑھ رہا تھا۔ اچانک مگر سلامت کی نفری نے اس پر فائر کر دیا جس سے دشمن چند جاہیں قربان کر کے پیچھے ہٹ گیا۔ اس کی دو جہیں ہمارے ہاتھ آئیں۔

آگے آگے آتے ہوئے جو بھارتی دستہ چوٹ کھا کر پسا ہو گیا تھا وہ اس چھاتر بردار پلٹن کا حصہ تھا جو چند روز پہلے تنگیل کے قریب اتاری گئی تھی۔ اس کے پیچھے مگر جنرل ناگرا آ رہا تھا جو اب بھارت کے COMMUNICATION ZONE کی کمان کر رہا تھا۔ وہ میرپور پٹنہ کے پاس آکر رک گیا۔ وہاں سے اس نے لیفٹیننٹ جنرل نیازی کو ایک مختصر خط لکھا جس میں درج تھا:

پیارے عبداللہ!

”میں میرپور پٹنہ پر ہوں اپنا نامائدہ بھیج دو“

جنرل نیازی کو یہ رقعہ کوئی ۹ بجے صبح (۱۶ دسمبر) ملا جبکہ مگر جنرل جمشید مگر جنرل فرمان اور ریڈیٹر مرل شریف ان کے پاس تھے۔ جنرل فرمان اب بھی اس بات پر اڑے ہوئے تھے کہ ہم نے جنگ بندی کے مذاکرات کے لیے کلکتہ پیغام بھیجا ہوا ہے وہاں سے ان کا کوئی نامائدہ آکر ہم سے بات کر لے گا۔ جنرل نیازی نے جب انہیں جنرل ناگرا کی چٹ دکھائی، تو انہوں نے کہا: کیا وہ بھارت کی ایک رکنی مذاکرانی ٹیم ہے؟ جنرل نیازی نے کوئی جواب نہ دیا۔ دراصل اب ان موشگافیوں کا وقت نہیں تھا۔ اب مسئلہ یہ تھا کہ وہ ڈھاکہ کی دہلیز پر آ بیٹھا ہے، تو اسے خوش آمدید کہنا ہے یا مدافعت کرنا ہے؟ جواب کا انحصار اس بات پر تھا کہ مدافعت کی سکت باقی ہے بھی یا نہیں؟ چنانچہ جنرل فرمان نے پوچھا: کیا کچھ ریزرو فوج باقی ہے؟ جنرل نیازی خاموش رہے۔ ریڈیٹر مرل شریف نے اس انگریزی سوال کا پنجابی میں ترجمہ کرتے ہوئے کہا: کچھ پتے ہے؟ جنرل نیازی نے ڈھاکہ کے محافظ جنرل جمشید کی طرف دیکھا جنہوں نے نفی میں سر ہلا دیا۔ اس پر جنرل فرمان اور ریڈیٹر مرل شریف یک زبان ہو کر بولے: اگر یہ کیفیت ہے، تو جاؤ اور جو وہ کہتا ہے کرو۔

جنرل نیازی نے مگر جنرل ناگرا کے استقبال کے لیے مگر جنرل جمشید کو بھیج دیا۔ وہ سیدھے میرپور پٹنہ پر پہنچے۔ انہوں نے سب سے پہلے مگر سلامت سے کہا: ”سینر فائر“ کے آداب کا خیال رکھو، لہذا مگر سلامت اور ان کے سپاہیوں نے ہلبلی سے اپنی انگلیاں ہٹالیں اور مگر جنرل ناگرا ایک گولی فائر کیے بغیر ڈھاکہ میں داخل ہو گیا۔ اس کے ساتھ منظمی بھرنفری فوج اور ڈھیر ساری فائنا نخت تھی۔ عملاً یہ ڈھاکہ کا اختتام تھا۔ اگرچہ اسے دفن کرنے کی رسوم ابھی باقی تھیں۔ ڈھاکہ یوں چپ چاپ سو گیا جیسے اچانک حرکت قلب بند ہو گئی ہو۔ وہاں کوئی ہاؤس ہونہ ہوئی، کوئی مارکنائی نہ ہوئی۔ سنگاپور، پیرس یا برلن کے سقوط کی کوئی کمانی نہ ڈوب رہی گئی۔ دیکھتے ہی دیکھتے ڈھاکہ غلامی میں ڈوب گیا۔

اسی اثنا میں ایسٹرن کمانڈ کے ٹیک ہیڈ کوارٹر کو سمیٹ لیا گیا۔ دیواروں پر سے جنگی نقشے اتار لیے گئے۔ وہاں پڑے ہوئے ٹیلیفونوں کی روح قبض کر لی گئی۔ بھارتی فوجوں کا استقبال کرنے کے لیے ایسٹرن کمانڈ کے پڑانے ہیڈ کوارٹر کو جھاڑا پونچھا گیا، کیونکہ بریگیڈیئر باقر صدیقی کے بقول ”وہاں ہمارا فریچر عمدہ تھا۔“ طحہ آفسیرزمیس میں مہمانوں کے لیے لہج کا اہتمام کیا گیا۔ ان سب انتظامات کے



روح رواں بریگیڈیئر صدیقی تھے جو انتظامی امور میں خصوصی مہارت رکھتے تھے۔

سپر کو بریگیڈیئر باقر صدیقی اپنے بھارتی مد مقابل (یعنی بھارتی ایسٹرن کمانڈ کے چیف آف اسٹاف) میجر جنرل جیکب کو لینے ایپورٹ تشریف لے گئے۔ اس اثنا میں جنرل نیازی اپنے مہمان "میجر جنرل ناگرا کی تواضع لطیفوں سے کرتے رہے۔ میں ان لطیفوں کو دہرا کر اس المناک گمانی کو غلیظ نہیں کرنا چاہتا۔

میجر جنرل جیکب اپنے ساتھ ایک دستاویز لائے جسے سقوط کی دستاویز (INSTRUMENT OF SURRENDER) کہا جاتا ہے۔ جنرل نیازی اسے جنگ بندی کا مسودہ کنا پند کرتے تھے۔

جیکب نے یہ کاغذات باقر صدیقی کو دیے جنہوں نے جنرل فرمان کے سامنے رکھ دیے۔ جنرل فرمان نے کہا: "یہ ہندوستان اور بنگلہ دیش کی مشترکہ کمان" کیا چیز ہے ہم اسے تسلیم نہیں کرتے۔ اس پر میجر جنرل جیکب نے کہا: "یہ دستاویز ایسے ہی تیار شدہ وہلی سے آئی ہے۔" (یعنی مجھے اس میں رد و بدل کا اختیار نہیں) انڈین طرزی انٹیلی جنس کے کرنل کھیر پاس ہی کھڑے تھے انہوں نے رقمہ دیا "یہ ہندوستان اور بنگلہ دیش کا اندرنی معاملہ ہے۔ جہاں تک آپ کا تعلق ہے آپ صرف انڈین آرمی کے سامنے ہتھیار ڈال رہے ہیں۔ جنرل فرمان نے یہ کاغذات جنرل نیازی کے سامنے سرکا دیے اور کہا: "یہ کمانڈر پر منحصر ہے کہ وہ اسے منظور یا نامنظور کرے۔" جنرل نیازی خاموش رہے۔ اس خاموشی کو مکمل رضا سمجھا گیا۔

تھوڑی دیر بعد لیفٹیننٹ جنرل نیازی بھارتی ایسٹرن کمانڈ کے کمانڈر لیفٹیننٹ جنرل جگجیت سنگھ اروڑہ کو لینے ڈھاکہ ایپورٹ گئے۔ بھارتی کمانڈر اپنی فتح کی خوشی میں اپنی شرمیلی کو بھی ساتھ لایا تھا۔ جونہی یہاں بیوی پہلی کا پٹر سے اترے، بنگالی مردوں اور عورتوں نے اس نجات دہندہ اور اس کی بیوی کو ہاتھوں ہاتھ لیا۔ ان کو پھولوں کے ہار پہنائے، انہیں گلے لگایا، بوسے دیے اور تشکر بھرے جذبات سے انہیں خوش آمدید کہا۔ جنرل نیازی نے بڑھ کر فوجی انداز میں سیلوٹ کیا، پھر ہاتھ ملایا۔ یہ نہایت دلہوز منظر تھا۔ فاتح اور مفتوح، بنگالیوں کی موجودگی میں ایک دوسرے کے آمنے سامنے کھڑے تھے۔ ان کے دلوں میں ایک کے لیے انتہائی نفرت اور انتقام کے جذبات تھے اور دوسرے کے لیے احسانندی اور تشکر کے۔ ان جذبات کو پڑھنے کے لیے کسی چشم بینا کی ضرورت نہ تھی۔ بنگالیوں کا انگ انگ یہی صدا دے رہا تھا۔

جنرل نیازی اور جنرل اروڑہ وہاں سے سیدھے رمنارس گراؤنڈ (جسے سرور دی گراؤنڈ بھی کہتے ہیں) گئے جہاں سیرام جنرل نیازی سے ہتھیار ڈولوانے کی تقریب منعقد ہونی تھی۔ یہ وہی جگہ تھی جہاں، رماچ کو مجیب الرحمن نے بنگلہ دیش کا ایک طرف اعلان آزادی کرنا تھا، مگر آخری وقت وہ ایسا نہ کر پائے تھے۔ آج یہاں دوسری طرح کا اعلان آزادی ہونے والا تھا جس کا نظارہ کرنے کے لیے لاکھوں بنگالی موجود تھے۔ یوں معلوم ہوتا تھا کہ جنرل نیازی کی تذلیل کا منظر دیکھنے کے لیے سارا شہر آٹھ آیا ہے۔

جمع کو بھارتی سپاہیوں نے روک رکھا تھا۔ تقریب کے لیے تھوڑی سی جگہ خالی تھی جہاں ایک چھوٹی سی میز پر بیٹھ کر لاکھوں بنگالیوں کے سامنے جنرل نیازی نے سقوط مشرقی پاکستان کی دستاویز پر دستخط کیے۔ اس کے بعد انہوں نے اپنا رول اور نکال کر اروڑہ کو پیش کر دیا۔ اور یوں سقوط ڈھاکہ پر آخری مہر ثبت کر دی۔ اس موقع پر جنرل اروڑہ نے پاکستانی سپاہیوں کی ایک گارڈ آف آزر کا معاینہ کیا جو اس بات کی علامت تھا کہ اب وہی گارڈ "ہیں اور وہی آزر" کے مستحق!

اس تقریب کے بعد ہم قانونی طور پر جنگی قیدی بن کر جنرل اروڑہ کے زیر کمان آگئے، مگر ڈھاکہ میں ابھی بھارتی فوج اتنی ناکافی

تھی کہ قیدیوں کو کمتی باہنی کی انتظامی کارروائیوں سے بچانے کی کوشش کی جاتی تھی۔ چنانچہ بھارت نے اجازت دے دی کہ پاکستانی قیدی تانکم
 ثانی اپنے چھوٹے ہتھیار ذاتی تحفظ کے لیے اپنے پاس رکھیں۔ یہ ہتھیار ۱۹ دسمبر تک ہمارے پاس رہے۔ مستول تعداد میں بھارتی
 سپاہیوں کے پتھنے کے بعد ڈھاکہ گیرین کے جوانوں سے ہتھیار لیے گئے۔ افسروں سے ہتھیار ڈولوانے کے لیے ڈھاکہ چھاؤنی کے
 گالف کورس میں ۱۹ دسمبر کو ۱۱ بجے صبح ایک تقریب منعقد ہوئی جس میں جنرل فرمان ریڈمرل شریف اور جنرل جمشید سمیت سب
 افسروں نے ہتھیار ڈالے۔ میں بھی اس جمع مذمت میں شامل تھا۔

ڈھاکہ سے باہر باقی مقامات پر کمانڈروں نے اپنے مد مقابل سے طے شدہ پروگرام کے مطابق ۱۶ سے ۲۰ دسمبر کے درمیان
 ہتھیار ڈالے۔

آل انڈیا ریڈیو نے ۱۴ دسمبر ہی سے ہماری شکست کی خبریں نشر کرنی شروع کر دی تھیں جس کی وجہ سے ڈھاکہ اور دوسرے
 مقامات پر غیر بنگالیوں میں خوف و ہراس پھیل گیا تھا۔ ان میں سے اکثر لوگوں نے اپنا گھر بار چھوڑ کر چھاؤنیوں کا رخ کر لیا تھا۔ انہوں
 نے اب بھی اپنے مقدر کو پاکستانی فوج کے مقدر سے وابستہ کرنے کو ترجیح دی۔ ان میں سے ہزار ہا لوگوں کو کمتی باہنی نے راستے
 ہی میں موت کے گھاٹ اتار دیا۔ میں نے اس سلسلے میں کمتی باہنی کے مظالم کے ایسے ایسے واقعات سنے ہیں کہ روگئے کھڑے
 ہو جاتے ہیں۔ یہ واقعات اتنے کثیر اور گہیر ہیں کہ ان کا یہاں احاطہ کرنا ممکن نہیں۔

ہندوستانیوں کے پاس ان بے چاروں کی نگہداشت کے لیے کوئی وقت نہ تھا۔ ان کی نگاہ مالِ غنیمت پر تھی جسے وہ دھڑا
 ٹوکوں بسوں اور ریل گاڑیوں کے ذریعے بھارت لے جا رہے تھے۔ اس میں ہمارا جنگی ساز و سامان، خوراک کے ذخائر، صنعتی مصنوعات
 میٹریل جتنی کہ گھر بیلو استعمال کی چیزیں مثلاً فرج، قالین اور ٹیلی وژن سیٹ وغیرہ شامل تھے۔ نوموود بنگلہ دیش کا اتنا خون چوسا گیا کہ
 جب وہ آزادی کا سانس لینے کے قابل ہوا تو وہ محض ایک ڈھانچہ رہ گیا تھا۔ اس کا احساس بنگالیوں کو ایک سال
 بعد ہوا۔

جب بھارت کو مالِ غنیمت سے فرصت ملی تو اس نے جنگی قیدیوں کو ہندوستان بھیجنا شروع کیا۔ یہ سلسلہ دسمبر ۱۹۴۷ء سے
 جنوری ۱۹۴۸ء تک جاری رہا۔ جنگی قیدیوں میں اہم شخصیتیں (دی آئی پی) جنرل نیازی، جنرل فرمان، جنرل جمشید ریڈمرل شریف
 اور ایئر کومڈور انعام الحق تھے جنہیں ایک بار بردار طیارے کے ذریعے ۲۰ دسمبر کو کلکتہ بھیج دیا گیا۔ میں بھی ان کے ہمراہ تھا۔

ڈھاکہ ایئر پورٹ کو میں نے آخری بار ۲۰ دسمبر کی سہ پہر کو دیکھا۔ اب یہ اس ایئر پورٹ سے قطعاً مختلف تھی جس پر میں نے
 جنوری ۱۹۴۰ء کو پہلی بار قدم رکھا تھا۔ ایک واضح تبدیلی یہ تھی کہ اب یہاں خاکی وردی کے بجائے سبز وردی نظر آرہی تھی۔ یوں معلوم
 ہوتا تھا کہ ان دو سالوں میں بنگالیوں نے صرف آقا بد لے ہیں۔ بنگالی مرد اور لڑکے اب بھی ہوائی اڈے کی بیرونی دیوار پر بیٹھے
 تھے جنہیں بھارتی سپاہی کتوں کی طرح دھتکار رہے تھے۔ میں جب پہلی مرتبہ یہاں پہنچا تھا تو سوج چمک رہا تھا۔ اب ایک ایسی
 رات پڑنے کو تھی جس کی سحر۔ کم از کم۔ مجھے نظر نہیں آرہی تھی۔ میں نے محسوس کیا کہ ڈھاکہ ڈوب چکا ہے۔ آخری بار!

بھارتی طیارہ ہمیں کلکتہ لے آیا جہاں ہمیں ایک تاریخی عمارت فورٹ ولیم میں رکھا گیا۔ یہاں ہم اکٹھے تھے اور ایک دوسرے
 سے مل لیتے تھے۔ فرصت کے ان ایام میں میں نے جنرل نیازی سے انٹرویو کیا تاکہ سقوطِ ڈھاکہ کے متعلق ان کے تاثرات حاصل
 کر سکوں۔ ان دنوں ابھی زخم تازہ تھے۔ محمود الزہرن کیڈشن کا نام و نشان تک نہ تھا۔ جنرل نیازی نے اپنا دفاع پیش کرنے کے لیے

ابھی حقائق کو توڑنا موٹا بھی شروع نہیں کیا تھا۔ وہ مجھ سے آزادانہ گفتگو کرتے رہے۔ ان کے ضمیر پر کسی قسم کا بوجھ نہیں تھا۔ وہ اپنے آپ کو سائے لیتے سے بڑی الذمہ کہتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ سقوطِ مشرقی پاکستان کا ذمہ دار جنرل یحییٰ خاں ہے۔

اس تاریخی انٹرویو کے موٹے موٹے سوال و جواب یہ تھے:

سوال : کیا آپ نے جنرل یحییٰ یا جنرل حمید کو کبھی صاف صاف بتایا تھا کہ آپ کو جو مسائل دیے گئے ہیں وہ مشرقی پاکستان کے دفاع کے لیے ناکافی ہیں؟

جواب : کیا وہ سوچیں ہیں؟ کیا انہیں نہیں معلوم کہ اندرونی اور بیرونی خطرات سے مشرقی پاکستان کو بچانے کے لیے تین انٹرنی ڈویژن ناکافی ہیں؟

سوال : مگر یہ الزام تو ہمیشہ آپ ہی پر ہے گا کہ آپ مشرقی پاکستان کا دفاع نہ کر سکے۔ اگر کم وسائل کے پیش نظر آپ کے خیال میں دفاعی قلموں والی اسٹیجی بہترین حکمت عملی تھی تو کیا وجہ ہے کہ آپ نے ڈھاکہ کو دفاعی قلعہ نہ بنایا جہاں فوج کی ایک کیمپ بھی نہ تھی؟

جواب : یہ سب راولپنڈی والوں کا قصور ہے۔ انہوں نے مجھے نومبر کے وسط میں آٹھ پلٹیں بھیجنے کا وعدہ کیا تھا، مگر صرف پانچ بھیجیں۔ میں باقی تین کا انتظار کرتا رہا کہ وہ آئیں تو انہیں ڈھاکہ کے دفاع کے لیے استعمال کیوں گا۔

سوال : لیکن ۳ دسمبر کو جب آپ پر واضح ہو گیا کہ اب مزید نفی آئی ناممکن ہے تو آپ نے کیوں زاپٹے وسائل میں سے کچھ معیت ڈھاکہ کے لیے مخصوص کر لی؟

جواب : دراصل اس وقت حالات ایسے ہو گئے تھے کہ کسی محاذ سے ایک کیمپ بھی نکالنا مشکل تھا۔

سوال : جو تھوڑے بہت وسائل آپ کے پاس ڈھاکہ میں موجود تھے، اگر آپ ان کو بھی صحیح طور پر استعمال کرتے، تو جنگ کچھ دن اور جاری رہ سکتی تھی۔

جواب : مگر اس کا کیا فائدہ ہوتا؟ ڈھاکہ کی اینٹ سے اینٹ بچ جاتی، گلیوں میں لاشوں کے انبار لگ جاتے، نالیاں اٹ جاتیں، شہری زندگی مفلوج ہو کر رہ جاتی۔ لاشوں کے گلے سڑنے سے طاعون اور دوسری بیماریاں پھوٹ پڑتیں۔ اس کے باوجود انجام وہی ہوتا! میں تو بے ہزار بیواؤں اور لاکھوں یتیموں کا سامنا کرنے کے بجائے تو بے ہزار قیدی واپس لے جانا بہتر سمجھتا ہوں۔

سوال : اگرچہ انجام وہی ہوتا، مگر تاریخ مختلف ہوتی۔ اس سے پاکستان کی عسکری تاریخ میں ایک سُنہری باب کھلا جاتا۔ آئندہ دشمن کو ہماری طرف آنکھ اٹھا کر دیکھنے کی جرأت نہ ہوتی۔

جنرل نیازی خاموش رہے!



پس منظر : ریاست

۱۲ اگست ۱۹۴۷ء

برصغیر ہندوستان تقسیم ہوا۔ دو خود مختار ریاستیں (ہندو) انڈیا اور (مسلم) پاکستان کے نام سے معرض وجود میں آئیں۔ نیا ملک پاکستان مسلم اکثریت کے دو علاقوں پر مشتمل تھا۔ اس کا ایک حصہ ہندوستان کے شمال مغرب میں اور دوسرا شمال مشرق میں واقع تھا۔ شمال مغربی علاقے کو مشرقی بنگال کہتے تھے، جبکہ شمال مغربی حصے میں سندھ بلوچستان، شمال مغربی سرحدی صوبہ اور صوبہ پنجاب کا کچھ حصہ شامل تھا۔ غیر منقسم ہندوستان میں اپنی اکثریت کی وجہ سے ہندو یہ سمجھتے تھے کہ برطانوی تسلط سے آزاد ہونے کے بعد ہندوستان میں سیاسی اقتدار کے وہی حقدار ہیں۔ اس لیے پاکستان کا قیام انہیں ناپسند تھا۔ اس کے ایک ممتاز لیڈر گاندھی نے ہندوستان کی تقسیم کو "مقدس گائے کو دو ٹیم کرنے کا عمل" قرار دیا تھا اور ہندو مہاسبھا کا کہنا تھا کہ "ہندوستان ناقابل تقسیم ہے۔ اس کو جب تک دوبارہ اکٹھا نہیں کیا جائے گا یہاں امن و امان قائم نہیں ہو سکتا۔"

۲۷ اکتوبر ۱۹۴۷ء

ہندوستان نے ریاست جموں و کشمیر پر جبری تسلط قائم کرنے کے لیے مسلم اکثریت کی اس ریاست پر فوج کشی کر دی۔ کشمیریوں نے قبائلیوں کی امانت سے حملہ آوروں کی مزاحمت کی۔ پاکستان کی فوج بھی جو اس وقت ابھی تنظیم کے ابتدائی مراحل میں تھی مئی ۱۹۴۸ء میں اس جنگ میں شامل ہو گئی۔ یکم جنوری ۱۹۴۹ء کو اقوام متحدہ (سکوریٹی کونسل) کی طرف سے جنگ بندی کا نفاذ اس شرط پر عمل میں آیا کہ کشمیریوں کی رائے معلوم کرنے کے لیے استصواب رائے کرایا جائے گا۔ یہ وعدہ کبھی پورا نہ ہوا اور مسئلہ کشمیر آج تک ہندوستان اور پاکستان کے باہمی تعلقات کی راہ میں حائل چلا آ رہا ہے۔ مشرقی پاکستان جو کشمیر سے ۱۶۰۰ کلومیٹر دور واقع تھا، پاکستان کے مغربی بازو کی سی جذباتی شدت کے ساتھ مسئلہ کشمیر سے کبھی وابستہ نہ ہو سکا۔

۲۱ مارچ ۱۹۴۸ء

بانی پاکستان قائد اعظم محمد علی جناح نے جو پاکستان کے پہلے گورنر جنرل بھی تھے، مشرقی پاکستان کا دورہ کرتے ہوئے ڈھاکہ میں اعلان کیا کہ پاکستان کی سرکاری زبان صرف اردو ہوگی۔ بنگالی نوجوانوں نے اس کو اپنی حق تلفی سمجھا اور اس بیان کے خلاف شدید احتجاج کیا، کیونکہ وہ سمجھتے تھے کہ اس سے بنگلہ زبان دب جائے گی جو ملک کی ۵۴ فیصد آبادی کی مادری زبان تھی۔ شیخ مجیب الرحمن جو اس وقت یونیورسٹی میں طالب علم تھے، مظاہرہ کرنے والے ان نوجوانوں میں شامل تھے۔ مجیب سمیت کئی طلباء کو گرفتار کر لیا گیا مگر آئندہ کے لیے ڈھاکہ یونیورسٹی بنگلہ زبان کی حمایت میں مظاہرہ کرنے والے طلبہ کی سرگرمیوں کا مرکز بن گئی۔

۱ اکتوبر ۱۹۴۸ء

قائد اعظم کا انتقال ہو گیا۔ مشرقی پاکستان کے بنگالی وزیر اعلیٰ خواجہ ناظم الدین گورنر جنرل مقرر ہوئے۔ مسٹر لیاقت علی خان جو



قائد اعظم کے دست راست تھے اس سوگوار ٹھاک کی وزارت عظمیٰ پر بدستور قائم رہے۔

مارچ۔ اپریل ۱۹۴۹ء

ممتاز بنگالی لیڈر مولانا عبدالحید خان بھاشانی نے نرائن گنج (ڈھاکہ) میں عوامی مسلم لیگ کی بنیاد رکھی۔ اس کے تین اسٹنٹ جنرل سیکریٹریوں میں سے ایک مجیب الرحمن تھے۔ اس جماعت کو پُرچوش بنگالی نوجوانوں کے علاوہ ان پرانے سیاستدانوں کی تائید و حمایت بھی حاصل تھی جن کو آزادی کے بعد اقتدار میں کوئی حصہ نہیں ملا تھا۔ ستمبر کے مہینے میں پیرانہ کی شریفین نے شمال مغربی سرحدی صوبے میں بھی اس نام کی ایک اور جماعت قائم کر لی۔ فروری ۱۹۵۰ء میں دونوں عوامی لیگوں کو مدغم کر دیا گیا اور نئی متحدہ جماعت کی قیادت بنگالی لیڈر حسین شہید سہروردی کے سپرد ہوئی۔ نئی جماعت کو آل پاکستان عوامی مسلم لیگ کا نام دیا گیا۔

۱۶ اکتوبر ۱۹۵۱ء

سٹریٹ مل علی خان راولپنڈی میں ایک جلسہ عام میں خطاب کرتے ہوئے قتل کر دیے گئے۔ خواجہ ناظم الدین گورنر جنرل کا عہدہ چھوڑ کر وزیر اعظم بن گئے اور سٹر غلام محمد جو پیشے کے لحاظ سے سرکاری ملازم تھے جوڑ توڑ کر کے گورنر جنرل کے منصب پر فائز ہو گئے۔

۲۶ جنوری ۱۹۵۲ء

آئین کے بنیادی رہنما اصول مرتب کرنے کی غرض سے پاکستان کی دستور ساز اسمبلی نے جو کمیٹی قائم کی تھی اس نے اپنی سفارشات کا اعلان کر دیا۔ ایک سفارش یہ تھی کہ اُردو پاکستان کی واحد سرکاری زبان ہوگی۔ اس پر مشرقی پاکستان میں غم و غصہ کی ایک شدید لہر چل پڑی۔

۳۰ جنوری ۱۹۵۲ء

بنگالیوں نے مذکورہ سفارش کو اکثریتی صوبے پر لسانی اور ثقافتی یلغار کی تازہ ترین کوشش قرار دیتے ہوئے ڈھاکہ میں احتجاجی جلسے منعقد کیے۔ عوامی مسلم لیگ کے صوبائی صدر مولانا بھاشانی نے بھی ان جلسوں سے خطاب کیا۔ ۲۱ فروری کو جب صوبائی اسمبلی کا بجٹ اجلاس منعقد ہونا تھا عام ہڑتال کرنے کا فیصلہ کیا گیا۔

۲۱ فروری ۱۹۵۲ء

وزیر اعلیٰ نور اللہ امین نے اگرچہ جلسے جلوسوں پر پابندی عائد کر رکھی تھی مگر ۲۱ فروری کو احتجاجی جلسے منعقد ہوئے، جلوس نکالے گئے۔ بہ اور پولیس میں تصادم ہوا۔ تین طالب علم اور کئی اور لوگ ہلاک ہوئے۔ ان کی قربانی کی یادگار کے طور پر شہید مینار تعمیر کیے گئے۔ بعد میں یہ مینار بنگالیوں کی اجتماعی سرگرمیوں کی علامت بن گئے اور گورنر اور سفارتی نمائندے ہدیہ ارادت پیش کرنے کے لیے ان یادگاروں پر جاتے گئے۔

۱۷ اپریل ۱۹۵۲ء

گورنر جنرل غلام محمد نے خواجہ ناظم الدین کی وزارت کو پارلیمنٹ سے اعتماد و ریاعدم اعتماد کا ووٹ لینے بغیر موقوف کر دیا۔ اس سے بنگالی اور زیادہ ناراض ہو گئے۔ انہوں نے اس اقدام کو بنگالیوں کے خلاف ایک سازش سے تعبیر کیا۔ گورنر جنرل غلام محمد نے سٹر محمد علی بوگرہ کو جو اس وقت واشنگٹن میں پاکستان کے سفیر تھے بھارت طلب کر کے وزارت عظمیٰ کی گڈی پر بٹھا دیا۔ سٹر بوگرہ کو مشرقی پاکستان میں کوئی سیاسی اثر و رسوخ حاصل نہ تھا، لہذا وہ اپنے پنجابی سرپرست غلام محمد کے ہاتھ میں کٹھ پتلی بن کر رہ گئے۔



اپریل ۱۹۵۲ء

عوامی لیگ نے اپنی اصل لادینی خصوصیت کو نمایاں کرنے کے لیے "مسلم" کا لفظ اپنے نام سے خارج کر دیا اور اپنا نام صرف عوامی لیگ رکھ لیا۔ اس سے پُرانے مسلم لیگی سخت ناراض ہوئے اور انہوں نے استعفیٰ دے دیا۔ ان کی جگہ سرماہیہ دار بند و عوامی لیگ میں داخل ہو کر اس کی حکمت عملی میں دخل ہو گئے۔

ستمبر ۱۹۵۲ء

شیر بنگال مولوی فضل حق نے جنہوں نے ۲۳ مارچ ۱۹۴۰ء کو قرارداد پاکستان پیش کی تھی، ڈھاکہ میں اپنی علمدہ جماعت قائم کر لی جو کرشک سرماہک (مزدور کسان)، پارٹی کھلائی۔ عوامی لیگ اور کرشک سرماہک پارٹیوں کی تائیس اور ترقی جہاں حکمران جماعت مسلم لیگ سے بڑھتی ہوئی بیزاری کی علامت تھی وہاں صوبائی سیاست میں "لادینی نظریے" کے بڑھتے ہوئے رجحان کی نشاندہی بھی کرتی تھی۔

۸ تا ۱۱ مارچ ۱۹۵۲ء

مشرقی پاکستان میں مجلس قانون ساز کے انتخابات عمل میں آئے یہ آزادی ملنے کے بعد پہلے انتخابات تھے۔ عوامی لیگ کرشک سرماہک اور مشرقی بنگال کی دوسری پارٹیوں نے مسلم لیگ کا مقابلہ کرنے کے لیے متحدہ محاذ (جگتو فرنٹ) قائم کر لیا۔ "محاذ" کے ۲۱ نکاتی منشور میں ایک نکتہ یہ بھی تھا کہ بنگلہ زبان کو سرکاری زبان تسلیم کیا جائے گا۔ ایک اور اہم نکتہ صوبائی خود مختاری کا مطالبہ تھا۔ اس انتخابی معرکے میں حکمران مسلم لیگ صرف نوشتیں جیت سکی۔ وزیر اعلیٰ نورالامین "محاذ" کے نامزد کردہ ایک طالب علم کے مقابلے میں ہار گئے۔

۳۰ مارچ ۱۹۵۲ء

"متحدہ محاذ" کو وزارت بنانے کی دعوت دی گئی تین دن بعد نئی حکومت نے حلف اٹھایا۔ شیخ مجیب الرحمن اس کا بنیہ میں ایک وزیر تھے۔

۳۰ مئی ۱۹۵۲ء

گورنر جنرل نے "متحدہ محاذ" کی حکومت کو برطرف کر دیا کیونکہ وزیر اعلیٰ فضل الحق نے چند روز قبل کلکتہ ایرپورٹ پر بمبئیہ طور پر ایک باغیہ بیان دیا تھا۔ شیخ مجیب الرحمن نظر بند کر لیے گئے۔ صوبے میں گورنر راج نافذ کر دیا گیا۔ "متحدہ محاذ" کا شیرازہ بکھر گیا۔ مرکز نے اپنی اغراض کے تحت "عوامی لیگ" اور "کرشک سرماہک" پر الگ الگ ڈورے ڈالنے شروع کر دیے۔

۲۲ اکتوبر ۱۹۵۲ء

گورنر جنرل غلام محمد نے دستور ساز اسمبلی توڑ دی۔ محمد علی بوگرہ نے پارلیمنٹ کے بغیر نئی حکومت قائم کی، تو اس میں فوج کے کمانڈر انچیف جنرل محمد ایوب خان کو وزیر دفاع کی حیثیت سے شامل کیا گیا۔

۱۵ اپریل ۱۹۵۵ء

۱۰ ارکان پر مشتمل ایک نئی مجلس دستور ساز کی تشکیل عمل میں لائی گئی جس کے ارکان صوبوں کی مجالس قانون ساز سے لیے گئے۔ "عوامی لیگ" اور "کرشک سرماہک" نے اپنے اپنے نمائندے بھیجے اور یوں قومی سیاست میں ایک نیا عنصر شامل ہو گیا۔

جون ۱۹۵۵ء

مشرقی پاکستان سے گورنر راج ختم کر دیا گیا۔ "کرشک سرماہک" پارٹی نے جو اب مرکز میں مسلم لیگ سے تقادن کر رہی تھی ڈھاکہ میں حکومت قائم کر لی۔ عوامی لیگ حزب مخالف میں جا بیٹھی۔



۶ اگست ۱۹۵۵ء

مشرعہ علامہ محمد — وہ فیصل سادھی — بلاخر پاکستان کی سیاست سے نکل گیا۔ سات ستمبر کو اسکندر مرزا نے گورنر جنرل کے منصب کا حلف اٹھایا۔ اسکندر مرزا ایک غیر سیاسی شخصیت تھے، مگر نہایت چلتے پڑتے پڑے۔ انہوں نے وزارت عظمیٰ کا علمدان چودھری محمد علی کے سپرد کر دیا جن کو مسلم لیگ نے نامزد کیا تھا، حالانکہ عوامی لیگ کے قائد کی حیثیت سے مسٹر ایچ ایم ایس سروردی سمجھے تھے کہ وزارت سازی کا حق انہیں پہنچتا ہے۔ بنگالیوں نے اس واقعے کو بھی بنگالیوں کے سیاسی اقتدار سے محروم رکھنے کا ایک اقدام سمجھا۔

۷ ستمبر ۱۹۵۵ء

عوامی لیگ کے مسٹر عطاء الرحمن نے مشرقی بنگال کی مجلس قانون ساز میں کہا: — "مسلم لیگ کا حکمران ٹولہ مشرقی بنگال اس کی ثقافت اس کی زبان اس کے لٹریچر غرضیکہ اس کی ہر چیز کی طرف اہانت اور تحقیر کا رویہ رکھتا ہے۔ جناب والا! میں عرض کر دیا گا کہ ہمیں برابر کا شریک گردانا تو درکنار مسلم لیگ کے لیڈر یہ سمجھتے ہیں کہ جیسے ہم محکوم قوم سے اور وہ فاتح اور حکمران قوم سے تعلق رکھتے ہیں۔"

۱۳ اکتوبر ۱۹۵۵ء

مغربی بازو میں واقع تمام صوبوں یعنی پنجاب، شمال مغربی سرحدی صوبہ، بلوچستان اور سندھ کو مدغم کر کے "ون یونٹ" بنا دیا گیا اور اسے مغربی پاکستان کا نام دیا گیا۔ ون یونٹ بل جو دو ہفتے پہلے منظور کیا گیا اس بات کی ضمانت دیتا تھا کہ ملک کے دونوں بازوؤں کے درمیان برابری کی سطح پر باہمی تعلقات استوار کیے جائیں گے، مگر بنگالیوں نے یہ سبھا کہ یہ بنگالیوں کو جو ایک اکثریتی صوبے سے تعلق رکھتے ہیں اپنے جائز حقوق سے محروم رکھنے کی ایک اور چال ہے۔

۲۹ فروری ۱۹۵۶ء

چودھری محمد علی کی ان تھک کوششوں سے دستور ساز اسمبلی نے ملک کا پہلا آئین منظور کر لیا اور تین ہفتے بعد یعنی ۲۳ مارچ کو اسے نافذ کر دیا گیا۔ اس آئین میں پیریٹی (PARITY) کے اصول پر پارلیمنٹ میں دونوں صوبوں کو برابر برابری کا حق دیا گیا تھا۔ اس کے علاوہ پاکستان اب ایک "جمہوریہ" بنا اور اس کا گورنر جنرل صدر کھلانے لگا۔ اُردو کے علاوہ بنگلہ کو بھی سرکاری زبان تسلیم کیا گیا۔

۲۰ اگست ۱۹۵۶ء

مشرقی پاکستان میں "کے ایس پی" کی حکومت کو جو گزشتہ چودہ مہینوں سے اسمبلی کا سامنا کیے بغیر برسرِ اقتدار چلی آرہی تھی، مستعفی ہونے پر مجبور کر دیا گیا۔ اس کی جگہ عوامی لیگ نے ایک ہندو لیڈر جی کے داس اور ان کی پارٹی کی اعانت سے حکومت قائم کر لی۔ مسٹر عطاء الرحمن اس کے وزیر اعلیٰ بنے۔

۱۲ ستمبر ۱۹۵۶ء

مرکز میں چودھری محمد علی کی جگہ جنہوں نے ستمبر کو استعفیٰ دے دیا تھا مسٹر حسین شہید سہروردی نے حکومت سنبھال لی۔ ان کو "ری پبلکن پارٹی" کی حمایت حاصل تھی جو اسکندر مرزا کے ایساو پر قائم کی گئی تھی۔

۳۰ جون ۱۹۵۷ء

عوامی لیگ کے صوبائی سربراہ مولانا بھاشانی نے صدارت سے استعفیٰ دے دیا۔ مسٹر سہروردی کے خلاف ان کا الزام یہ تھا کہ وہ

مغربی پاکستان سے ترقی پسند سلوک کرتے ہیں اور انہوں نے نرسوز کے مسئلہ میں جماعتی منشور کے خلاف "سامراجیوں" کی حمایت کی ہے۔

۲۶ جولائی ۱۹۵۷ء

مولانا بھاشانی نے جو "چین" کی طرف واضح ذہنی جھکاؤ رکھتے تھے "نیشنل عوامی پارٹی" کے نام سے اپنی عمدہ جماعت قائم کر لی۔ یہ جماعت "لاڈینی سیاست" (SECULAR) میں اعتقاد رکھتی تھی مگر "عوامی لیگ" کے برعکس اس کو زیادہ تر حمایت بائیں بازو کے عناصر سے حاصل تھی۔

۱۲ اکتوبر ۱۹۵۷ء

"ری پبلکن پارٹی" کی حمایت سے محروم ہونے پر مسٹر حسین شہید سہروردی مستعفی ہو گئے۔ ان کی جگہ مسٹر آئی آئی چندر گپت ریڈی نے بنائے۔ مگر ان کو بھی دو ماہ کے اندر اندر مستعفی ہونا پڑا اور دسمبر میں ملک فیروز خان نون وزارت عظمیٰ پر متمکن ہو گئے۔

۱۸ جون ۱۹۵۸ء

عوامی لیگ کی مخلوط حکومت مشرقی پاکستان کی اسمبلی میں شکست کھا گئی۔ مسٹر عطاء الرحمن مستعفی ہو گئے۔ دو دن بعد کے "ایس پی" نے وزارت بنائی جو شکل تین روز چل سکی۔ صوبے میں ایک مرتبہ پھر گورنر راج نافذ کر دیا گیا۔

۲۶ اگست ۱۹۵۸ء

"گورنر راج" ختم کر دیا گیا۔ عوامی لیگ نے مشرقی پاکستان میں پھر حکومت قائم کر لی۔

۲۱ ستمبر ۱۹۵۸ء

مشرق پاکستان کی اسمبلی کے اجلاس میں "اسپیکر" کی جانبداری کے مسئلے پر ہنگامہ ہو گیا۔ کئی ارکان شدید زخمی ہوئے۔ ڈپٹی اسپیکر مسٹر شاہد علی جان سے مارے گئے۔

۷ اکتوبر ۱۹۵۸ء

جنرل محمد ایوب خان کی حمایت سے صدر اسکندر مرزا نے آئین معطل کر دیا۔ اسمبلی توڑ دی اور ملک میں مارشل لاء نافذ کر دیا۔ جنرل ایوب خان کو "چیف" شہ لاء ایڈمنسٹریٹر" مقرر کیا گیا۔ اس "انقلاب" نے بنگالیوں کی سیاسی حق طلبی کی امنگ پر گہرا لگاؤ۔

۲۷ اکتوبر ۱۹۵۸ء

جنرل ایوب خان نے اسکندر مرزا کو برطرف کر کے لندن بھیج دیا اور خود "فیلڈ مارشل" کا رینک اختیار کر کے تمام اختیارات سنبھال لیے۔ مشرقی پاکستان پر وہ اپنی مرضی کے گورنروں کے ذریعے حکومت کرنے لگے۔ مسلح افواج میں چونکہ بنگالیوں کی نمائندگی بہت کم تھی اس لیے وہ محسوس کرنے لگے کہ فوجی انقلاب آنے سے وہ ہمیشہ کے لیے سیاسی اقتدار سے محروم ہو گئے ہیں۔ اس احساس سے ان کے اندر محرومی ناس اور نفرت کے جذبات سُلگنے لگے۔ مارشل لاء کی سختی نے انہیں کچلنے کی کوشش کی تو اس سے صوبائیت کے جذبے کو اور ہوا ملنے لگی۔

۲۶ اکتوبر ۱۹۵۹ء

ایوب خان نے "بنیادی جمہوریتوں" کا نظام نافذ کر دیا۔ یہ نظم و نسق کی اعانت کے لیے قومی اداروں پر مشتمل ایک نیا نظام تھا۔ ملک کے صدر اور اسمبلی کے ارکان کو منتخب کرنے کا اختیار بھی بہت جلد انہی بنیادی اداروں کے اسی ہزار ارکان کو تفویض کر دیا گیا۔ بنگالیوں



نے سمجھا کہ اس بار ایک پروے میں دراصل ایک فرد و احد کی حکومت کو مستقل کرنے کا اہتمام کیا جا رہا ہے مغربی پاکستان کے لوگوں کی بجا رہی اکثریت نے بھی اسے ناپسند کیا۔

۱۵، جنوری ۱۹۶۰ء

ایوب خان نے "بنیادی جمہورتوں" کے اسی ہزار ارکان سے اعتماد کا ووٹ طلب کیا "تو ان میں سے پچتر ہزار دو سو تراسی ارکان نے صدارت کے منصب کے لیے ان کی توثیق کر دی اور دو روز بعد فیڈ مارشل ایوب خان نے پاکستان کے پہلے "منتخب" صدر کی حیثیت سے اپنے منصب کا حلف اٹھایا۔

اپریل ۱۹۶۰ء

یونیٹڈ جنرل اعظم خان کو مشرقی پاکستان کا گورنر مقرر کیا گیا۔ انہوں نے بنگالیوں کی حمایت مل کرنے کے لیے بڑی محنت سے کام کیا مگر اس پر وہ خود ایوب خان کی حمایت سے محروم ہو گئے اور ان کو استعفیٰ دینا پڑا۔

۸، جون ۱۹۶۲ء

ایوب خان نے اپنی طرف سے ایک آئین ملک میں نافذ کر دیا جس میں صدارتی طرز حکومت کو بھی اپنا یا گیا۔ صدر کے لیے انتخاب کی بنیاد "بنیادی جمہوریت" کے ارکان تھے۔ اس دستور میں بھی ۱۹۵۶ء والے آئین کی طرح دونوں صوبوں کے درمیان برابری (PARITY) کا اصول رکھا گیا۔ یہ آئین مجموعی طور پر قبول عام حاصل نہ کر سکا۔

۲۶، اکتوبر ۱۹۶۲ء

بنگال کے رہنے والے مسٹر منعم خان کو مشرقی پاکستان کا گورنر مقرر کیا گیا جو ایوب خان کے زوال (۱۹۶۹ء) تک اس منصب پر فائز رہے۔ ایوب خان سے ان کی انتہائی وفاداری کی وجہ سے وہ بنگالیوں میں غیر مقبول ہو گئے۔ کٹر بنگالی انہیں "پنجابیوں کا رجسٹ" کہتے تھے لیونرٹی کے طلبہ نے ان کے ہاتھ سے اسناد لینے سے انکار کر دیا تھا۔

۲۹، مئی ۱۹۶۳ء

نیشنل اسمبلی کے ایک بنگالی رکن نے ایوان میں تقریر کرتے ہوئے کہا: "مغربی پاکستان کو مشرقی پاکستان کی قیمت پر ترقی دی جا رہی ہے۔ پچھلے پندرہ برسوں میں کم درآمدات اور زیادہ برآمدات کی صورت میں مشرقی پاکستان کو اس کے گاڑھے پسینے کے ایک سو کروڑ روپیہ سے محروم کیا گیا اور جناب والا اس کو صرف کر کے مغربی پاکستان کو ترقی دی گئی اور اس کی زرعی اراضی میں کئی لاکھ ایکڑ کا اضافہ کیا گیا۔ اب یہ بڑے لوگ بڑی اونچی باتیں کرتے ہیں کہ۔ مشرقی پاکستان کو اس کے حال پر رہنے دو۔ ہم اپنا گزارہ خود کر سکتے ہیں۔ اب سولہواں سال جا رہا ہے۔ مغربی پاکستان کی تعمیر کے لیے ہمیں دیوالیہ کر دیا گیا ہے۔۔۔ ہم سے کہا جاتا ہے۔ چھو کرو نکل جاؤ ہمارے پاس تمہارے واسطے کچھ نہیں ہے۔ ہمیں تمہاری ضرورت نہیں ہے۔"

۲، جنوری ۱۹۶۴ء

صدارتی انتخابات منعقد ہوئے۔ قائد اعظم کی ہمیشہ فاطمہ جناح نے ایوب خان کا مقابلہ کیا۔ حزب مخالف کی تمام جماعتوں نے ان کی جملہ کی بنگالیوں نے بھی ان کی حمایت میں غیر معمولی جوش و خروش کا مظاہرہ کیا۔ ان کے خیال میں ایک ڈکٹیٹر کو ہٹا کر سیاسی حقوق بحال کرنے کا یہ ایک سنہری موقع تھا۔ اگرچہ اس الیکشن میں ایوب خان نے بنیادی جمہورتوں کے اسی ہزار ارکان کی اکثریت کے ووٹ حاصل کر لیے مگر ڈھاکہ میں جو مشرقی پاکستان کی سیاست کا مرکز سمجھا جاتا تھا وہ اس جناح سے ہار گئے۔



۶ ستمبر ۱۹۶۵ء

ہندوستان اور پاکستان کے مابین ایک مرتبہ پھر مسئلہ کشمیر پر جنگ چھڑ گئی یہ معاملہ جہاں مغربی پاکستان کے لیے زندگی اور موت کا مسئلہ تھا وہاں مشرقی پاکستان میں اس کو عموماً دُور دراز کا مسئلہ سمجھا جاتا تھا۔ بھارتی فضائیہ کے جیٹ طیارے جب کبھی ڈھاکہ پر منڈلانے آجاتے تو بنگالیوں کے دلوں میں عدم تحفظ کا احساس بڑھ جاتا، کیونکہ مشرقی پاکستان کے دفاع کے لیے معقول تعداد میں فوج، ایئر فورس اور نیوی نہیں رکھی گئی تھی۔ یہی ڈھنڈورا پیٹا جاتا رہا کہ مشرقی پاکستان کا دفاع مغربی پاکستان سے کیا جائے گا۔

۱۱ جنوری ۱۹۶۶ء

ایوب خان نے اعلانِ تاشقند پر دستخط کر دیے، اس معاہدے میں دونوں ملکوں کی افواج کی مقبوضہ علاقوں سے واپسی بھی شامل تھی۔ مغربی پاکستان کے لوگ جو یہ سمجھتے تھے کہ جنگ میں ہماری جیت ہوئی ہے اس پر سخت برہم ہوئے۔ انہوں نے اس معاہدے کو قومی وقار کی سودا بازی پر محمول کیا۔ اس سے ایوب خان کی ساکھ کو شدید دھچکا لگا۔

۶ فروری ۱۹۶۶ء

شیخ مجیب الرحمن نے لاہور میں اپنے مشہور چھ نکات کا اعلان کیا۔ چھ نکات میں بنیادی طور پر ایک ایسے سیاسی بندوبست کی وکالت کی گئی تھی جس میں مرکزی حکومت محصولات کے اختیارات کے بغیر امور خارجہ اور امور دفاع کی دیکھ بھال کرتی رہے۔ مجیب نے اپنے پروگرام کو "صوبائی خود مختاری" کے حوالے سے پیش کیا، جبکہ مغربی پاکستان کے لوگوں نے اسے علمدگی کی تحریک سمجھا۔

۲۶ اپریل ۱۹۶۶ء

فیلڈ مارشل ایوب خان کے وزیر خارجہ ذوالفقار علی بھٹو نے استعفائی دے دیا۔ اگلے دسمبر میں انہوں نے "پاکستان پیپلز پارٹی" کے نام سے اپنی سیاسی پارٹی قائم کر لی۔

۲۰ جنوری ۱۹۶۸ء

"اگر تہ سازش کا انکشاف کیا گیا۔ اس سازش میں شیخ مجیب الرحمن کے علاوہ ۲۲ دوسرے بنگالیوں کو بھی اس الزام میں ملو" کیا گیا کہ وہ ہندوستان کی ملی جگت سے مشرقی پاکستان کی علمدگی اور ایک "آزاد بنگال" کے قیام کی کوشش کر رہے تھے۔ جولائی ۱۹۶۸ء میں جب ڈھاکہ میں مقدمے کی کارروائی شروع ہوئی تو بنگالیوں کا رد عمل قطعاً مختلف تھا۔ مدعی، مجیب کو غدار کے رنگ میں پیش کر رہے تھے، مگر بنگالی اسے ہیرو کے روپ میں دیکھ رہے تھے۔ اس مقدمے کے طفیل مجیب کی مقبولیت کو دھوبے لیا، چار چاند لگ گئے ایسی مقبولیت وہ شاید ہی کسی اور ذریعے سے حاصل کر سکتے۔

۱۰ اکتوبر ۱۹۶۸ء

ایوب خان شدید علیل ہو گئے۔ سیاسی طور پر وہ معاہدہ تاشقند سے کمزور ہو چکے تھے اب علالت نے ان کو جسمانی طور پر بھی کھوکھلا

کر دیا۔ جانشینی کے عوامل بھی (سیاسی اور فوجی دونوں حلقوں میں) فعال ہونے لگے۔

۲۶ اکتوبر ۱۹۶۸ء

۱۹۵۰ء کے انقلاب کی دسویں سالگرہ کی تقریبات جو سال بھر سے منائی جا رہی تھیں اپنے نقطہ عروج کو پہنچ گئیں جس جہد سے انداز سے حکومت کے کارناموں کا ڈھنڈورا پیٹا گیا اور جس علمیانہ طریقے سے اقتصادی ترقی کی تشہیر کی گئی اس سے لوگوں میں اپنی اقصاوی مشکلات کا احساس کچھ اور بڑھ گیا۔ لوگوں کے دلوں میں ایوب خان کے خلاف سویا ہوا جذبہ جاگ پڑا۔ اس کے علاوہ ان کے متعلق یہ تاثر عام تھا کہ ان کے اہل خاندان نے ان کے دور اقتدار میں ناجائز ذرائع سے بے شمار دولت جمع کر لی تھی۔

پھلکات

چھ نکاتی فارمولے کا متن اور ترمیمات بمطابق منشور عوامی لیگ

پہلا نکتہ

اصل

دستور میں قرار دیا ہوا کہ بنیاد پر پارلیمانی طرز حکومت کے مطابق پاکستان کا ایک ایسا وفاق قائم کیا جائے جس میں بالغ رائے دہی کے اصول پر براہِ دست منتخب شدہ مجلس قانون ساز کو بالادستی حاصل ہو۔

ترمیم شدہ

طرز حکومت وفاقی اور پارلیمانی ہوگا۔ وفاق کی مجلس قانون ساز اور وفاق میں شامل یونٹوں کی مجلس قانون ساز کو عام بالغ حق رائے دہی کے اصول پر براہِ راست منتخب کیا جائے گا۔ وفاقی مجلس قانون ساز میں نمائندگی کا تناسب زبان کی بنیاد پر ہوگا۔

دوسرا نکتہ

اصل

وفاقی حکومت صرف دفاع اور امور خارجہ کے شعبوں کا انتظام کرے گی، باقی تمام شعبے وفاق میں شامل ریاستوں کے تحت ہوں گے۔

ترمیم شدہ

وفاقی حکومت صرف دفاع اور امور خارجہ کے شعبوں کی ذمہ دار ہوگی۔ اس کے علاوہ درج ذیل نکتہ سوئم کی شرائط کے ساتھ کرنسی بھی اس کے سپرد ہوگی۔

تیسرا نکتہ

اصل

(۱) دونوں بازوؤں میں کرنسی کا الگ الگ نظام رائج کیا جائے گا، لیکن اس کے ساتھ ساتھ دونوں بازوؤں میں اس کے آزادانہ تبادلے کا اہتمام ہوگا۔

(۲) پورے ملک کے لیے کرنسی کا ایک ہی نظام رہنے دیا جائے، مگر اس صورت میں ایسے آئینی تحفظات کا بندوبست

کیا جائے جن کے تحت مشرقی پاکستان سے مغربی پاکستان کو سرمایہ کی آزادانہ منتقلی کو روکا جاسکے۔ ہر صوبہ علیحدہ علیحدہ بینک سرمایہ محفوظ رکھ سکے اور مشرقی پاکستان کے لیے الگ بجٹ اور الگ مالیاتی نظام اختیار کیا جائے۔



ترمیم شدہ

دو علیحدہ علیحدہ کرنیاں "رائج" کی جائیں گی جن کا ہر بازو اور ہر ریجن میں آزادانہ تبادلہ ممکن ہوگا یا متبادل صورت میں کرنسی کا ایک ہی نظام رہنے دیا جائے لیکن اس کے لیے پھر "وفاقی محفوظات" کا ایک ایسا دستور العمل نافذ کیا جائے جس کے تحت "علاقائی فیڈرل ریزرو بینک" (REGIONAL FEDERAL RESERVE BANKS) قائم کیے جاسکیں جو ایک ریجن سے دوسرے ریجن میں وسائل اور سرمایہ کی آزادانہ منتقلی کی روک تھام کے اقدامات کرنے کے مجاز ہوں۔

چوتھا نکتہ

اصل

محصولات کے نفاذ اور وصولی کا اختیار "وفاقی یونٹوں" کے پاس ہوگا اور "وفاقی مرکز" کو اس قسم کا کوئی اختیار حاصل نہ ہوگا۔ اخراجات کے لیے "وفاق" کو ریاست کے محصولات کا ایک حصہ دیا جائے گا۔ "وفاق کے مجموعی فنڈ" کی رقم ریاست کے مختلف محصولات میں سے ایک خاص شرح کے مطابق وضع کر کے مہیا کی جائے گی۔

ترمیم شدہ

مابقی حکمت عملی وفاقی یونٹوں کے تحت ہوگی۔ "وفاق" کو دفاع اور امور خارجہ کے اخراجات کے لیے حصول سرمایہ کے ضروری وسائل مہیا کیے جائیں گے۔ "وفاقی حکومت" ان وسائل کے تصرف و استعمال کے طریقہ کار اور تناسب وغیرہ کے ضمن میں ان ضوابط کو ملحوظ رکھے گی جن کی صراحت آئین میں کر دی جائے گی۔

پانچواں نکتہ

اصل

- (۱) دونوں بازوؤں کے لیے زرمبادلہ کا حساب رکھنے کے لیے علیحدہ علیحدہ کھاتے رکھے جائیں گے۔
- (۲) مشرقی پاکستان کی آمدنی مشرقی پاکستان کی حکومت کے اختیار میں ہوگی اور مغربی پاکستان کی آمدنی مغربی پاکستان کی حکومت کے اختیار میں ہوگی۔
- (۳) وفاق کے زرمبادلہ کی ضروریات "دونوں بازوؤں پر پوری کریں گے۔ مساوی طور پر یا کسی طے شدہ تناسب کے مطابق۔
- (۴) مقامی مصنوعات کو ایک بازو سے دوسرے بازو میں لانے پر کوئی محصول نہیں لگایا جائے گا۔
- (۵) آئین کی رو سے یونٹوں کی حکومتیں اس امر کی مجاز ہوں گی کہ وہ بیرونی ممالک سے اپنے تجارتی روابط اور ان میں اپنے تجارتی رٹن قائم کر سکیں اور ان سے معاہدے کر سکیں۔

ترمیم شدہ

آئین میں ہر وفاقی یونٹ کو اپنے زرمبادلہ کی آمدنی کا علیحدہ حساب کتاب رکھنے اور اس کو اپنے تصرف میں رکھنے کا اختیار دیا جائے گا۔ وفاق کے زرمبادلہ کی ضروریات "وفاقی یونٹوں" کی حکومتیں اس تناسب اور اس طریق کار کے مطابق مہیا کریں گی جس کی صراحت آئین میں موجود ہوگی۔ علاقائی حکومتوں کو تجارت اور امداد کے لیے بیرونی ممالک سے مذاکرات کرنے کا اختیار حاصل ہوگا۔ اس میں ان کو بہر حال ملک کی خارجہ پالیسی کے دائرے میں رہنا ہوگا جس کا تعین کرنا وفاقی حکومت کی ذمہ داری ہوگی۔

چھٹا نکتہ

اصل

شرقی پاکستان کے لیے ایک نیم عسکری تنظیم کا قیام (میشیا)

ترمیم شدہ

دفاقی یونٹوں کی حکومتوں کو قومی سلامتی میں موثر کردار ادا کرنے کی غرض سے "میشیا" یا نیم عسکری طرز کی تنظیمات قائم کرنے کا اختیار ہوگا۔



اپریشن بیچ لائنٹ

منصوبہ بندی کی اساس

- (۱) عوامی لیگ کی سرگرمیوں اور رتبہ عمل کو بغاوت سمجھا جائے اور ان کے مددگار عناصر کو نیز ان لوگوں کو جو مارشل لا کی خلاف ورزی کریں "مخالفت عناصر" تصور کیا جائے۔
- (۲) فوج میں مشرقی پاکستان کے عناصر کے اندر عوامی لیگ کی وسیع حمایت پائی جاتی ہے، لہذا کارروائی انتہائی ہوشیاری کے ساتھ اچانک اور خفیہ طریقے سے کی جائے اور دہشت انگیزی کے عناصر کو ملحوظ رکھا جائے۔

کامیابی کی بنیادی شرائط

- (۳) تمام صوبے میں بیک وقت کارروائی کی جائے۔
 - (۴) سیاسی قائدین اور اسٹوڈنٹ لیڈروں نیز اساتذہ اور ثقافتی تنظیموں کے انتہا پسند عناصر کو زیادہ سے زیادہ تعداد میں گرفتار کیا جائے۔ ابتدائی مرحلے میں چوٹی کے سیاسی قائدین اور اسٹوڈنٹ لیڈروں کو لازماً پکڑ لیا جائے۔
 - (۵) ڈھاکہ میں فوجی کارروائی کی کھتل کامیابی ضروری ہے۔ اس مقصد کے لیے ڈھاکہ یونیورسٹی کو اپنے قابو میں لے کر اس کی پوری پوری تلاشی لینا ہوگی۔
 - (۶) چھاؤنیوں کی حفاظت کا پورا پورا بندوبست کیا جائے جو لوگ چھاؤنیوں پر حملہ کرنے کی جرات کریں ان پر گولیوں کی شدید بارش کی جائے۔
 - (۷) تمام اندرونی اور بین الاقوامی ذرائع مواصلات کاٹ دیے جائیں۔ بیرونی توفصل خالوں کے ٹیلیفون ریڈیو، ٹیلی ویژن، ٹیلی پرنٹر، سرورسین اور ٹرانسمیٹر وغیرہ کے رابطے منقطع کر دیے جائیں۔
 - (۸) بارود کے ذخیروں اور اسلحہ گھروں پر مغربی پاکستان کے فوجیوں کا پہرہ لگا کر مشرقی پاکستان کی نفری کو غیر موثر بنا دیا جائے۔
- "پاکستان ایئر فورس" "نیٹ پاکستان رائفلز" کے بارے میں بھی یہی طرز عمل اختیار کیا جائے۔

مطبوعہ آگسٹو ڈیونیورسٹی پریس ۱۹۷۷



ناگہانیت اور فریب

(۹) بالائی سطح پر

صدر سے درخواست کی جائے کہ وہ مذاکرات کو جاری رکھیں اور بے شک مجیب کو دھوکا دینے کے لیے ہی یہ تاثر دیں کہ مسٹر ٹیٹو مائیں یا نہ مائیں وہ ۲۵ مارچ کو عوامی لیگ کے مطالبات کی منظوری کا اعلان کر دیں گے۔
(۱۰) تدبیراتی سطح

(الف) اخفا کی اہمیت کے پیش نظر ابتدائی مرحلے میں اس منصوبے کے ضمن میں مندرجہ ذیل اقدامات کرنے کے لیے فوج کی وہی نفری استعمال کی جائے جو پہلے سے شہر میں موجود ہے۔

(ب) مجیب کے گھر میں داخل ہو کر گھر میں موجود سب افراد کو گرفتار کیا جائے۔ یاد رہے مکان پر کڑا پھرو رہتا ہے اور سخت دفاعی انتظامات کیے گئے ہیں۔

(۱۱) یونیورسٹی کے اہم ہوسٹوں کا محاصرہ۔ مثلاً اقبال ہال (ڈھاکہ یونیورسٹی) اور لیاقت ہال (انجینئرنگ یونیورسٹی)۔
(۱۲) ٹیلی فون آپریشن بند۔

(۱۳) جن گھروں میں اسلحہ وغیرہ کے ذخیروں کی اطلاعات ملی ہیں ان کے بیرونی رابطے منقطع۔

(ب) چھاؤنی میں فوج کی نقل و حرکت ٹیلیفون رابطے ختم ہونے کے بعد شروع کی جائے گی، پہلے نہیں۔

(پ) رات کے دس بجے کے بعد کسی شخص کو چھاؤنی کے باہر نہ جانے دیا جائے۔

(د) کسی نہ کسی بہانے شہر کے مندرجہ ذیل مقامات کے نواح میں فوج کی نفری میں اضافہ کیا جائے:

ایوان صدر، گورنر ہاؤس، ایم این اے ہوسٹل، ریڈیو سٹیشن، ٹیلیوژن سٹیشن اور ٹیلیفون آپریشن۔

(ج) مجیب کے گھر پر کارروائی کرنے کے سلسلے میں سولین گاڑیاں استعمال کی جائیں۔

ترتیب اقدامات

(الف) آغاز کار: ایک بجے شب۔

(ب) فوجی نقل و حرکت کے اوقات:

(۱) کمانڈو کی ایک پلاٹن۔ مجیب کے گھر۔ ایک بجے شب۔

(۲) ٹیلیفون کے "مرکز مواصلات" کا انقطاع۔ رات بارہ بجکر ۵۵ منٹ پر۔

(۳) یونیورسٹی کا محاصرہ کرنے والی نفری۔ رات ایک بجکر ۵ منٹ پر۔

(۴) پولیس تھانہ راجہ باغ کے ہیڈ کوارٹر اور دوسرے تقاضوں کی طرف روانگی۔ رات کے تقریباً ایک بجکر ۵ منٹ پر۔

(۵) رات کے ایک بجکر ۵ منٹ پر مندرجہ ذیل مقامات کا محاصرہ کر لیا جائے گا:

مسماۃ انوار بیگم کا گھر۔ مکان نمبر ۱۴ سٹرک نمبر ۲۹



(۶) کر فیو کا نفاذ۔ رات کے ایک بجکرہ منٹ سے "سائرن" اور "لاؤڈ اسپیکر" کے ذریعے۔ ابتدائی میعاد میں گھنٹے۔ ابتدائی مرحلے میں "راہ داری" کے لیے پروانے (پاس) جاری نہیں کیے جائیں گے۔ البتہ زچگی اور "راہ داری" کے قلب کے سنگین حملے کے واقعات پر مناسب غور کیا جائے گا۔ متعلقین کی درخواست پر مریضوں کی نقل و حرکت کا انتظام فوج کرے گی۔ یہ اعلان بھی کر دیا جائے گا تا حکم ثانی کوئی اخبار شائع نہیں ہوگا۔

(۷) جن فوجی دستوں کو مخصوص مشن تفویض کیے گئے ہیں وہ ایک بجکرہ منٹ پر اپنے اپنے سیکٹر کی طرف نکل پڑیں گے۔ (نفری کوچوں کو کس کرنے کا لائحہ عمل بنایا جائے) ہوشیوں پر قبضہ کر کے ان کی تلاشی لی جائے۔

(۸) یونیورسٹی کے علاقہ کی طرف روانگی۔ صبح کے پانچ بجے۔

(۹) زمینی اور آبی رکاوٹیں رات کے دو بجے قائم کر دی جائیں گی۔

(پ) دن کے وقت اقدامات

(۱) دھان منڈی کے علاقہ کے مشتبہ مکانات کی خانہ بہ خانہ تلاشی۔ پُرانے شہر کے اندر ہندوؤں کے گھروں کی بھی تلاشی (ضروری معلومات ایسی نہیں کا شعبہ جمع کرے گا)

(۲) تمام چھاپے خانے بند کر دیے جائیں گے۔ یونیورسٹی کالجوں ٹیلیفون اور ٹیلی گراف کے محکمات فزیکل ٹریننگ انسٹیٹیوٹ اور سیکینکل ٹریننگ انسٹیٹیوٹ۔ ان تمام مقامات کی سائیکلو سٹائل مشینیں ضبط کر لی جائیں گی۔

(۳) کر فیو کی بندش سخت کر دی جائے گی۔

(۴) دوسرے لیڈروں کو بھی گرفتار کر لیا جائے گا۔

فرائض اور وسائل

(۱۲)

تفصیلات بریگیڈ ریکمانڈر طے کرے گا (جن کا ذکر آگے آئے گا) لیکن مندرجہ ذیل اقدامات لازماً کیے جائیں گے:

(الف) (مشرقی) بنگالی یونٹوں (جن میں سنگل اور دوسرے انتظامی یونٹ بھی شامل ہوں گے) کے اسلحہ خانوں پر قبضہ کر لیا جائے گا۔ اسلحہ صرف مغربی پاکستان کی نفری کو دیا جائے گا۔

وضاحت

ہم مشرقی پاکستان کے سپاہیوں کو کوئی ایسا فرض نہیں سونپنا چاہتے تھے جس پر عمل کرنا ان کو ناگوار گزرتا۔

(ب) پولیس کے متحانوں سے اسلحہ لے لیا جائے گا۔

(پ) ایسٹ پاکستان رائفلز کے ڈائریکٹر جنرل اسلحہ خانوں کی حفاظت کے ذمہ دار ہوں گے۔

(ت) "انصار" کی رائفلیں جمع کر لی جائیں گی۔

مطلوبہ معلومات

(۱۳)

(الف) مندرجہ ذیل افراد کا اتہ پتہ :



شیخ مجیب: نذر الاسلام، تاج الدین، عثمانی، سراج الاسلام، متان، عطاء الرحمن، پروفیسر مظفر، علی احمد، سیکم، موتیا چوہدری، بیٹر، سرمد
فیض الحق، طفیل، این اے صدیقی، رؤف، بکمن (اوردوسرے طالب علم لیڈر)
(ب) تمام مقالوں اور "رائلز" کا محل وقوع۔

(پ) شہر کے ایسے تمام مقامات کا محل وقوع جہاں اسلحہ ذخیرہ کیا گیا ہو یا جن کو عسکری لحاظ سے مستحکم کیا گیا ہو۔
(ج) تربیتی ٹیموں اور تربیتی علاقوں کا محل وقوع۔

(ج) ان ثقافتی مراکز کا محل وقوع جن کو فوجی تربیت کے لیے استعمال کیا جا رہا ہے۔
(ح) ان سابق فوجی افسروں کے نام جو باغیانہ سرگرمیوں کی اعانت کر رہے ہوں۔

قیادت اور نظامت

(۱۴)

(الف)	علاقہ ڈھاکہ	
	کمانڈر :	میجر جنرل فرمان
	سٹاف :	ایسٹرن کمانڈر کاسٹاف یا مارشل لا ہیڈ کوارٹر کاسٹاف۔
	جمعیت :	ڈھاکہ میں موجود نفری
(ب)	بقیہ صوبہ	
	کمانڈر :	میجر جنرل خادم حسین راجہ
	سٹاف :	ہیڈ کوارٹر ۱۴ ڈویژن
	جمعیت :	ڈھاکہ کے سوا باقی نفری

چھاؤنی کا تحفظ

(۱۵)

پہلا مرحلہ - تمام اسلحہ (پاکستان ایئر فورس سمیت) جمع کر لیا جائے۔

مواصلات

(۱۶)

(الف) حفاظت (ب) ترتیب و تنظیم

تقسیم وسائل و تقسیم کار

میجر جنرل فرمان مارشل لا ہیڈ کوارٹر زون "بی" کے کمانڈ کنٹرول میں ہوں گے۔

"ٹروپس"؛

۵، بریگیڈ (ڈھاکہ میں متعین نفری) ۸، پنجاب - ۲۲، پنجاب، جنرل سٹاف آفیسر گریڈ I (ایئلی جنس)، لیفٹیننٹ کرنل تاج کو



کمانڈنگ آفیسر بنایا جائے۔ ۲۲ بلوچ۔ ۱۳ فرنٹیئر فورس۔ ۳۱ فیلڈ رجمنٹ (توپ خانہ)۔ ۱۳ لائٹ ایک ایک رجمنٹ (توپ خانے کا
طیارہ مارنر)۔ نمبر ۳ کمانڈوز کی ایک کمپنی (کو میلے سے)

سندھ

- (۱) ایسٹ پاکستان رائفلز کے ہیڈ کوارٹر، ایسٹ بنگال رجمنٹ کی دوسری اور سوویٹیاں (۲۵۰۰) اور راج پراچ میں پولیس ریزرو (۱۰۰۰) سے
مختیار لے کر ان کو غیر موثر بنانا۔
 - (۲) ٹیلیفون آپریشن اور ٹرانسمیٹر ریڈیو ٹیلیوژن، سٹیٹ بینک کا تحفظ۔
 - (۳) عوامی لیگ کے لیڈروں کی گرفتاری۔ منقل فہرست اور پتے۔
 - (۴) یونیورسٹی کے ہاسٹل۔ اقبال ہال، جگن ناتھ ہال، لیاقت ہال (انجینئرنگ یونیورسٹی)
 - (۵) شہر کی ناکہ بندی۔ سڑک، ریل اور دریا۔ دریاؤں میں گشت۔
 - (۶) آرڈی نرس فیکلٹی غازی پور اور ایمونیشن ڈپو راجندرہ پور کی حفاظت۔
- صوبائی دارالحکومت (ڈھاکہ) کے علاوہ باقی سارے علاقہ میجر جنرل کے ایجنٹ اور ہیڈ کوارٹر نمبر ۴ ڈویژن کے تحت ہوگا۔

جیسور

نفری:

ہیڈ کوارٹر ۱۰۰ بریگیڈ یعنی ۲۵ بلوچ۔ ۲۷ بلوچ۔ ۲۴ فیلڈ رجمنٹ کے اجزاء اور ۵۵ فیلڈ رجمنٹ۔

سندھ

- (۱) ایسٹ بنگال اور ایسٹ پاکستان رائفلز کے "سیکٹر ہیڈ کوارٹر"، "ریزرو پولیس" اور "انصار" کو غیر مسلح کرنا۔
- (۲) جیسور شہر کا تحفظ۔ عوامی لیگ کے لیڈروں اور طالب علم رہنماؤں کی گرفتاری۔
- (۳) ٹیلیفون آپریشن اور اس کے نظم کا تحفظ۔
- (۴) چھاؤنی کے گراؤ اور حفاظتی حاشیہ۔ جیسور قصبہ اور جیسور کھناروڈ۔ جیسور کا ہوائی اڈہ۔
- (۵) کشتی کے ٹیلیفون آپریشن کو ناکارہ کرنا۔
- (۶) اگر ضرورت ہو تو کھناروڈ کو کھینا دینا۔

کھناروڈ

نفری:

۲۲ فرنٹیئر فورس

سندھ

- (۱) قصبے کی حفاظت۔
- (۲) ٹیلیفون آپریشن اور ریڈیو سٹیشن کی حفاظت۔
- (۳) "ایسٹ پاکستان رائفلز کے" "ہنگ ہیڈ کوارٹر"، "ریزرو کپٹیوں" اور "ریزرو پولیس" کو غیر مسلح کرنا۔
- (۴) عوامی لیگ کے طالب علم لیڈروں اور اشتراکی لیڈروں کی گرفتاری۔



زنک پور۔ سید پور

ضمیمہ: ۲

نفری

ہیڈ کوارٹر ۲۲ برگیڈ - ۲۹ کیوری (رسالہ) ۲۶ فرٹیر فورس - ۲۳ فیلڈ رجمنٹ (ٹوپ خانہ)

نفر النض

- ۱۔ زنک پور اور سید پور کی حفاظت۔
- ۲۔ سید پور میں ۳ ایسٹ بنگال کو غیر مسلح کرنا۔
- ۳۔ اگر ممکن ہو تو دیناج پور میں سیکٹر ہیڈ کوارٹر اور ریزرو کمپنی کو غیر مسلح کرنا۔ بصورت دیگر سرحدی چوکیوں کو مستحکم بنا کر ریزرو کمپنی کو غیر مسلح کرنا۔
- ۴۔ زنک پور کا ریڈیو اسٹیشن اور ٹیلیفون ایپیمنج کی حفاظت۔
- ۵۔ زنک پور میں عوامی لیگ کے رہنماؤں اور طالب علم لیڈروں کی گرفتاری۔
- ۶۔ بوگرہ ایونیشن کے ذخیرے کی حفاظت۔

راج شاہی

نفری

۲۵ پنجاب

نفر النض



- (۱) کمانڈنگ آفیسر شفقت بلوچ کو روانہ کر دو۔
- (۲) راج شاہی میں ٹیلیفون ایپیمنج اور ریڈیو اسٹیشن کی حفاظت۔
- (۳) "ریزرو پولیس" اور ایسٹ پاکستان رائفلز کے سیکٹر ہیڈ کوارٹر کو غیر مسلح کرنا۔
- (۴) راج شاہی یونیورسٹی اور بالخصوص میڈیکل کالج کا خیال رکھنا۔
- (۵) عوامی لیگ کے رہنماؤں اور طالب علم لیڈروں کی گرفتاری۔

کومیلا

نفری

۵۳ فیلڈ رجمنٹ (ٹوپ خانہ) ڈیڑھ ماٹر بیٹری (ٹوپ خانہ) کومیلا میں موجود نفری - تیسری کمانڈو بٹالین (ایک کمپنی کم)

نفر النض

- (۱) ایسٹ پاکستان رائفلز کے "زنک ہیڈ کوارٹر" ۴ ایسٹ بنگال اور ضلع کی ریزرو پولیس کو غیر مسلح کرنا۔
- (۲) شہر کی حفاظت اور رہنماؤں اور طالب علم لیڈروں کی گرفتاری۔
- (۳) ٹیلیفون کا مواصلاتی مرکز محفوظ رکھنا۔



سلسلہ



نفری
۳۱ پنجاب (ایک کمپنی کم)

سند الف

- (۱) ریڈیو اسٹیشن اور ٹیلی فون ایجنسی کی حفاظت۔
- (۲) دریلے سٹریٹ پر "کینوٹیل" کی نگرانی۔
- (۳) فضائی مستقر۔

(۴) عوامی لیگ کے رہنماؤں اور طالب علم لیڈروں کی گرفتاری۔ سکندر سے رابطہ پیدا کرنا۔

چٹاگانگ

نفری

۲۰ بلوچ بہاول دستے کے سوا، اور ۳۱ پنجاب کی ایک کمپنی (سلسلہ سے) بریگیڈیئر اقبال شفیع کو میلا سے بذریعہ سڑک ایک دستہ لے کر رات ایک بجے تک چٹاگانگ پہنچ جائیں۔

متحرک دستہ

بریگیڈیئر اقبال شفیع۔ ٹیک ہیڈ کوارٹر اور مواصلاتی اجزاء کے ساتھ نمبر ۲۴ فرنیچر فورس۔ ۱۲۰ ملی میٹر مارٹر کا ایک ٹروپ (چار توپیں) انجینئروں کی ایک فیلڈ کمپنی۔ بہاول کمپنی۔ فوجی کارروائی کے مقررہ وقت پر "فینی" میں۔

سند الف

(۱) ایسٹ بنگال جنرل سنٹر نمبر ۱ ایسٹ بنگال ایسٹ پاکستان رائفلز سیکٹر ہیڈ کوارٹر اور ڈیزرو پولیس کو غیر مسلح کرنا۔

(۲) پولیس کے مرکزی اسلحہ خانے پر قبضہ (بیس ہزار)۔

(۳) ریڈیو اسٹیشن اور ٹیلی فون ایجنسی کی حفاظت۔

(۴) پاکستانیوں سے رابطہ (کوڈ اور ممتاز)۔

(۵) شنگری اور جنجوعہ (کمانڈنگ آفسر ایسٹ بنگال) سے رابطہ اقبال شفیع کے پہنچنے تک وہ آپ سے احکام لیں گے۔

(۶) لیکن اگر شنگری اور جنجوعہ کو اپنی نفری پر اعتماد ہو تو بنگالی عناصر سے بیشک ہتھیار نہ لیں۔ اس صورت میں شہر اور پھاؤنی کی سڑک پر

دفاعی پوزیشن میں ایک کمپنی رکھ کر کاؤٹ ڈالنا کافی ہو گا کہ اگر بعد میں ایسٹ بنگال جنرل سنٹر "اور" ایسٹ بنگال کی حفاظت

میں خلل آئے تو ان کا سہارا باب کیا جاسکے۔

(۷) بریگیڈیئر محمد ار کو اپنے ساتھ لے جا رہا ہوں۔ ایسٹ بنگال جنرل سنٹر کے ہیڈ کوارٹر چودھری کو کارروائی کی رات کو ہی گرفتار کر لیا جائے۔

(۸) مذکورہ بالا کارروائی مکمل کرنے کے بعد عوامی لیگ کے رہنماؤں اور طالب علم لیڈروں کو گرفتار کر لیا جائے۔

دستاویز سقوط

پاکستان ایئر کمان نے مشرقی محاذ پر ہندوستان اور بنگلہ دیش کی فوجوں کے جنرل آفیسر کمانڈنگ انچیف لیفٹیننٹ جنرل جگجیت سنگھ اردوہ کے سامنے ہتھیار ڈالنا منظور کر لیا ہے۔ اس سپر انڈازی کا اطلاق بنگلہ دیش میں موجود پاکستان کی تمام مسلح افواج پر ہو گا جن میں پاکستان کی تری فضائی اور بحری افواج، نیم عسکری تنظیمات اور ہسول آرڈر فورسز شامل ہیں۔ افواج کی جو نفری جس مقام پر موجود ہے اسی مقام پر لیفٹیننٹ جنرل جگجیت سنگھ اردوہ کی زیر کمان باقاعدہ انڈین آرمی کے قریب ترین دستوں کے سامنے ہتھیار ڈالے گی۔

اس دستاویز پر دستخط ثابت ہونے کے فوراً بعد پاکستان کی ایئر کمان لیفٹیننٹ جنرل جگجیت سنگھ اردوہ کے احکام کے تحت آجائے گی۔ دستاویز سقوط کی دفعات کے معانی یا توجیحات میں کوئی شہر پیدا ہونے کی صورت میں لیفٹیننٹ جنرل جگجیت سنگھ اردوہ کا فیصلہ آخری ہو گا۔

لیفٹیننٹ جنرل جگجیت سنگھ اردوہ یہ ضمانت دیتے ہیں کہ جو سپاہی ہتھیار ڈالیں گے ان سے عزت و احترام کا وہی سلوک کیا جائے گا جس کے وہ جنیوا کنونشن کی دفعات کی رو سے مستحق ہیں۔ نیز پاکستان کی جو فوجی اور نیم فوجی نفری ہتھیار ڈالے گی ان کی سلامتی اور بہبود کی ضمانت بھی دی جاتی ہے۔ لیفٹیننٹ جنرل جگجیت سنگھ اردوہ کی ماتحت فوج غیر ملکی باشندوں، نسلی اقلیتوں اور مغربی پاکستان کے باشندوں کی حفاظت کریں گی۔

(دستخط)

جگجیت سنگھ اردوہ

لیفٹیننٹ جنرل

جنرل آفیسر کمانڈنگ انچیف افواج ہندوستان

وبنگلہ دیش مشرقی محاذ میں

۱۶ دسمبر ۱۹۶۱ء

(دستخط)

امیر عبداللہ خان نیازی

لیفٹیننٹ جنرل

مارشل لاؤ ایڈمنسٹریٹرز

اور کمانڈر ایئر کمانڈ پاکستان

۱۶ دسمبر ۱۹۶۱ء



